قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2012، قیمت -/15

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا 14واں کل ہند اردو کتاب میلہ

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 2
خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3
انٹرویو
سالک لکھنوی — معصوم شرقی 6
کور اسٹوری
قومی اردو کونسل کا 14واں کتاب میلہ — قاسم انصاری 8
اضافی بجٹ برائے این سی پی یو ایل — جمشید عادل علیگ 14
خراج عقیدت
وارث کرمانی (شبو میاں) — وہاج الدین علوی 15
زبان و تعلیم
نظم کی تنقید اور تدریس — صدیق محی الدین 17
پنچ سالہ منصوبے اور بنیادی تعلیم — محمد اسد اللہ 19
ادبی مباحث
مطالعۂ ٹیگور کا ایک زاویہ — سیدہ جعفر 21

مولانا ضیاء الدین اصلاحی ... — شمس بدایونی 24
نئے اردو افسانے میں تہذیب ... — احمد صغیر 28
اردو نعت گوئی ایک جائزہ — منیر حسین حرہ 32
مشاہیر ادب
رئیس الغزل مولانا حسرت موہانی — عبدالحی 35
حسرت اور چکی کی مشقت — حسرت موہانی 37
انتخاب کلام حسرت موہانی 41
ہم نے جنھیں بھلا دیا
شمیم کرہانی — فاروق ارگلی 43
صحافت
اردو میں صحافتی ترجمہ نگاری — محمد عامر بدر 46

مولانا ظفر علی خاں — محمد ساجد ذکی فہمی 48
ہماری مطبوعات
نظر ثانی اور فیصلہ — محب الحسن 51
کیریئر گائڈ
کامیابی میں تعلیم وتربیت کی اہمیت — سمیع الدین خاں 55
صحت
لیموں کی افادیت واہمیت — عبدالناصر فاروقی 57

جہانِ نسواں
خواتین کے حقوق کا تجزیاتی مطالعہ — جاں نثار معین 59
دوسری زبانوں سے
باتیں (راجستھانی کہانی) — بھنور لال بھرمر
مترجم: محمد ہادی 63
سائنس و ٹیکنالوجی
سماجی میڈیا — تنزیل اطہر 65

اردو رسم الخط اور ٹیکنالوجی — ہاشمی سید وہاج الدین 67
صنعت و حرفت
ڈاکٹر ورگیز کورین — زبیر احمد بھاگلپوری 70
کتابوں کی دنیا
تبصرہ وتعارف 72
قومی اردو کونسل کی میٹنگ
ایگزیکیوٹیو بورڈ کی XXXVویں میٹنگ — ادارہ 78
اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ 82
عالمی اردو نامہ — ادارہ 86
خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 88

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:14، شمارہ:12، دسمبر 2012

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت:49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد بار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

اس میں کوئی شک نہیں کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ، ٹیلی ویژن کے پھیلاؤ، انٹرنیٹ پر دستیاب ابلاغ کے نئے وسیلوں اور بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے کتب بینی کی عادت پر خاصا منفی اثر ڈالا ہے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بصری و سمعی ذرائع ابلاغ کی بے پناہ قبولیت و مقبولیت کے باوصف چھپے ہوئے حروف کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اخباروں کی بڑھتی ہوئی تعداد اشاعت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سرکولیشن والے اخبار آج ہندوستان میں ہی شائع ہورہے ہیں جہاں تقریباً ہر زبان میں ٹی وی چینل اپنی نشریات چوبیسوں گھنٹے جاری رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں اردو سمیت تمام ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کی تعداد اس عرصے میں بڑھی ہے۔

دوسری طرف طباعت کی نئی تکنیکوں نے اخباروں کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کو بھی پہلے سے آسان بنا دیا ہے اور اس سلسلے میں اردو کافی فائدے میں رہی ہے۔ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ اردو کی کتابیں اب پہلے سے زیادہ شائع ہورہی ہیں۔ مگر لوگوں میں یہ احساس شاید کم ہوتا جارہا ہے کہ کتابیں کسی بھی زبان اور اس سے وابستہ تہذیب و ثقافت کی بقا اور فروغ میں سب سے بڑا، بلکہ کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ اردو کتابوں کی اشاعت میں اضافے کے تناسب سے انھیں خریدنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہورہا ہے۔جس کی ایک وجہ زندگی کی تیز رفتاری بھی ہے۔

اردو میں ایک بڑا طبقہ اردو کے ان عام قارئین کا ہے جو اردو کی کتابیں نہ صرف خرید کر ہی پڑھنے میں یقین رکھتے ہیں بلکہ ان میں کتب بینی کا شوق اور ذوق بھی ہے۔لیکن زندگی کے عام مسائل اور ان میں سے اکثر کے مالی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ اردو کی کیا کسی اور زبان کی کتاب بھی خرید کر پڑھ سکیں۔ اردو سے سچی محبت رکھنے والے یہ عام قارئین ہی ہیں جن کی مشکلات کو نظر میں رکھتے ہوئے قومی اردو کونسل نے 'ترقی اردو بیورو' کے زمانے سے ہی اردو کی معیاری کتابیں بہت کم قیمت پر چھاپنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور آج اردو کونسل کو دنیا بھر میں مختلف علوم و موضوعات پر سب سے زیادہ عنوانات کے ساتھ اردو کتابیں چھاپنے والا سب سے بڑے ادارے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہی نہیں اپنی 'کتاب گاڑی' کی مدد سے اردو کی بہترین کتابیں بہت کم قیمت پر لوگوں کے گھروں تک پہنچانے کا سلسلہ بھی کونسل نے شروع کر رکھا ہے۔

اس کے علاوہ اردو کونسل ہر سال ملک کے مختلف علاقوں میں کتاب میلے کا اہتمام بھی کرتی ہے جن میں اردو کے سبھی ناشرین اور مطابع کو بہت ہی کم معاوضے پر اپنے اسٹال لگانے کا موقع دیا جاتا ہے۔ چندروز قبل لکھنؤ میں 14ویں کتاب میلے کا اہتمام کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں اردو پڑھنے والوں نے شرکت کی اور جس کی تفصیلی رپورٹ آپ اس شمارے کی کور اسٹوری میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس طرح کے میلوں میں اردو کتابوں کی خریداری میں مسلسل اضافہ ہوتے دیکھ کر خوشی ضرور ہوتی ہے لیکن تشفی نہیں ہوتی کیونکہ اردو کی ملک گیر حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ اضافہ بھی کم ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کونسل اردو کی کتابیں عام اردو والوں تک پہنچانے کے لیے جدید کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا سہارا ابھی لے رہی ہے۔ کونسل نے اپنی شائع کردہ تمام کتابیں اپنی ویب سائٹ پر دستیاب کرنے کا ایک پراجیکٹ شروع کیا ہے۔ جس کے تحت اب تک تقریباً 1200 کتابیں اپ لوڈ کی جاچکی ہیں۔ یہ کتابیں اردو شائقین ویب سائٹ پر لاگ ان کرکے مفت ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں جس کے بعد کتابوں کی کمپیوٹر فائلیں، پین ڈرائیو یا ہارڈ ڈسک پر محفوظ کرکے کمپیوٹر پر پڑھی یا پرنٹر سے چھاپی جاسکتی ہیں۔ یہ کونسل کا ایک ایسا انقلابی قدم ہے، جس سے اردو کی نئی نسل یقینی طور پر مستفیض ہوگی اور زبان و ادب کی توسیع و ترویج پر اس کے مثبت اثرات مستقبل قریب میں ہی سامنے آجائیں گے۔

لیکن شرط یہی ہے کہ اردو سے جو محبت ہمیں ہے اس میں کتابوں، خاص طور سے اردو کی کتابوں کو خاص جگہ دی جائے۔ ورنہ زبانی جمع خرچ سے کسی زبان کی ترقی نہیں ہوا کرتی۔ ہمیں اردو کو آگے لے جانا ہے تو اردو کی کتابوں کو دوست بنانا ہوگا۔ ویسے بھی کتابوں سے اچھا دوست کوئی نہیں!

آپ کی بات

عارف مارہروی

البرکات، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ

'اردو دنیا' کا نومبر 2012 کا شمارہ آپ نے بہت خوبصورت شائع کیا ہے۔ اس میں آپ کی بھرپور محنت کا عکس نظر آتا ہے۔ تمام مضامین کا انتخاب بہت خوب ہے۔ خاص طور پر 'اردو تہذیب اور پنڈت نہرو' اور 'مجاز لکھنوی' پر مضمون۔ میرے انٹرویو کو آپ نے بہت اہم جگہ دے کر جو عزت افزائی فرمائی ہے اس کے لیے میں شکرگزار ہوں۔ جلدی میں دیے گئے انٹرویو میں میری طرف سے کئی کمیاں رہ گئی ہیں اور کئی غلطیاں بھی ہوگئی ہیں۔ یہ میری پیدائش کا سن 1942 ہے 1944 نہیں۔ ادبی دلہن پاپی کی جگہ روبی دلہن چھپ گیا ہے۔ کیفیات نامہ میں پاپی کی جگہ بابی لکھا گیا ہے۔ پسندیدہ ادیبوں اور شاعروں میں دو نام رہ گئے ہیں۔ محترم ایس ایم اشرف صاحب کے ناول 'نمبردار کا نیلا' کے ذکر کے بغیر میرا جواب ہی نامکمل ہے۔ موصوف نے اس میں غضب کی کرداری نگاری کی ہے۔ خاص طور سے نیل گائے کی نفسیات بیان کرنے میں تو کمال کر دیا ہے۔ ایک جگہ ٹھاکر کا بیٹا کمہار لڑکی کے ساتھ زیادتی کی سزا کے طور پر اپنے باپ کا ایک تھپڑ کھا کر جس طرح کی سوچوں کا اظہار کرکے مطمئن ہوتا ہے۔ موصوف کی تحریر کا عروج ہے۔ میرے پسندیدہ ادیبوں میں ایک نام نصرت ظہیر صاحب کا بھی ہے۔ طنز و مزاح میں ان کا جواب نہیں۔ 'قربانی کے بکرے' میں انھوں نے بکرے کے تمثیلی کردار کے ذریعہ رواں سیاست پر بہت اچھا طنز کیا ہے۔ ہلکی پھلکی رومانی جذباتی کشمکش سے بھرپور کہانیوں کے لیے ناول نگار انیس مرزا مجھے بہت پسند ہیں۔ شادی شدہ زندگی کی پچاس بہاریں ابھی پوری نہیں گزری ہیں۔ میرے بچے گولڈن جوبلی کا جشن منانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ بہرحال اتنا اچھا شمارہ نکالنے کے لیے خواجہ اکرام الدین صاحب اور ان کے ساتھی قابل مبارکباد ہیں۔

ایس ایس علی

اکولہ (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' کے نومبر 2012 کے شمارے میں ڈاکٹر پرویز احمد کا مضمون 'انفارمیشن ٹکنالوجی: تدبیر یا تقدیر' میں نے بہت غور سے پڑھا۔ درحقیقت یہ مضمون غور سے پڑھنے اور مکرر پڑھنے کی چیز ہے۔ مصنف نے اپنی نیم خوابیدہ قوم کو خوب جھنجھوڑا ہے۔ قوم کو نیم خوابیدہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جہاں تک آئی ٹی کا تعلق ہے، یہ قوم پوری طرح سوئی ہوئی نہیں ہے۔ خورد بینی سطح پر ہی سہی ہماری قوم آئی ٹی سے استفادہ کر رہی ہے، اس کو سمجھ رہی ہے لیکن اس سے کیا

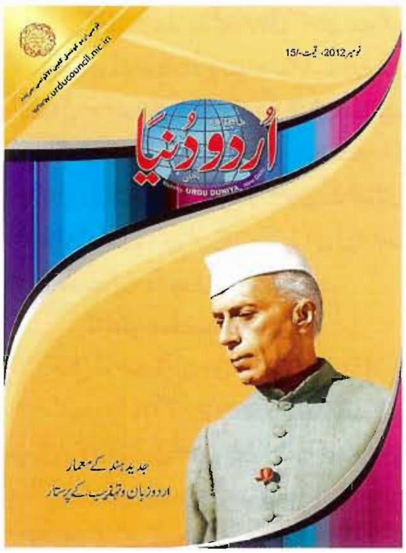

ہوتا ہے۔ ان کا جو کام ہے اہل سیاست جانیں، ہمیں تو بس اپنی اپنی سطح پر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہاتھ پاؤں مارنا ہے کیونکہ 'قطرہ قطرہ بہم دریا می شود'

اور یہ بات ہمیشہ ذہن میں تازہ رہے:

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

محمد عبدالعزیز سہیل

4-2-75 لطیف بازار نظام آباد 03 001

اردو دنیا نومبر 2012 کا شمارہ نظروں کے سامنے ہے جو کہ وقت مقررہ پر موصول ہوا۔ الحمدللہ ٹائٹل بہت ہی خوشنما اور جاذب نظر ہے۔ ٹائٹل پیج پر چاچا نہرو کی تصویر دیکھ کر ماہ نومبر کی یاد تازہ ہوگئی۔ بہتر ہوتا کہ چاچا نہرو کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد اور علامہ اقبال پر بھی اس شمارے میں خصوصی گوشے شامل ہوتے۔ خیر آئندہ ان باتوں کا خیال رہے تو بہتر ہوگا۔ ہماری بات کے عنوان سے مدیر اعلیٰ کا اداریہ عصر حاضر کے تناظر میں لکھا گیا ہے جس میں ملک میں جاری بدعنوانیوں اور ملک کی عوام کی غریبی کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی ملک کی ترقی کا ذکر بھی لیکن اردو کی ترقی اتنی زیادہ نہیں ہوئی جتنی کہ آپ نے اس کا اظہار کیا ہے۔ آج بھی اردو زبان کے ساتھ تعصب اور سوتیلا سلوک روا ہے جس کا خاتمہ ہونا چاہیے اور اردو زبان کو اپنا جائز مقام ملنا چاہیے اس شمارے کے مشمولات کا انتخاب اچھا ہے خاص کر عارف مارہروی پر عارف فیصل کا انٹرویو جس سے عارف مارہروی کی شخصیت کا علم ہو سکا اور ان کی اردو کے تئیں خدمات کا علم بھی ہوا۔ اسرار الحق مجاز پر مدثر علی خاں کا مضمون بہت اچھا ہے ساتھ ہی کور اسٹوری کے تحت جواہر لال نہرو پر شامل تحریریں کافی معلوماتی ہیں۔ بچوں کا ادب اور اردو ابن کنول کا مضمون بھی بہتر ہے خاص کر اردو میں بچوں کے ادب کے متعلق مسلسل تحریروں کو شامل کرنا چاہیے جو کہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے نسیم احمد کا مضمون انٹرویو کی تکنیک کے مطالعہ سے بہت ہی اہم معلومات حاصل ہوئی۔ سجاد ظہیر اور لندن کی ایک رات اس مضمون کی کافی اہمیت ہے کیونکہ ترقی پسند ادب کا آغاز انھی سے ہوتا ہے۔

شیخ صادق

معاون مدرس، الحسنات رسلپور، (مہاراشٹر)

انٹرنیٹ کی دنیا پر سفر کرتے ہوئے اچانک میری نظر اردو کونسل کی سائٹ پر پڑی جس میں 'اردو دنیا' کو دیکھ کر پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا۔ پھر ارادہ کیا کہ اس کا سالانہ خریدار بن جاؤں۔ میں گزشتہ تین مہینوں سے اس کا خریدار ہوں۔ جب پہلی مرتبہ 'اردو دنیا' ہاتھ میں آیا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا ہے۔ ان مشکل ترین حالات میں اور اتنی کم قیمت پر اردو کا کوئی ایسا رسالہ نکلتا ہو۔ اور دنیا ہم جیسے درس و تدریس سے جڑے لوگوں کے لیے کسی نعمت مطہرہ سے کم نہیں ہیں۔ اکتوبر 2012 کا رسالہ نظروں سے گزرا۔ سرورق پر گاندھی جی کا اردو میں رکھا ہوا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ واقعی اردو کونسل اور اردو دنیا اردو کی کافی خدمت کر رہا ہے۔ کیریئر گائڈ کے تحت UGC کی تیاری کیسے کریں معلومات افزور رہا۔ امید ہے اسی طرح اردو دنیا ہماری رہنمائی کرتا رہے گا۔

محمد افروز عالم

اولڈ بوائز ہاسٹل، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مادیت پرستی کے اس دور میں انگریزی زبان جس

تیزی کے ساتھ لوگوں کے ماحول اور ان کی زندگیوں میں سرایت کر رہی ہے، اس کا اندازہ خود لوگوں کو بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ پوری دنیا اقتصادی منافع کے پیشِ نظر انگریزی زبان کو اپناتی چلی جا رہی ہے۔ جہاں حکومتیں اپنی سرد مہری کی وجہ سے اس ابتر صورت حال کی ذمے دار ہیں، وہاں عوام کی بے شعوری بھی ثقافتی ورثے کی ہلاکت میں برابر کی شریک ہے۔ ایسے ماحول میں آپ نے 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن'، 'آن لائن اردو لرننگ کورس'، 'ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ' پروگرام اور کونسل کی مطبوعات انٹرنیٹ پر دستیاب کر کے نہایت ترقی یافتہ اور جدید ٹکنالوجی سے اردو کو آراستہ کیا ہے۔ اس طرح اردو زبان وادب کو اس کی اصل شکل وصورت میں باقی رکھنے اور نئے زمانے کی ترقیات سے اس کو ہم آہنگ کرنے کے حوالے سے اردو کونسل کا کردار لائقِ تحسین ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ کی شکل میں 'اردو دنیا' کسی انگریزی جریدہ سے کم تر نہیں ہے۔

ستمبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں تعلیم سے متعلق مضامین 'اردو اساتذہ'، 'اردو تعلیم'، 'اردو کی تدریس اور نصابی کتابیں'، 'ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا مستقبل'، 'اردو نصاب تعلیم اور چند اہم ادارے' معلوماتی اور اساتذہ وطلبا کے لیے کارآمد ہیں۔ ہم نے جنھیں بھلا دیا کالم میں سیدہ عصمت جہاں کا مضمون 'مہدی نظمی: شخصیت اور شاعری' قابلِ ستائش ہے۔ اکتوبر 2012 کا شمارہ بھی وقت پر ملا۔ شمارہ حسنِ طباعت اور کتابت کا بہترین مرقع ہے۔ سرورق بابائے قوم گاندھی جی کی تصویر اور ان کا اردو میں تحریر کردہ خط لاجواب ہیں۔ اس شمارے کے تمام تر مضامین معلوماتی اور قابلِ ستائش ہیں۔ پروفیسر محمد ظفر الدین کا مجتبیٰ حسین سے لیا گیا انٹرویو معلومات سے بھرپور ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک

گورو نانک نگر، گلی نمبر 18-k، کوٹھی نمبر 201-A، پٹیالہ

'اردو دنیا' اکتوبر کا تازہ شمارہ جس آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس کے لیے آپ بحیثیت مدیر گرامی بذاتِ خود اِس کے اور آپ کے معاون کارکن کی محنت و مشقت زبانِ حال سے بول رہی ہے۔ اس شمارے میں ویسے تو تمام مضمون جاندار وشاندار ہیں اور جریدے کے معیار کو بتدریج بلند سے بلند تر کرنے میں اپنا واحد رول ادا کر رہے ہیں، مثلاً موجودہ دور کے ہم عصر شاعروں میں فیض احمد فیض اور کیفی اعظمی کے ساتھ علامہ اقبال جیسے کلاسک شاعر کا بھی احاطہ کرنے والی تمام تخلیقات قابلِ مدح و ستائش ہی مانی جائے گی لیکن محمد حسین آزاد کا مضمون 'الفاظ کیونکر پیدا ہوئے' تو آپ کے ہی دماغ کی قوت امتیاز و پیداوار جان پڑتی ہے۔ اگر چہ یہ مضمون آزاد صاحب کی بلند پایہ کتاب 'سخن دانِ فارس' کا ہی ایک اہم وخاص حصہ ہے، تاہم تمام کامل و فاضل ادیب و مدرس بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ برائے مہربانی ایسے مضامین میں الفاظ کی ترتیب اور ان کو مرتب کرتے وقت ہر لفظ کی اور زیادہ تشریح وتوضیح کروا دیا کریں (جس کی کچھ کمی کھٹکتی ہے) کیونکہ اِس سے ہر ایک قاری کے لیے ایسے مضامین عام فہمی کے مدنظر ایک دستاویزی حیثیت اختیار کر لیں گے۔ اس سے مدیر و کارکن سبھی کی محنت اور زیادہ رنگ لائے گی، ایسا میرا پختہ و مستحکم یقین ہے۔ 'نیٹ کی تیاری کیسے کریں' عنوان والے بے نظیر ولاثانی مضمون سے اس شمارے کا درجہ بے حد بلند ہو گیا ہے اور یہ طلبا کے کیریر کے واسطے کافی سودمند ومفید ثابت ہوگا، دیگر قارئین کے لیے تو ایسا مضمون از حد غذا یا خورشِ دماغ ضرور ثابت ہو سکتا ہے۔ اِس کے علاوہ مجھ جیسے غیر مسلم مصنفوں کے مضامین بدستور شائع کر کے جس طرح سے آپ ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

'اردو دنیا' ماہ اکتوبر 2012 کا شمارہ بروقت ملا۔ سرورق پر گاندھی جی کی تصویر دیکھتے ہی عدم تشدد کا تصور یاد آ گیا اور گاندھی جی کا اردو کے ساتھ کیا نظریہ تھا وہ بھی معلوم ہوا۔ گاندھی جی ہندی اور اردو کو عوام کے لیے آسان بنانا چاہتے تھے اس لیے وہ ہندی سے سنسکرت لفظ اور اردو سے فارسی وعربی نکال دینا چاہتے تھے، لیکن غیر زبانوں کے لفظ عوامی عمل سے زبان میں در آئے ہیں نکالنا مشکل ہے۔ غیر زبانی الفاظ زبان کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں چاہے مشکل ہو یا آسان لفظ نکالنا محال ہے۔ اداریہ میں خواجہ محمد اکرام الدین صاحب نے گاندھی جی کی سیرت شخصیت اور کارناموں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کو زبردست والہانہ خراجِ عقیدت پیش کیا۔ گاندھی کا خواب زبان کے تعلق سے اچھا تھا لیکن لوگ زبان کو محدود اور اس کے چلن کو سیاسی مفاد حاصل کم کرنے کی کاوش میں لگے ہیں۔ لیکن زبان زندہ شے ہے بڑھنے کی صلاحیت و قابلیت اس میں ہے وہ ضرور ترقی کرے گی۔ مجتبیٰ حسین کا انٹرویو بہت خوب اور فکر انگیز ہے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں اردو طنز ومزاح کا معیار ماضی وحال اور دیگر زبانوں میں اس کے کوائف و حالات کو پیش کیا۔ پریم چند کی تخلیقات پر گاندھی جی کا اثر میں پریم چند گاندھی جی سے متاثر تھے اور گاندھی واد تھے۔ گاندھی جی کے نظریات و افکار کا پرچار کیا اپنے ناولوں وافسانوں میں گاندھی جی کے نظریات وتصورات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سرسید کا نظریہ یہ کہ ہندو ومسلمان ایک خوبصورت دلہن کی آنکھوں کے مانند ہیں۔ کیفی کی شاعری علامہ اقبال اور رومانیت وغیرہ اچھے مضامین پڑھنے کو ملے ہیں۔ الفاظ کیوں کر پیدا ہوئے؟ یہ مضمون جدت وندرت لیے ہوئے ہے اور نئے وجدید معلومات سے پر اثر ہے۔ لفظوں کی تخلیق لفظ کب بنتے ہیں اس کی پہچان کیا ہے دیگر زبانوں کی صرفی ونحوی صورت الگ الگ ہوتی ہے اس کے مشمولات فکر انگیز اور بصیرت افروز وفراست میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں۔

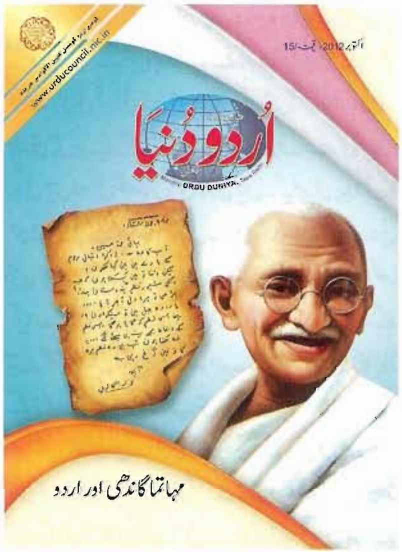

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائسنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

اکتوبر 2012 کا شمارہ ملا۔ مجتبیٰ حسین سے محمد ظفر الدین کی بات چیت اچھی لگی۔ جب کسی زبان کی مقبولیت کم ہونے لگے اور لوگوں کی اس میں دلچسپی کم ہونے لگے۔ اُس زبان کا ادب تو متاثر ہوگا ہی، آزادی ملنے کے بعد اردو کمزور پڑتی چلی گئی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے کائنات کا مطالعہ چشمِ بصیرت سے کیا اور اپنے تجربات سے ایسی دنیا کھوج نکالی جس میں فکر وعمل یقین واعتماد اور امید ومسرت کی لہریں آتی ہیں۔ مولانا آزاد کے نزدیک مذہب، فلسفہ اور سیاست کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی زندگی کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالے جو انھیں انسانیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچا دے۔ اردو طنز ومزاح کی روایت کو جن ادیبوں نے وقار عطا کیا ان میں کنہیا لال کپور کا نام بے حد اہم ہے، ان کی تخلیقات میں طنز ومزاح کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ سماج کے درد کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ ان کا قلم کبھی بچھو کا ڈنک بن جاتا

ہے تو کبھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ گوپ بندھو داس ایک عظیم مجاہد آزادی تھے، انھوں نے اپنی زندگی عوام کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ شاد عارفی نے لب و رخسار والی شاعری نہیں کی بلکہ اپنے سچے اور پرجوش واقعاتِ عشق کو ایک ایسے لہجے کے ساتھ پیش کیا کہ ان کی عشقیہ غزل کا انداز اردو کی عام عاشقانہ غزل سے منفرد ہوگیا۔

سید اختر علی
(نائڈیز)

ماہنامہ 'اردو دنیا' (اکتوبر 2012) کے سرِ ورق پر گاندھی جی کی مسکراتی تصویر اور اتنا ہی مسکراتا ان کا اردو رسم الخط میں پیارا ساخط 'مہاتما گاندھی اور اردو' کی سرخی کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ یہ کور اسٹوری گاندھی جی کے افکار و نظریات اور ان کے تصورات کا احاطہ ایک منفرد انداز میں کرتی ہے۔ جناب محمد عبدالقدیر صاحب کا مضمون 'اردو زبان اور ہندوستان کا دستور' بہت اہم اور معلوماتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت نابغۂ روزگار تھی۔ آپ کے تعلیمی نظریات کا اعادہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ جناب دیوان حنان صاحب کا مضمون اس کمی کو پورا کرتا نظر آتا ہے۔ نظم و نثر کے مشاہیرِ ادب اور ادبی مباحث کا سلسلہ خوب ہے۔ اردو دنیا کی خبریں بھی بہت مفید سلسلہ ہے۔ اس سے ساری دنیا میں جاری ادبی صورتِ حال سے واقفیت ہوجاتی ہے۔ جناب مظہر حسنین صاحب کا مضمون 'اردو سافٹ ویر کا تیس سالہ سفر' بہت معلوماتی ہے۔ یہ مضمون اردو سافٹ ویر کی مختصر کہانی بیان کرتا ہے۔ اس طرح کے مضامین بہت کم پڑھنے میں آتے ہیں۔ اس مضمون کے لیے انھیں دلی مبارکباد۔

محمد عارف اقبال
مدیر 'اردو بک ریویو' 1739/3، نیا کوہِ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس دہلی

شمارہ اکتوبر 2012 کے سرورق کے تعلق سے عرض ہے کہ یہ خط (مرقوم 9 جون 1938) گاندھی جی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک طالب علم محمد حسنین سیّد (پ: 23 مارچ 1912 — و: 14 جنوری 2005) کو لکھا تھا جبکہ وہ بی اے کے متعلم اور کالج کے ماہانہ قلمی آرگن 'جوہر' کے ایڈیٹر تھے۔ 21 اپریل 1938 کو علامہ اقبال کے انتقال کی خبر کے بعد محمد حسنین سیّد نے اس وقت کے قائم مقام شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کے ایما پر تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ میں تھی۔ اس کے بعد 'جوہر' کے اقبال نمبر کی اشاعت کی ذمہ داری بھی محمد حسنین سیّد پر آئی۔ علامہ کے انتقال کے بعد یہ پہلا اقبال نمبر تھا۔ انھوں نے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے پر اس وقت کے ممتاز مسلم و غیر مسلم اہم شخصیات کو جوہر کے اقبال نمبر کے لیے پیغام اور مضمون کے حصول کے لیے گشتی مراسلہ لکھا۔ ان کے خط کے جواب میں جو پہلا پیغام موصول ہوا وہ گاندھی جی کا تھا۔ گاندھی جی کے اس پیغام کا من و عن عکس جوہر کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اقبال نمبر کے لیے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، رابندر ناتھ ٹیگور، سر اکبر حیدری، راجندر پرشاد، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، سر تیج بہادر سپرو، مولوی عبدالحق اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے پیغامات موصول ہوئے۔ اس اقبال نمبر میں جن اہم شخصیات کے مضامین شائع ہوئے ان میں علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر غلام السیدین، مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حامد الانصاری غازی، مسعود حسین خاں وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعد میں جوہر کے اقبال نمبر کے کئی ایڈیشن مکتبہ جامعہ نے شائع کیے۔ آخری ایڈیشن میں 'جوہر اقبال' کا نام بدل کر 'اقبال اور جامعہ کے مصنّفین' کر دیا گیا۔ 2009 میں 'جوہر اقبال' کا تازہ ایڈیشن ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ محمد حسنین سیّد صاحب کا اپنے شفیق استاد ڈاکٹر ذاکر حسین سے تاحیات رابطہ رہا اور بعد میں ان کے اہل خانہ سے بھی انہوں نے ربط و تعلق قائم رکھا۔ دربھنگہ (بہار) سے تعلق رکھنے والے محمد حسنین سیّد کا شمار جماعت اسلامی کے اساسی ارکان میں ہوتا ہے۔

عارف مختار حسن
انصار کالونی، نزد مسجد قبا، مشرقی مالیگاؤں (ناسک)

'اردو دنیا' اگست 2012 کے شمارے میں ادارۂ شمع کے محترم یونس دہلوی سے فیروز بخت احمد کی ملاقات کے احوال پڑھنے کے بعد میں ماضی کی سنہری یادوں میں کھو گیا۔ بے شک رسالہ کھلونا کی اشاعت بند ہونے کا غم ایسا ہی ہے جو شاید کبھی بھلایا نہ جاسکے۔ درسی کتابوں کے بعد کھلونا ہی وہ پہلا رسالہ تھا جس کے مطالعہ سے ہماری اردو بہتر ہوئی۔ اس رسالے کا ہم پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے بچپن ہی میں ہمیں اس زمانے کے نامور اردو ادبا و شعرا سے متعارف کرایا۔ خاص طور پر اس کا سالنامہ جو ہر سال اگست کا شمارہ ہوا کرتا تھا اس میں ان کی تخلیقات خصوصی طور پر شائع کی جاتی تھیں۔ قومی اردو کونسل کے مستقبل کے منصوبوں میں بچوں کا ایک رسالہ شائع کرنے کا اعلان پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ مجھے قوی امید ہے انشاء اللہ اردو کونسل ہی کھلونا کی کمی کو بہت حد تک پورا کرسکتی ہے۔

ڈاکٹر شریف الدین خاں
سابق ادھیا پک سہ ضلع آیورویدادھیکاری یونیورسٹی کے پاس رائے پور

'اردو دنیا' تقریباً 10 سال سے پڑھ رہا ہوں۔ نئے اور جدید اردو دنیا کا شمارہ دلکش اور کارآمد ہے۔ ہر مضامین وقت کے لحاظ سے خوب ہوتے ہیں۔ ہر گوشہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو نے اردو کی توسیع، ترقی اور بہتری کے لیے ہمیشہ سرگرم ہے۔ 'اردو دنیا' کے ذریعے اردو کی عالمی خبریں اور کہاں کیا ہو رہا، کی معلومات بھی ہوتی رہتی ہیں۔

معین الدین شمسی
اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ 815301

ہر دلعزیز 'اردو دنیا' کا شمارہ جولائی 12 و اگست 12 ایک ساتھ بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ جون 12 کا شمارہ نہیں ملنے سے بڑی تشویش ہوئی۔ اگست 12 کے شمارے میں وسیم بریلوی کا انٹرویو بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ بلاشبہ اردو کو تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں شاعروں نے ہی زندہ رکھا ہے۔ اردو ہندوستان کی شاید واحد زبان ہے جس میں عوام سے شعر و ادب کا سیدھا تعلق قائم کرنے والا ایک انسٹی ٹیوٹ مشاعرے کی شکل میں موجود ہے اور جسے جوش و جگر جیسے اکابرین ادب نے بیسویں صدی میں نوابوں اور جاگیرداروں کی ذاتی محفلوں سے باہر لاکر ایک عوامی رابطہ گاہ کی شکل دی تھی۔ ان عوامی مشاعروں نے ہی اردو کے محاورے کو زندہ رکھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اردو اور کمپیوٹر کو قریب کردیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے کسبِ فیض کی اس دوڑ میں اردو کے لیے ایک بڑی رکاوٹ اس کا رسم الخط تھا جو عکس اساس image based ہونے کی وجہ سے اس عالمی مواصلاتی شاہراہ پر جسے عرفِ عام میں انٹرنیٹ کہا جاتا ہے سرپٹ نہیں دوڑ سکتا تھا لیکن یونی کوڈ unicode نے عکسی اور عددی digital رسم الخط کے فرق کو مٹا کر اس مشکل کو دور کردیا ہے۔ ■

▪ معصوم شرقی

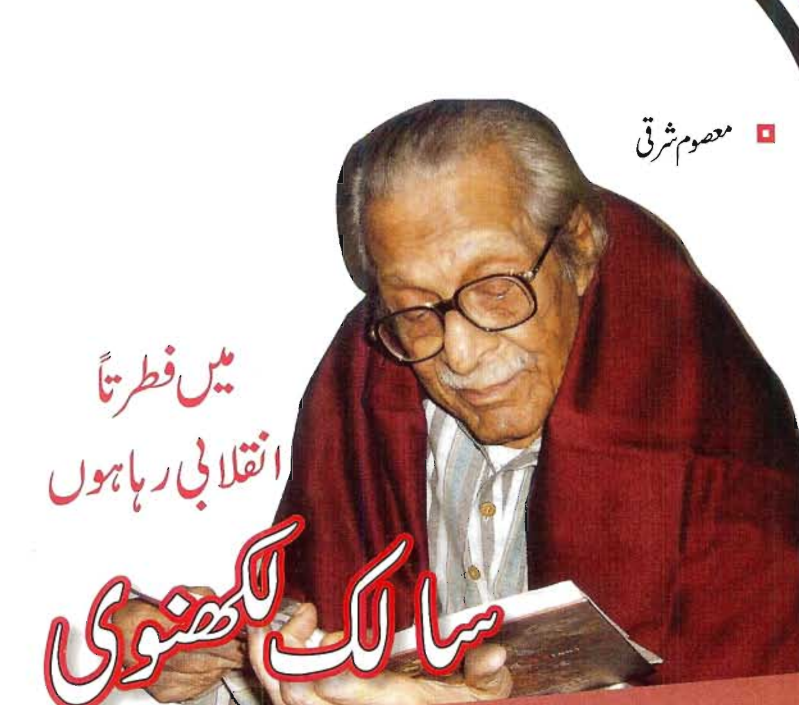

میں فطرتاً انقلابی رہا ہوں
سالک لکھنوی

سالک لکھنوی اپنی شناخت کے کئی حوالے رکھتے ہیں۔ مترجم، شاعر، افسانہ نویس، طنز و مزاح، انشائیہ نگار، ماہر نفسیات، صحافت، تحقیق و تنقید سب کے سب مستند حوالے ہیں اور ہر حوالے سے ان کی دریافت ہوسکتی ہے۔ آپ کی شخصیت جامع حیثیات ہے۔ آپ ممتاز ترقی پسند شاعر اور بنگال (کولکاتا) کے ادبی، سیاسی، سماجی اور صحافتی افق پر ایک روشن لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول مظہر امام ''اگر خوف فساد احباب' نہ ہو تو میں بلا تکلف کہتا: اے کلکتہ! تیرا نام سالک لکھنوی ہے۔'' سالک لکھنوی کی شاعری جبرو استبداد، طبقاتی ناہمواری، فرقہ وارانہ منافرت، سرمایہ دارانہ اور تاجرانہ لوٹ کھسوٹ کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ ترقی پسند تحریک کے سرخیل ادبا و شعرا کے آخری ستون سالک لکھنوی اپنی حیات کی 99ویں سیڑھی پر قدم رکھ چکے ہیں۔ سالک صاحب سے انٹرویو 'اردو دنیا' کے قارئین کے لیے پیش خدمت ہے۔

معصوم شرقی: خاندانی نام، ولدیت، تاریخ پیدائش اور تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیں۔

سالک لکھنوی: خاندانی نام شوکت ریاض کپور ہے۔ میرے والد تلسی رام کپور (اسلام قبول کرنے سے پہلے) 1909 میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے طارق ریاض کپور عرف محمد احمد نام رکھا۔ میری پیدائش 16 دسمبر 1913 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ میں بعمر ڈیڑھ دو سال اپنے والد کے ہمراہ کلکتہ چلا آیا۔ گھر میں ختم قرآن الحکیم کے بعد ابتدائی اردو، فارسی اور انگریزی والد مرحوم نے پڑھائی۔ ایم ایل جوبلی انسٹی ٹیوشن کلکتہ سے 1934 میں میٹرک، سینٹ زیویرس کالج کلکتہ سے 1938 میں بی اے، 1940 میں سیٹی کالج کلکتہ سے بی کام پاس کیا۔ 1938 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کی سند لی۔

م ش: آپ نے شاعری کب شروع کی، پہلا کلام کہاں شائع ہوا؟

س ل: 1932 میں۔ ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی۔ میری شاعری کا کوئی خاص محرک نہیں، کسی سے اصلاح نہیں لی۔ مولانا اسحٰق امرتسری (کلکتہ) کے رسالے میں میری پہلی نظم شائع ہوئی۔

م ش: آپ کن ادبا و شعرا سے متاثر رہے ہیں؟

س ل: شعرا میں سب سے زیادہ اقبال سے متاثر ہوں۔ (اقبال میری کمزوری ہے) لیکن میں نے کسی کی ہمروی یا نقالی نہیں کی۔ ادبا میں میرامن، حالی، شبلی نعمانی اور پریم چند سے بہت متاثر ہوں۔

م ش: آپ نے نثر نگاری کب شروع کی، کن اصناف نثر میں طبع آزمائی کی، اولین نثری تحریریں کب اور کہاں شائع ہوئیں؟

س ل: 1934 میں تنقید، تحقیق، افسانے اور طنز و مزاح سے گہرا شغف رہا ہے۔ میرا پہلا افسانہ 'اسٹیشن ماسٹر' 1934 میں ماہنامہ 'نکات' رنگون میں شائع ہوا۔ اس کے مدیر حکیم عیش امروہوی تھے۔ افسانہ 'اچھوت' 1934 میں مولانا اسحٰق امرتسری کے رسالے میں شائع ہوا تھا۔ گیا سے شائع ہونے والا رسالہ 'ندیم' میں میری تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔

م ش: آپ نے بے شمار مغربی افسانوں کے اردو ترجمے کیے ہیں۔ ایک مترجم کی حیثیت سے آپ کی خدمات کیا ہیں۔

س ل: میں نے موپاساں، ابسن، ٹالسٹائی اور سمرسٹ مام کا غائر مطالعہ کیا اور ان کی شاہکار تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ تراجم جوش کے رسالے 'کلیم' کے علاوہ 'عالمگیر' 'نیرنگِ خیال'، 'ادیب' (پشاور) اور 'مصور' (ممبئی) وغیرہ میں طبع ہوئے۔ یہ سلسلہ 1934 سے 1939 تک قائم رہا۔ موپاساں کا ایک افسانہ 'قومی غیرت' کے عنوان سے 'کلیم' میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوا۔

م ش: کیا افسانہ لکھنے کے لیے مغربی افسانہ نگاروں کو پڑھنا ضروری ہے؟

س ل: بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ہندستان کی افسانوی دنیا مغرب کی افسانوی دنیا سے بہت پیچھے ہے۔

م ش: اکبرالٰہ آبادی کے بعد طنز و مزاح کی دنیا میں کوئی بڑا شاعر پیدا نہ ہوسکا۔ آپ کے نزدیک اس کے کیا اسباب ہیں؟

س ل: عبدالغفور شہباز اکبر کے بعد ایک بڑے طنز و مزاح نگار پیدا ہوئے تھے۔ اگر شہباز مسلسل لکھتے رہتے تو وہ اکبر سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ گرچہ شہباز کا تعلق عظیم آباد سے تھا، لیکن وہ کلکتے میں بیس (20) سال قیام پذیر رہے۔ 'میر کلو کی گواہی' کے خالق انجم مان پوری بھی ایک زبردست طنز نگار تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکبر کے طنز کا ہدف جدید تہذیب کی اشاعت تھی۔ بعد کے آنے والے شعرا نے مغرب و مشرق کی اس کشمکش کا سامنا نہیں کیا۔ اس لیے کوئی دوسرا اکبر پیدا نہ ہوسکا۔

م ش: ادب میں تنقید کی کیا حیثیت ہونی چاہیے۔

س ل: تنقید کے معنی تنقیص نہیں ہے۔ ایک ادیب اور قلم کار کو اپنے خیالات پیش کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔ خواہ ادبا و شعرا اس رائے کو پسند نہ فرمائیں، یہ ان کا فعل ہے۔

م ش: ترقی پسند تحریک میں آپ کی شمولیت کب ہوئی؟

س ل: میں فطرتاً انقلابی رہا ہوں۔ تحریک کے بغیر بھی میں ترقی پسند تھا۔ 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جو جلسہ رفاہِ عام کلب، لکھنؤ میں ہوا تھا اس میں بنے بھائی (سجاد ظہیر) نے اپنی پُر مغز تقریر سے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ میں تحریک کی طرف عملی طور پر مائل ہوگیا۔ دسمبر 1938

میں البرٹ ہال کلکتہ میں P.W.A کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں میں پیش پیش رہا۔ بنگالی ادیبوں میں پروفیسر ہیرین مکھرجی، بدھ دیو بوس، تاراشنکر بنرجی، سبھاش مکھوپادھیائے، سوم ناتھ لاہری اور اردو کے شریف چکوالی ہمارے معاون تھے۔ اس کامیاب جلسے میں باہر سے تشریف لانے والوں میں بنے بھائی، علی سردار جعفری، آنند نرائن ملا اور آل احمد سرور وغیرہ تھے۔

م ش: ترقی پسند مشاعروں، جلسوں وغیرہ کی کوئی اہم یادیں؟

س ل: 1938 میں کلکتہ میں P.W.A کے جلسے کا منظر آج بھی نظروں میں ہے۔ 1949 میں پارک سرکس میدان میں کُل ہند عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا۔ ان دنوں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد تھی۔ پھر بھی ترقی پسند شعرا کے علاوہ کانگریسی حلقے کے شعرا نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ مدعوئین شعرا کے نام آج بھی ذہن میں محفوظ ہیں، مثلاً آنند نرائن مُلّا، وامق جونپوری، نیاز حیدر، کیفی اعظمی، جوش، ساحر، مجروح اور جذبی وغیرہ۔

م ش: عہد حاضر میں ترقی پسندی کی معنویت کیا ہے؟ کیا جدیدیت نے ترقی پسند تحریک کو اکھاڑ پھینکا ہے؟

س ل: ترقی پسندی کسی الہامی حرکت یا کیفیت کا نام نہیں ہے۔ ہر زمانے میں انسانیت سے دردمندی رکھنے والے فنکار اپنی تخلیقات میں ترقی پسند رہے ہیں۔ تحریک ہو یا نہ ہو زندگی خود ہمیشہ ترقی پسندی کی طرف مائل رہتی ہے اور رہے گی۔ اس لیے مستقبل میں اس کے مٹ جانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ ترقی پسندی کے خلاف جدیدیت کی تحریک امریکی مفاد پرستوں نے پیدا کی تھی جو ناکام ہوگئی۔

م ش: آپ کی سیاسی زندگی کی ابتدا کب ہوئی اور کانگریس سے علیحدگی کی خاص وجہ کیا تھی؟

س ل: میں اپنے کالج کے دنوں ہی سے سیاست سے قریب رہا ہوں۔ 1937 سے 1949 تک کلکتہ کانگریس کا سرگرم رکن اور بڑا بازار کانگریس کمیٹی کا عہدیدار بھی رہا۔ انتہائی صدق دل اور خلوص سے ہم لوگوں نے پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ آزادی کی تحریک میں جیل بھی گئے، فاقے بھی کیے، پولس کی لاٹھیاں کھائیں لیکن آزادی ملنے کے بعد پارٹی میں Rampant Corruption آ گیا۔ میں نے 1949 میں استعفا دے کر کمیونسٹ پارٹی جوائن کر لی اور جو بعد کو CPIM ہوگئی۔ میں آج تک اس سے وابستہ ہوں۔

م ش: آپ کے سیاسی تحریک کے رفقا کون تھے؟

س ل: کانگریس کے زمانے میں پروفیسر عبدالرحیم، بجئے سنگھ نہار، کے ایل دتہ، پرفل کمار سین (سابق وزیر اعلیٰ مغربی بنگال) وغیرہ۔ کمیونسٹ رفقا میں JolyMohan Kol جولی موہن کول اور جن سے میں نے فیض حاصل کیا ان میں کامریڈ مظفر احمد (بانی سی پی آئی) کامریڈ عبدالحلیم، کامریڈ ذاکر حسین، پرویز شاہدی، ہری پدو چٹرجی اور دلیپ بھٹاچارجی کی شخصیت اہم تھی۔

م ش: کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

س ل: بسلسلۂ تحریک 'ہندستان چھوڑو' کی پاداش میں 1942-43 میں مجھے قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ پہلے علی پور جیل پھر سینٹرل جیل (دم دم) میں ایک سال مقید رہا۔ انھی دنوں بنگال میں قحط (Great Famine) آیا تھا۔ قحط زدہ عوام کی حمایت میں ہم 150 قیدیوں نے ایک وقت کا کھانا نہیں کھانے کا فیصلہ کیا۔ ایک وقت کھانے میں جو سامان (چاول، دال، نمک، تیل، سبزی وغیرہ) استعمال ہوتے تھے انھیں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح 150 قیدیوں کا ایک وقت کا کھانا بچتا تھا۔ رام کرشن مشن کی گاڑی ہر شام کو آتی اور سامان لے جاتی تھی۔ مسلم لیگ نے 16 اگست 1946 کو 'ڈائرکٹ ایکشن ڈے' منانے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں کلکتے میں بھیانک فرقہ وارانہ ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ 'وزیر اعظم' شہید سہروردی کے حکم سے پولس کو مسلسل تین دنوں تک چھٹی دے دی گئی۔ ان تین دنوں کے قتل عام میں تقریباً تین ہزار سے زائد لوگوں کی لاشیں سڑکوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ مشہور انگریزی اخبار The Statesman نے اس قتل عام کا نام The Great Calcutta Killing دیا تھا۔ آج بھی اس خونی منظر کو یاد کرتا ہوں تو ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس قتل عام کو دیکھ کر میری ماں پاگل ہوگئی تھیں۔ میں اس زمانے میں 5 ساگر دتہ لین (چونا گلی) میں رہتا تھا۔

م ش: ایمرجنسی کے زمانے میں آپ کی سیاسی سرگرمیاں کیسی رہیں؟

س ل: 1975 میں آنجہانی اندرا گاندھی نے حالات سے مجبور ہو کر پورے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی تھی۔ کمیونسٹوں پر عتاب نازل ہوا۔ گھر گھر گرفتاریاں ہونے لگیں۔ مجبوراً مجھے بھی انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ میں ساڑھے تین ماہ تک گھر سے بے گھر رہا۔

م ش: سرزمین بنگال سے جن شعرا و ادبا نے ترقی پسند ادب کو اعتبار بخشا ان میں پرویز شاہدی کے علاوہ آپ کس کی خدمات کے معترف ہیں؟

س ل: ابراہیم ہوش، اعزاز افضل، علقمہ شبلی، قیصر شمیم، ہوش اور افضل، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کلکتہ میں شبلی اور قیصر کا دم غنیمت ہے۔

م ش: آپ کی مطبوعہ تصانیف کیا ہیں؟

س ل: 'عذرا اور دیگر افسانے' (1941)، 'پسِ شعر' (شرح اشعار بطرزِ نو، 1981)، 'بے سروپا' (طنزیہ و مزاحیہ مضامین 1982) میں اور 'ہندستانی کمیونسٹ پارٹی' از کامریڈ مظفر احمد (ترجمہ 1983)، 'بنگال میں اردو نثر کی تاریخ۔ آغاز تا حال' (1998)، 'کلام' (نظمیں و غزلیں) 1999۔

م ش: ہندستان میں اردو کا مستقبل؟

س ل: اردو زبان عوام کے ہاتھوں، عوام کی گود میں جوان ہوئی ہے اور جب تک ہندستان میں عام لوگ اردو سے محبت کرتے رہیں گے، یہ زبان زندہ رہے گی۔ ہندستان میں اگر آر ایس ایس اور بی جے پی جیسی پارٹیوں کی حکومتیں دس بیس سال کے لیے قائم ہو جائیں تو اردو کا مستقبل باقی نہیں رہے گا۔

م ش: سیاسی اور ادبی زندگی میں آپ کے اہم مناصب اور مراتب؟

س ل: ● سابق سکریٹری اور صدر انجمن ترقی اردو (ہند) کلکتہ
● ایڈیٹر: روزنامہ 'آبشار' کلکتہ 1988 تا حال
● ایڈیٹر: سابق ہفتہ وار 'آثار' کلکتہ (1959 تا 1961)
● آلڈرمین کلکتہ کارپوریشن: 1985 تا 990،
● چیئرمین مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ: 1991 تا 2002

انعامات و اعزازات: ● ملیح آبادی ایوارڈ (مغربی بنگال اردو اکاڈمی)، 1984
● فریڈم فائیٹر ایوارڈ: '(کلکتہ یونیورسٹی) 1986
● پیس فورم سند اعزاز: (کلکتہ) 1985
● کُل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ: (مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ)، 2002

م ش: آپ کو اپنی کون سی نظمیں زیادہ پسند ہیں؟ اپنی پسند کے دو شعر سنائیں۔

س ل: 'ویت نام'، 'کھلونا'، 'بنام آزادی'، 'تلاشِ زندگی'، 'لوحِ تربت'، 'راہ کا پتھر'، 'واپسی'، 'متاعِ عمر رسیدہ'، 'سورج کی تھالی'، 'شہر آشوب'، 'اپنے ہم عمر ساتھیوں سے'، 'بنیاد کی اینٹیں'۔

مرے عروج کی شاہد ہیں پستیاں میری
بڑی بلندیِ پرواز سے گرا ہوں میں
سالک کے لیے تنگ ہے اوروں کو مبارک
وہ عیش جو منّت کشِ بیگانہ بنا دے۔

Dr. Masoom SharqiAT& P.O:- R.L.B. Lane, 24 Parganas (N) - 743194 (W.B.)

قاسم انصاری

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا تاریخی 14 واں سالانہ کل ہند اردو کتاب میلہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کا قائم کردہ ایسا فعال ادارہ ہے جو اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ملکی سطح پر اپنی خدمت پیش کررہا ہے۔ ان خدمات میں ایک بڑی خدمت اردو قارئین تک اردو کی کتابیں نہ صرف شائع کرنا بلکہ انھیں قارئین تک پہنچانا بھی ہے۔ کونسل یہ کام دو سطح پر کرتی آئی ہے۔ ایک موبائل وین اور دوسرے کتاب میلہ۔ کونسل کی یہ موبائل وین اردو آبادی تک خود پہنچتی اور کتابیں فراہم کراتی ہے۔ موبائل وین کا یہ دورہ مرحلہ وار ہوتا ہے اور ایک سال میں کونسل کی یہ وین مرحلہ وار کئی ریاستوں کا دورہ کرتی ہے لیکن کتاب میلہ سال میں صرف ایک مرتبہ ہی منعقد ہوتا ہے اور میلے کے انعقاد کے لیے کونسل بڑی اردو آبادی کا انتخاب کرتی ہے تاکہ اردو کتابوں کے تئیں بیداری کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی محبان اردو تک پہنچ سکے کہ اردو زبان کے مستقبل سے انھیں مایوس ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں اور وہ فروغ اردو کے اِس کارواں کا حصہ بن سکیں، اس مرتبہ 14 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کے انعقاد کے لیے کونسل نے میر کی نگری لکھنؤ کا انتخاب کیا کیونکہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے اِس شہر کو مرکزیت حاصل ہے، شام اودھ کے لیے مشہور یہ شہر اس لیے بھی مشہور ہے کہ اسی شہر سے اردو زبان و ادب و تہذیب کی بڑی تاریخ وابستہ ہے اور آج بھی تمام تر تبدیلیوں و ترقی کے باوجود یہ شہر اردو زبان و تہذیب کا امین ہے اور اہلِ لکھنؤ اپنی ان اردو تہذیب پر آج بھی ناز کرتے ہیں۔

6 نومبر سے 11 نومبر تک چلنے والے اِس میلے کے لیے کونسل نے لکھنؤ کے قیصر باغ میں واقع سینٹینل کالج کا انتخاب کیا۔ میلے کے انعقاد سے قبل کونسل نے ایک بڑی پریس کانفرنس کا انعقاد 5 نومبر کو یوپی پریس کلب لکھنؤ میں کیا۔ 3 بجے دوپہر میں منعقد ہوئی اِس پریس کانفرنس میں نہ صرف اردو صحافیوں بلکہ ہندی و انگریزی زبان کے اخبارات کے نمائندوں نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔ کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر وسیم بریلوی اور کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اِس پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ میلے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اس میلے کا مقصد اردو قارئین تک اردو کتابیں پہنچانا ہے تاکہ وہ اپنی من پسند کتابیں اس میلے سے خرید سکیں۔ انھوں نے کہا کہ کتاب میلوں کے ذریعے اردو قارئین میں خاص بیداری آئی ہے۔ اسی لیے اہلِ اردو اِس قسم کے میلوں کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ کونسل 1200 عنوانات کے ساتھ اس میلے میں اپنا اسٹال بھی لگا رہی ہے۔ کونسل کے اشاعتی کارناموں کو اجاگر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بچوں کے ادب سے لے کر شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ، سماجی علوم، سائنس، قانون، ریاضی، شماریات، فن خطاطی، فن مصوری، صحافت، زراعت،

سیاست، انجینئرنگ، کمپیوٹر ٹکنالوجی و دیگر موضوعات پر کتابیں شائع کرچکی ہے۔ تاکہ نئی اردو نسل زیادہ سے زیادہ ان کتابوں سے استفادہ کرسکے۔ چودھویں کل ہند اردو کتاب میلے کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ روزانہ میلے کے دوران مختلف ثقافتی پروگراموں کا انعقاد بھی کیا جارہا ہے تاکہ اردو والے اردو تہذیب و ثقافت سے جڑسکیں۔

کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے شہر لکھنؤ کی تاریخی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ کونسل نے 2005 کے بعد دوسری مرتبہ اِس شہر کا رخ کیا ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ اردو والے اِس میلے کے ذریعے اردو زبان و تہذیب سے جڑسکیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ میلہ ایک مرتبہ پھر بڑی کامیابی سے ہمکنار ہوگا اور لکھنؤ کے محبانِ اردو اپنی اردو دوستی کا بھرپور مظاہرہ کریں گے۔ انھوں نے میڈیا سے بھی اپیل کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردو زبان وادب کے مسائل اور کونسل کی جانب سے فروغ اردو کے لیے کی جارہی کوششوں کو اپنے اخبارات میں جگہ دیں اِس موقعے پر خاصی تعداد میں اردو ہندی اور انگریزی صحافیوں نے اردو زبان اور اس کے مسائل نیز کونسل کی سرگرمیوں سے متعلق سوالات بھی کیے۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے ان سوالات کے تشفی بخش جوابات بھی دیے۔ پریس کانفرنس میں کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نسیم احمد، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری، انتخاب عالم اور متعدد عہدیداران نے بھی شرکت کی۔

پہلا دن: 6 نومبر 2012

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا چودھواں سالانہ اردو کتاب میلے کا لکھنؤ میں افتتاح عمل میں آیا اور میلے کا شاندار آغاز ہوا۔ وزیرمملکت برائے فروغ انسانی وسائل جناب جتن پرساد نے اس میلے کا افتتاح کیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے وزیر موصوف نے اردو والوں کو یقین دلایا کہ حکومت اردو زبان کی ترقی اور اسے روزی روٹی سے جوڑنے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ نہیں آنے دے گی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کونسل اپنی اسکیموں کو دیہی اور شہری علاقوں میں مزید تیزی سے مزید آگے بڑھائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کونسل کے منصوبوں، اسکیموں سے فائدہ اٹھاسکیں۔ اردو زبان سے اپنے تعلق کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اختیاری مضمون کے طور پر انھوں نے اردو زبان پڑھی ہے لیکن اس وقت انھیں پتہ نہیں تھا کہ وہ ایک دن اردو کے سب سے بڑے کتاب میلے کا افتتاح کریں گے۔ وزیر موصوف نے حال ہی میں فروغ انسانی وسائل میں وزیرمملکت کا عہدہ سنبھالا ہے اور ان کے دورِ وزارت کا یہ پہلا کتاب میلہ ہے جس کا افتتاح انھوں نے لکھنؤ کے سینٹینیل کالج قیصر باغ میں کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ اس میلے کا افتتاح کرتے ہوئے انھیں بے حد خوشی ہورہی ہے۔ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اقلیتی معاشرے کی تعلیمی ترقی پر بھی زور دیا اور کہا کہ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ اور کانگریس صدر محترمہ سونیا گاندھی نے انھیں یہ ذمے داری اس لیے دی ہے تاکہ وہ پوری طاقت سے اردو زبان اور اقلیتی معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کرسکیں۔ کونسل کے سالانہ بجٹ میں اضافے کی بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کونسل کا سالانہ بجٹ 28 کروڑ سے بڑھا کر 45 کروڑ کردیا جائے گا۔

مدرسے کے بچوں کے لیے انھوں نے کہا کہ سرکار انھیں تکنیکی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ جوڑنے کی کوشش کرے گی تاکہ مدرسے کے بچے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ روزگار سے بھی جڑسکیں۔ اس موقعے پر انھوں نے دو اردو کتابوں اور ایک آن لائن اردو پروگرام 'آؤ اردو سیکھیں' کا اجرا بھی کیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کونسل کی کارکردگی اور اس کے قیام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کونسل اردو زبان کی ترقی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ اردو کمپیوٹر مراکز، خطاطی، اردو عربی مراکز، اشاعتی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آج کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک کونسل کے قائم کردہ ہزاروں کی تعداد میں یہ مراکز اردو خواندگی کو فروغ دینے کے ساتھ اردو والوں کو روزی روٹی سے جوڑنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کمپیوٹر ٹکنالوجی کی بڑھتی ترقی کے پیش نظر کونسل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے تاکہ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان بھی اس جدید ترقی سے جڑ سکے، آن لائن اردو پروگرام 'آؤ اردو سیکھیں' کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ کونسل نے اب کمپیوٹر کے ذریعے اردو زبان سیکھنے سکھانے کا طریقہ ڈھونڈھ نکالا ہے تاکہ گھر بیٹھے لوگ سی ڈی (CD) کے ذریعے اردو زبان آسانی سے سیکھ سکیں۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو کسی ایک خاص فرقے کی زبان نہیں بلکہ یہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اسی لیے کونسل اپنی اسکیموں سے سب کو جوڑنے کی کوشش کررہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کونسل کے اردو عربی فارسی، کیلی گرافی اور کمپیوٹر سینٹر کے ذریعے ہر طبقے کے لوگوں کو جوڑنے کا کام کررہی ہے تاکہ سبھی لوگ اِس زبان سے بہرہ ور ہوسکیں۔ انھوں نے اترپردیش میں اردو رسم الخط سکھانے کے چلن کو عام کرنے پر زور دیا اور کہا کہ اردو کا رشتہ ہندی وعلاقائی زبانوں سے

بھی مضبوط کیا جائے گا۔

اس موقعے پر خواجہ غریب نواز اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب انیس انصاری نے میلے کے انعقاد کے لیے کونسل کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ کونسل کا یہ کتاب میلہ لکھنؤ کے اردو پڑھنے والوں کی سیرابی کرے گا۔ انھوں نے حکومت سے اس بات کی اپیل بھی کی کہ اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مشہور شاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ انھوں نے بھی لکھنؤ میں اردو کتاب میلے کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور کہا کہ لکھنؤ اردو زبان وتہذیب کا مرکز ہے اور اہلِ لکھنؤ ہمیشہ سے اِس قسم کے ادبی وتہذیبی میلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے آتے ہیں۔ اس لیے کونسل کا یہ میلہ بھی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے کامیابی کے قدم چومے گا۔

6 نومبر کی شام 7 بجے سینٹینل کالج کے ہال میں شام غزل کا انعقاد کیا گیا، معروف غزل گلوکارہ رادھیکا چوپڑا نے اپنی مترنم آواز وغزل کے جادو سے میلے اور شام اودھ پر چار چاند لگائے۔ شہر کے محبان اردو، طلبا و طالبات وغزل شائقین نے رادھیکا چوپڑا کی غزلوں کا خوب لطف لیا اور انھیں داد وتحسین سے نوازہ، شام غزل پروگرام کی صدارت دوردرشن کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل جناب نورنگ نے کی، رادھیکا چوپڑا نے فیض احمد فیض، علی جلیل، شکیل بدایونی، اقبال، حفیظ ہوشیارپوری کے کلام سے محفل کو محظوظ کیا اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے غزل سرائی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے محترمہ رادھیکا چوپڑا کی حوصلہ افزائی کی، پروگرام کی نظامت کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد نے کی۔ اس کتاب میلے میں تقریباً 60 پبلشرز نے شرکت کی ہے۔ افتتاحی پروگرام میں طلبا وطالبات اور اردو زبان سے جڑی سرکردہ شخصیات نے بھی حصہ لیا اور وزیر موصوف کے ساتھ میلے میں لگی کتابوں کی نمائش کا جائزہ لیا۔

دوسرا دن : 7 نومبر 2012

میلے کے دوسرے دن یعنی 7 نومبر کو لکھنؤ کے سینٹینل کالج قیصر باغ میں اردو کتب شائقین کی بڑی تعداد اور بھیڑ دیکھی گئی۔ قومی اردو کونسل کے علاوہ کئی بڑے اسٹالس بالخصوص مکتبہ الحسنات، نئی دہلی، خدابخش اورینٹل، پبلک لائبریری، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، اردو اکادمی دہلی، مغربی بنگال اردو اکادمی،

کل ہند اردو کتاب میلہ کے دوران اپنے فن کا جادو جگانے والے فنکاروں کا ایک تعارف

ڈاکٹر رادھیکا چوپڑا: آبائی وطن جموں، ان دنوں دہلی میں مقیم ہیں، دہلی یونیورسٹی سے ہی فن موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور ایم اے، ایم فل و پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن کے فنکاروں کی ٹاپ گریڈ فہرست میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر رادھیکا چوپڑا انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی بھی فہرست میں شامل ہیں: غزل، ٹھمری، دادرا کی تعلیم بیگم اختر کی شاگردہ شانتی ہیرانند سے حاصل کرنے کا انھیں شرف حاصل ہے۔ ملک وبیرون ملک میں بھی اپنے فن کا جادو جگا چکی ہیں اور ابھی حال ہی میں لاہور (پاکستان) سے واپسی کرنے کے بعد انھوں نے 14 ویں کل ہند اردو کتاب میلہ کی پہلی شام غزل میں اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

استاد وجاہت حسین خاں بدایونی: استاد وجاہت حسین خاں بدایونی قوالی کے میدان میں اپنا خاص اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق رام پور سہسوان گوالیار گھرانہ سے ہے۔ گویا ان تین گھرانوں سے مل کر انھوں نے فن قوالی کے اسرار ورموز سیکھے۔ کلاسیکی قوالی کی تعلیم انھوں نے اپنے دادا پدم بھوشن جناب استاد نثار حسین خاں والد زاہد حسین خاں سے حاصل کی، آبائی سلسلہ کے ساتھ استاد وجاہت حسین خاں نے استاد جعفر حسین خاں سے بھی قوالی کی تعلیم حاصل کی۔ ملک کے مختلف شہروں، علاقوں میں اپنے فن کے جادو جگا چکے استاد وجاہت حسین خاں بیرون ملک بالخصوص، فجی، امریکہ، برطانیہ ودیگر ممالک میں بھی اپنے پروگرام پیش کر چکے ہیں۔

ٹام الٹر: ہندوستانی سنیما کے معروف اداکار ٹام الٹر تھیٹر اور ڈرامہ میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں جس کی جیتی جاگتی مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر تیار کیا گیا ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامہ کو ڈاکٹر سعید عالم نے تحریر کیا ہے اور مولانا آزاد کا کردار کر کے ٹام الٹر نے اس ڈرامہ کو شہرت ومقبولیت بخشی ہے۔ یہ ڈرامہ اب تک 118 مرتبہ پیش کیا جا چکا ہے۔ پہلا ڈرامہ انھوں نے سال 2002 میں پیش کیا تھا۔ ہندوستان کے مشہور ومعروف اور بڑے شہروں کے علاوہ ٹام الٹر اس ڈرامہ کو امریکہ، برطانیہ، اومان میں بھی پیش کر چکے ہیں۔ ٹام الٹر کی منفرد اداکاری اور ان کی نمایاں خدمات کا اعتراف حکومت ہند نے بھی کیا ہے اور انھیں سال 2008 پدم شری اعزاز سے سرفراز کیا ہے۔ کرانتی، پرندہ، مرد، ویرزارا، اعتبار، اور بھیجا فرائی کے علاوہ ان کی مقبول ہندی فلموں کی خاصی لمبی فہرست ہے۔

نعیم علی تھرکوا: نعیم علی تھرکوا کی پیدائش اترپردیش کے شہر رام پور سے ہے اور فن موسیقی میں ان کا گھرانہ مرادآباد گھرانہ کہلاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے فنکاروں کی ٹاپ گریڈ فہرست میں نعیم علی تھرکوا کا بھی نام شامل ہے اور ٹی وی ریڈیو پر بھی وہ اپنے پروگرام پیش کرتے آئے ہیں۔ غزل، ٹھمری دادرا کی کلاسیکی تعلیم انھوں نے استاد نبی خان تھرکوا سے حاصل کی۔ والد کے علاوہ استاد افضل حسین سے بھی انھیں شرف تلمذ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ نعیم علی اردو غزل سرائی کے شہنشاہ معروف غزل سرا جناب غلام علی کی شاگردی میں ان دنوں میں اور وہ اِس میدان کی مزید باریکیاں ان سے سیکھ رہے ہیں۔ نعیم علی تھرکوا ملک کے مختلف شہروں میں اپنے فن کا جادو جا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں امریکہ، پاکستان، بنگلہ دیش، برطانیہ، پیرس، دبئی اور شارجہ میں بھی اپنے پروگرام پیش کر چکے ہیں۔

من پریت اختر: صوبہ پنجاب کے شہر پٹیالہ سے تعلق رکھنے والی معروف صوفی گلوکارہ من پریت اختر دراصل اپنے صوفیانہ کلام کی بنا پر منفرد مقام رکھتی ہیں۔ وہ معروف پنجابی گلوکار دلشاد اختر کی بہن ہیں۔ بچپن میں نور جہاں، ریشمہ، اور رونا لیلیٰ کو ریڈیو پر بڑے شوق سے سنتی تھی اور ان فنکاروں سے ہی انھیں صوفیانہ کلام پیش کرنے کا حوصلہ ملا۔ اس فن کی تعلیم انھوں نے پٹیالہ گھرانہ سے تعلق رکھنے والے پنڈت کرشن کانت سے بھی حاصل کی۔ ریڈیو ٹی وی پروگراموں کے علاوہ انھوں نے ہندی فلموں میں بھی اپنے آواز کے جادو جگائے ہیں۔ 'فلم کچھ کچھ ہوتا ہے' میں وہ اپنی آواز اور اپنے فن کی پہچان چھوڑ چکی ہیں۔ علاوہ ازیں من پریت اختر ان دنوں کئی پنجابی فلموں کے لیے بھی کام کر رہی ہیں۔

راجستھان اردو اکادمی، کرناٹک و اترپردیش اردو اکادمی، رام پور رضا لائبریری ملک بک ڈپو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، خورشید بک ڈپو، اسلامی بک سروس پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی، انجم بنک ڈپو، اقرا بکس اینڈ ملٹی میڈیا، اکولہ، ساہتیہ اکادمی و نیشنل بک ٹرسٹ اور جموں کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویج، سری نگر پر اردو شائقین کی خاصی تعداد دیکھی گئی۔ بالعموم والدین اپنے بچوں اور مدارس کے طلبا اردو کتاب خریدنے میں مصروف رہے۔ مذہبی کتابوں کے علاوہ، ادب، تاریخ، سماجی و سائنسی، صحافت، کمپیوٹر، ٹکنالوجی کے ساتھ درسی و نصابی کتابیں بھی توجہ کا مرکز بنیں۔

شام 7 بجے محفل قوالی کا انعقاد کیا گیا۔ ملک کے معروف قوال وجاہت حسین خاں بدایونی اور ان کے ساتھیوں نے محفل کو رومانیت بخشی، اہلِ لکھنؤ زبان و ادب کے ساتھ فن ثقافت کے بھی قدردان ہیں اس لیے اس محفل قوالی میں بھی بڑی تعداد میں شائقین موجود رہے۔ ملک و بیرون ملک میں قوالی کی محفل اور اپنے فن کا جادو جگا چکے استاد وجاہت حسین نے حضرت علی کی شان میں منقبت پیش کرکے پروگرام کا آغام کیا۔ محفل قوالی کی صدارت نواب مرزا جعفر عبداللہ نے کی جب کہ نظامت کے فرائض کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نسیم احمد نے انجام دیے۔

تیسرا دن: 8 نومبر 2012

قومی اردو کونسل، اترپردیش اردو اکادمی اور دہلی اردو اکادمی کے اشتراک سے چل رہے 14 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کے تیسرے دن بھی رونقیں برقرار رہیں۔ میلے میں سجے تمام اسٹالوں پر اردو کتاب شائقین کی خاصی تعداد دیکھی گئی۔ بالعموم کتاب شائقین شعر و ادب کے علاوہ قانون، طب، سائنس ٹکنالوجی، دیوان، کلیات، اردو زبان میں شائع رامائن، مختلف اردو پروگراموں پر مبنی سی ڈی، و دیگر علوم وفنون کی کتابیں محبان اردو کی مرکز نظر رہیں۔ کونسل کے اِس میلے کی بازگشت شہر لکھنؤ سے باہر قریبی اضلاع میں بھی پہنچ گئی۔ ضلع ہردوئی، بارہ بنکی، سیتاپور، ملیح آباد و دیگر قریبی اضلاع سے بھی خاصی تعداد میں محبان اردو نے اس میلے کا رخ کیا اور انھوں نے مختلف اسٹالس سے اردو کی کتابوں کی خریداری کی۔ کونسل نے چونکہ شہر لکھنؤ کے تمام چوراہوں، سڑکوں، شاہراہوں، تعلیمی اداروں، و دیگر اہم مقامات پر میلے کی تشہیر کے لیے بڑی بڑی ہورڈنگ لگوائی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میلے میں شرکت کریں۔

8 نومبر کی شب معروف فلم اداکار ٹام آلٹر نے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مبنی ڈرامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر سعید عالم کے تحریر کردہ اس ڈرامے کو دیکھنے کے لیے زبردست بھیڑ امڈ پڑی، گرچہ یہ ڈرامہ پہلی مرتبہ نہیں بلکہ شہر لکھنؤ میں چوتھی بار پیش کیا گیا ہے حالانکہ اب تک یہ ڈرامہ ملک کے مختلف شہروں میں 118، مرتبہ پیش کیا جاچکا تھا۔ لیکن لوگوں کی بھیڑ سے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید یہ ڈرامہ لکھنؤ میں پہلی مرتبہ پیش کیا جارہا ہے۔ ٹام آلٹر ایک انگریز افسر کے و دیگر اہم کرداروں کے طور پر بہت سی ہندی فلموں میں کام کرچکے ہیں، ان کی اردو دانی، الفاظ کی ادائیگی، اور مولانا آزاد کی تحریر کی ادائیگی پر سبھی ششدر رہ گئے یہاں تک کہ ڈرامہ دیکھنے دارالعلوم ندوۃ العلما کے بہت سے اساتذہ وطلبا نے بھی ٹام آلٹر کے کردار اور ان کی اردو بیانی پر تعجب کا اظہار کیا اور بالآخر انھیں مبارکباد و داد وتحسین سے نوازہ، ڈرامہ شو کی صدارت معروف اداکار راجا ہوستھی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نسیم احمد نے انجام دیے۔

چوتھا دن: 9 نومبر 2012

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے 14 ویں سالانہ کل ہند اردو کتاب میلے کے چوتھے دن شام غزل کا انعقاد کیا گیا، معروف غزل گلوکار نعیم علی تھرکوا نے غزلوں سے میلے میں چار چاند لگائے۔ ملک و بیرون ملک میں اپنے فن کا جادو جگانے کے بعد انھوں نے اپنے فن کو ساز پر قیصر باغ کے سینٹینل کالج میں چھیڑا تو سامعین جھوم اٹھے، غزلوں کے علاوہ انھوں نے ٹھمریوں اور دادروں سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر نسیم احمد نے انجام دیے۔

میلے میں مختلف ثقافتی پروگراموں کے ساتھ اردو کتابوں کی خریداری بھی اپنے شباب پر رہی اردو کتب شائقین مختلف موضوعات پر کتابیں خریدنے میں مصروف رہے۔ اردو کی درسی و نصابی کتابیں بھی شائقین کی توجہ کا مرکز بن رہی ہیں۔ ملیح آباد سے آئے محمد اجمل کا کہنا ہے کہ میلے کا انعقاد ہم اردو والوں کے لیے مرکزی حکومت کا ایک بڑا قدم ہے اور اِس قسم کے میلوں کا مزید انعقاد کیا جائے تاکہ اردو کتاب پڑھنے پڑھانے کو مزید فروغ مل سکے۔ قومی اردو کونسل 1200 موضوعات پر شائع کی گئی کتابوں کے علاوہ دہلی اردو اکادمی اترپردیش اردو اکادمی، کرناٹک، مغربی بنگال و راجستھان اردو اکادمیوں، ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ، مکتبہ الحسنات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، رام پور رضا لائبریری، مکتبہ جامعہ، خورشید بک ڈپو، مرکزی مکتبہ اسلامی اور اسلامک سروس و دیگر بڑے ناشرین اِس میلے کو رونق بخش رہے ہیں، کتابوں کے علاوہ کونسل کے آن لائن اردو پروگرام 'آؤ اردو سیکھیں' و اقرا ملٹی میڈیا اکولہ کی سی ڈی بھی اردو شیدائیوں کو متوجہ کر رہی ہے۔

میلے کا یہ منظر دیکھنے کے بعد حکیم اجمل خاں میموریل اکادمی کے صدر ڈاکٹر حکیم سید حبیب الرحمٰن کا کہنا ہے کہ یہ میلہ اپنی نوعیت کا بے حد منفرد و تاریخی میلہ ہے اور کونسل کے اِس کام کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ میلے میں آنے والے شائقین کی زیادہ تر تعداد مدارس کے علما کی تھی۔ انھوں نے جمعہ کی چھٹی کا بہتر استعمال کرتے ہوئے اردو کتاب میلے کو رونق بخشی۔ بالخصوص دارالعلوم، ندوۃ العلما و دیگر مدارس کے طلبا یہاں خاصی تعداد میں آئے اور کتابیں خریدیں۔ اس کے علاوہ خواتین کی بھی خاصی تعداد دیکھی گئی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ادب اطفال و دیگر موضوعات پر کتابیں خریدتی نظر آئیں۔ میلے میں غیر ملکی محبان اردو نے بھی مختلف اسٹالوں پر کتابیں خریدتے نظر آئے۔

پانچواں دن: 10 نومبر 2012

14 ویں کل ہند اردو میلے کے پانچویں دن زیادہ تر ناشرین نے اپنی رعایت کے دروازہ کھول دیے تھے، چونکہ 6 نومبر کو میلہ اپنے وقت معینہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوا تھا اس لیے پانچویں دن میلے میں اور بھی زیادہ بھیڑ دیکھی گئی۔ بالخصوص شام کے وقت سبھی اسٹالس اردو کتاب شائقین سے پر تھے اور خصوصی رعایت کا فائدہ بھی اٹھا رہے تھے۔ ناشرین کے مطابق میلے کے پانچویں دن کتابیں بڑی تعداد میں خریدی گئیں اور ان کے چہروں پر نسبتاً زیادہ خوشی دیکھی گئی۔

شام 5 بجے صوفیانہ کلام کی محفل آراستہ کی گئی۔ معروف صوفی گلوکارہ، من پریت اختر نے صوفیانہ کلام سے میلے کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی، انھوں نے حضرت امیر خسرو سے لے کر کئی معروف صوفی شاعروں کے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ حسب معمول اِس پروگرام کی نظامت کے فرائض کونسل کے پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر نسیم احمد نے انجام دیے، کونسل ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، شاہنواز خرم، ریسرچ اسسٹنٹ انتخاب عالم، ڈاکٹر قاسم انصاری و دیگر اسٹاف نے بھی شرکت کی۔

میلے کے پانچویں دن یعنی 10 نومبر کو صوفیانہ کلام کے بعد شام سات بجے کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ میلے کے ثقافتی پروگراموں کی فہرست کا یہ آخری پروگرام تھا گویا میلے کے ثقافتی پروگراموں کا اختتام کل ہند مشاعرے سے ہوا۔ 10 نومبر کی شب منعقد مشاعرے میں طلبا و طالبات و محبان اردو سے پر تھا۔ اپنے پسندیدہ شعرا کو سننے کے لیے ایسی بھیڑ امڈی کہ مشاعرے میں موجود شعرا نے اس میلے کو ایک تاریخی اور مثالی مشاعرہ قرار دیا۔

کل ہند مشاعرے کی صدارت خواجہ غریب نواز اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر انیس انصاری نے کی۔ جب کہ ریاست کے ڈائریکٹر جنرل آف پولس رضوان احمد مہمان خصوصی تھے۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض معروف شاعر منصور عثمانی نے انجام دی۔

تمام شعرا کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ مشاعرے ہماری تہذیبی روایت کا اہم ترین حصہ ہیں۔ مشاعرے کے چاہنے والوں سے کھچاکھچ بھرے ہال پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اہلِ لکھنؤ میلے اور مشاعرے کی کامیابی کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں اور وہ اِس تاریخی منظر و بھیڑ کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔ علاوہ ازیں دیگر شعرا نے بھی اس مشاعرے کو تاریخی اور ایک مثالی مشاعرے قرار دیا کیونکہ اس مشاعرہ کو سننے کے لیے جہاں ایک طرف لکھنؤ کے محبان اردو اس قدر جمع تھے کہ ہال اور ہال سے باہر صحن میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دوسری خاص بات یہ کہ اس مشاعرے کو سننے کے لیے طالبات کی بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ ادب وتہذیب اور روایت کو برقرار رکھتے ہوئے لکھنؤ کے محبان اردو نے اپنے اردو ذوق کا بھرپور ثبوت دیا۔

معروف شاعرہ شبینہ ادیب نے اپنے کلام سے مشاعرہ کا آغاز کیا:

نہ مٹی تھی نہ مٹی ہے نہ مٹے گی اردو
چاہنے والوں کے ہونٹوں پہ رہے گی اردو

(شبینہ ادیب)

شام ہوتی ہے تو شاخوں پہ گلاب آتے ہیں
تو بھی پردیس سے آجا تیرے خواب آتے ہیں

(رئیس انصاری)

ذہن و دل میں تمھیں آباد کرے گی دنیا
کچھ کرو کام تبھی یاد کرے گی دنیا
سلطنت عشق کی ہم نذر کیے جاتے ہیں
جو بھی تھا دے دیا کیا یاد کرے گی دنیا

(منظر بھوپالی)

سبھی کو چھوڑ کے خود پر بھروسہ کرلیا میں نے
وہ میں جو مجھ میں مرنے کو تھا زندہ کرلیا میں نے
مجھے اس پار اتر جانے کی جلدی کچھ ایسی تھی
کہ جو کشتی ملی اس پر بھروسہ کرلیا میں نے

(پروفیسر وسیم بریلوی)

دو گز سہی مگر یہ ملکیت تو ہے
اے موت تو نے مجھے زمیندار کردیا
نئی ہواؤں کی صحبت بگاڑ دیتی ہے
کبوتروں کو کھلی چھت بگاڑ دیتی ہے

———

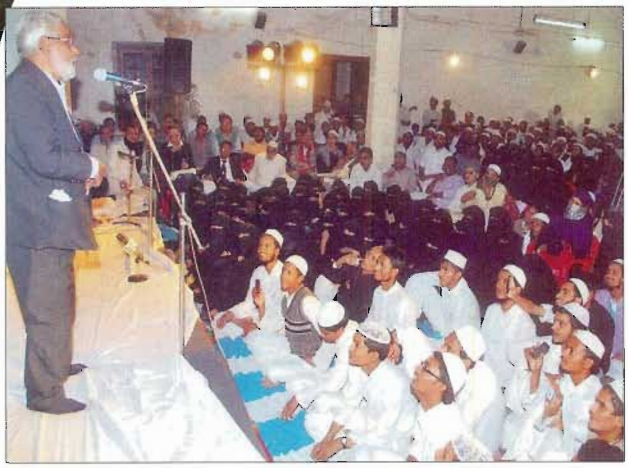

جو جرم کرتے ہیں اتنے برے نہیں ہوتے
سزا نہ دے کے عدالت بگاڑ دیتی ہے
ہمارے میر تقی میر نے کہا تھا کبھی
میاں یہ عاشقی سب بگاڑ دیتی ہے
(راحت اندوری)

اس کی خوشبو میری غزلوں میں سمٹ آئی ہے
نام کا نام ہے رسوائی کی رسوائی ہے
ہجر کی رات ہے اور ان کے تصور کا چراغ
بزم کی بزم ہے تنہائی کی تنہائی ہے
(اقبال اشہر)

روشن چہرہ بھیگی زلفیں دوں کس پر کس کو ترجیح
ایک قصیدہ دھوپ کا لکھوں ایک غزل برسات کے نام
زندگی میں پہلے تو اتنی پریشانی نہ تھی
تنگ دامانی تھی لیکن چاک دامانی نہ تھی
(پروفیسر ملک زادہ منظور)

میرے دل کے کسی کونے میں ایک معصوم سا بچہ
بڑوں کو دیکھ کر دنیا بڑا ہونے سے ڈرتا ہے
یہاں ہر شخص ہر پل حادثہ ہونے سے ڈرتا ہے
کھلونا ہے جو مٹی کا فنا ہونے سے ڈرتا ہے
(راجیش ریڈی)

ان شعرا کے علاوہ نسیم نکہت، معراج فیض آبادی، بشیر فاروق، عیش زاہد، منصور عثمانی، چرن سنگھ بشر، نعیم اختر برہانپوری اور مدن موہن دانش نے بھی اپنے کلام سے مشاعرہ کو چار چاند لگائے، پرہجوم شرکا نے بھی آخر تک اپنے پسندیدہ شعرا کے کلام کو فرمائش کر کے سنا اور کونسل کی کوششوں کو سراہا گیا۔

چھٹا دن: 11 نومبر 2012

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اترپردیش اردو اکادمی، اور دہلی اردو اکادمی کے اشتراک سے لکھنؤ کے سینٹینل کالج قیصر باغ میں چل رہا۔ چودھواں کل ہند سالانہ اردو کتاب میلہ آج اختتام پذیر ہوا۔ 6 نومبر سے 11 نومبر تک چلنے والے اس میلے میں تقریباً 60 ناشرین نے شرکت کی اور اپنی نادر و نایاب کتابوں سے میلے کو رونق بخشی، 11 نومبر کی صبح کالج کے لان میں اختتامی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں میلے کے دوران شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ناشرین کو انعامات سے سرفراز کیا گیا۔ کتابوں کی سب سے بہترین نمائش کے لیے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کو پیش کیا گیا۔ کتابوں کے بہترین مجموعہ کے لیے ملک بک ڈپو دہلی کو پیش کیا گیا جب کہ سب سے زیادہ اردو کتابیں فروخت کرنے کا سہرا ایک مرتبہ پھر مکتبہ الحسنات دہلی کے سر رہا۔

تمام انعامات کونسل کے وائس چیئرین پروفیسر وسیم بریلوی کے ہاتھوں تقسیم کیے گئے۔ اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر وسیم بریلوی نے پہلے تو لکھنؤ کے محبان اردو ناشرین کی بہتر کارکردگی کے لیے مبارک باد پیش کی اور اردو میلے کے تئیں ان کے بھرپور تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا۔ اپنی خصوصی تقریر میں انھوں نے کہا کہ اردو کتاب میلہ اردو زبان و اردو رسم الخط کے تئیں احساس بیداری پیدا کرنے کا نام ہے اور اہل لکھنؤ نے اس احساس کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔

اترپردیش میں اردو رسم الخط کی موجودہ صورت حال پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یوپی میں اردو رسم الخط کی بقا اور اس کے تحفظ کے لیے کونسل مزید فعال اداروں و شخصیات کی مدد سے مزید مراکز قائم کرے گی اور جلد ہی اس اعلان کو عملی جامہ پہنائے گی۔ انھوں نے کہا اردو ایک رابطے کی زبان ہے اس لیے اردو کا باہمی رشتہ ہندی سمیت دیگر زبانوں سے بھی استوار کیا جائے گا، انھوں نے مزید کہا کہ کونسل آج اپنے کمپیوٹر مراکز کے ذریعے نہ صرف اردو زبان کو فروغ دے رہی ہے بلکہ نئی اردو نسل کو روزی روٹی سے بھی جوڑ رہی ہے اردو کے ساتھ عربی فارسی وفن خطاطی کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ کونسل اردو زبان کی ترقی کے لیے کیسے کیسے ہمہ جہت منصوبے رکھتی ہے اور اس کے تحت آن لائن اردو پروگرام 'آؤ اردو سیکھیں' انسائیکلو پیڈیا، ڈیجیٹل لائبریری کے منصوبوں کو بھی عملی جامہ پہنا رہی ہے، کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی خصوصی کوششوں سے شروع کیے گئے آن لائن اردو پروگرام کی مقبولیت ان کوششوں کی بہترین مثال ہے، اسی طرح کونسل معیاری اردو کتاب کی اشاعت سے بھی اردو زبان کو فروغ دے رہی ہے اور اب تک تقریباً 1200 عنوانات پر کتابیں شائع کرچکی ہے جس کی نمائش اس میلے میں کی گئی۔

6 روزہ اِس میلے میں تقریباً 25 لاکھ کی کتابیں فروخت ہوئیں، لکھنؤ اردو زبان و ادب وتہذیب کا ایک بڑا مرکز ہے اور اس میلے کے دوران اہلِ لکھنؤ نے اپنی مرکزیت کا واضح ثبوت دیا ہے۔ میلے کے اخیر دنوں میں بھیڑ زیادہ رہی۔ بیشتر ناشرین اپنی کتابوں کی فروخت سے مطمئن نظر آئے۔ بچوں کے ادب، خواتین کے ادب، مذہبیات کے علاوہ سماجی علوم، جدید علوم وفنون و دیگر موضوعات کی کتابیں محبان اردو کی توجہ کا مرکز بنیں۔ قومی کونسل اقرا ملٹی میڈیا و دیگر کئی اسٹالوں میں دستیاب سی ڈی بھی توجہ کا مرکز رہی۔ کونسل کے آن لائن پروگرام کی سی ڈی بھی بے حد مقبول رہی اور امید سے زائد فروخت ہوئیں۔

◘

Qasim Ansari, F 105, 2nd Flr, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

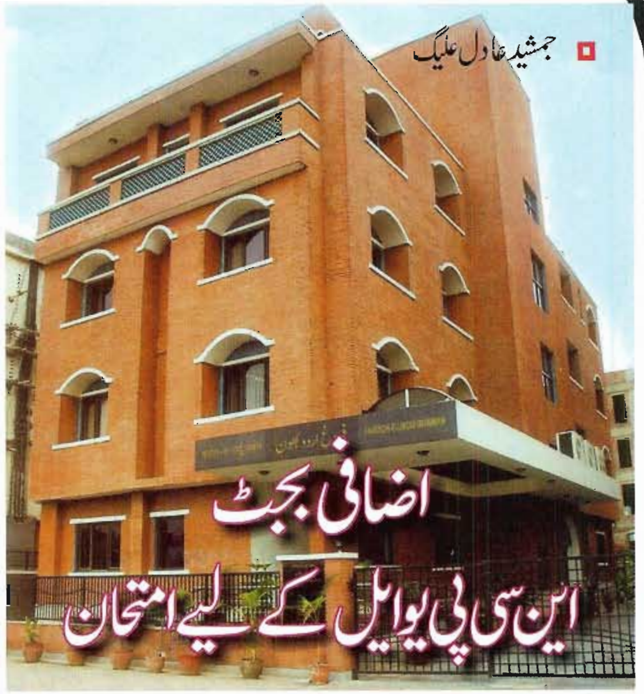

■ جمشید عادل علیگ

اضافی بجٹ

این سی پی یو ایل کے لیے امتحان

اردو کو مزید سنوارنے کی کوششیں شروع ہوگئی ہیں اس کے مستقبل کو روشن تر کرنے کے عمل کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بجٹ 28 کروڑ سے بڑھا کر سیدھے 45 کروڑ کردیا جانا اسی عمل کی باحوصلہ پیش رفت ہے۔ مرکزی حکومت نے شاید پہلی بار اردو کے فروغ کے لیے اس طرح کی وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس فراخ دلی نے اردو والوں کی آنکھوں میں امید کی نئی کرن پیدا کردی ہے اور اردو کے ان سالاروں کے جبین ناز پر ہمیشہ پڑی رہنے والی شکن بھی مدھم نظر آتی ہے جو حکومت کی تساہلی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ اردو کی خدمت کا دعویٰ کرنے والے یہ سالار خود پر بھروسہ کرنے کے بجائے حکومت کو اردو کا قرض دار سمجھتے رہے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں محبان اردو کی سرد مہری، تساہلی اور تغافل کا زیادہ دخل ہے۔ یوں تو سرکاری سطح پر اردو کے فروغ کے لیے ریاستی اردو اکادمیاں اور نیم سرکاری اردو اداروں کی کارکردگی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بھلے ہی وہ تھوڑا بہت کام کر رہی ہیں لیکن ان کے عمل سے اردو کو زیادہ طاقت تو نہیں ملتی مگر کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس کی رگ جاں میں تھوڑی حرارت ضرور دوڑ جاتی ہے۔ مگر ان سب سے الگ مرکزی حکومت کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک ایسا سرکاری ادارہ ہے جو پوری طرح فعال ہوکر فروغ اردو اور اس کے مستقبل کو روشن بنانے کا باضابطہ لائحہ عمل تیار کر چکا ہے۔ بلاشبہ کونسل کے بجٹ میں 17 کروڑ کا اضافہ اس کی تیز رفتار ترقی کو مزید جلا بخشے گا۔ اردو میں نئے نئے امکانات تلاش کرنے، خاص کر نئی نسل میں اردو کی خوشبو پہنچانے کے لیے کونسل کا یہ اضافہ شدہ بجٹ اہم رول ادا کرے گا۔

یہ بھی اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ این سی پی یو ایل کو ہمیشہ معتبر اور متحرک شخصیتوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شاہد صدیقی، شمس الرحمن فاروقی، چندر بھان خیال سے لے کر پروفیسر وسیم بریلوی تک کونسل نے فروغ اردو کے نئے نئے امکانات تلاش کیے ہیں اور یہ بھی اتفاق ہے کہ سرکاری سطح پر کونسل کے جو ڈائرکٹر بنائے گئے انھوں نے خشک سرکاری کارکردگی کے بجائے پوری تندہی اور مخلصانہ جذبے کے ساتھ اردو کے گیسو سنوارنے اور کونسل کے وقار کو بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے اردو کے فروغ کے لیے جو ٹریک استعمال کیا وہ آج بھی کارآمد ہے۔ پورے ملک میں کمپیوٹر سینٹروں کا قیام، مسلم نوجوانوں کو روزگار سے جوڑنے اور اردو کو درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے کونسل کا یک اہم منصوبہ ہے، جس میں وہ کامیاب ہے۔ علی جاوید سے لے کر خواجہ محمد اکرام الدین تک کونسل کے ڈائرکٹر نے اردو کے عظیم پروجیکٹ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ این سی پی یو ایل ایک سرکاری ادارہ ہوتے ہوئے بھی میدان تعلیم میں مسلمانوں کے لیے ایک روشن مینارہ بن چکا ہے۔ اس کی خدمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے جس کا اعتراف مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جتن پرساد نے لکھنؤ میں منعقد 14 ویں اردو میلے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتوں کو معاش پر مبنی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ کونسل کو سمینار، کانفرنس، سمپوزیم تک محدود نہیں رہنا ہے۔ اسے گاؤں گاؤں تک پہنچ کر عملی طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے جو محض کاغذوں تک محدود نہ ہو بلکہ زمینی سطح پر نظر آئے اور اس کا فائدہ عوام کو پہنچے۔ انھوں نے یہ واضح کردیا کہ حکومت اردو کے فروغ کے لیے خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ اس کا بجٹ جو 28 کروڑ کا تھا اسے 45 کروڑ کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو کتابیں شائع کی گئی ہیں اگر یہ کتابیں طلبا تک نہیں پہنچیں تو یہ سب محنت بیکار ہے ان کتابوں کی تقسیم کا ایسا نظم ہو کہ یہ آسانی سے لوگوں تک پہنچ سکیں۔ انھوں نے اس بات کو دوٹوک انداز میں کہا کہ اردو زبان سے بہتر کوئی زبان نظر نہیں آتی۔ خیالات کے اظہار کا جو سلیقہ اردو میں ہے وہ کہیں نہیں ملتا۔ ہم ہندی بولتے وقت بھی اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ اردو کی مقبولیت کا نتیجہ ہے۔ آج اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ کونسل اس جانب موثر قدم اٹھائے گی۔ میں بھی خصوصی طور پر اس سمت دھیان دوں گا تاکہ اقلیتوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا نظم ہو جس کے تحت وہ روزگار سے منسلک ہوسکیں۔ اس لیے کوالٹی ایجوکیشن اسکیم کے تحت مدارس کے ڈھانچے میں ترقی و تبدیلی کے لیے جو بجٹ مختص ہوا ہے اس میں بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ علاوہ ازیں حکومت مدارس کے بچوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے انھیں تکنیکی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے گی۔

بہرحال اردو کے فروغ کے لیے حکومت کے کردار و عمل پر سے گرد چھٹتی جارہی ہے۔ قومی کونسل کا بجٹ بڑھنے سے اردو حلقوں میں امید کی ایک نئی لہر دوڑی ہے حالانکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں اردو کی روشنی کو پھیلانے کے لیے کونسل کا 45 کروڑ کا بجٹ کوئی بڑا بجٹ نہیں ہے۔ مگر جتن پرساد کی جو اردو نوازی ہے حکومت کا جو حوصلہ ہے وہ اس میں مزید اضافے کا سبب بن سکتی ہے۔ مگر بجٹ بڑھانے سے قبل حکومتیں اچھی طرح جانچ بھی کرتی ہیں۔ خفیہ رپورٹوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ اداروں کی کارکردگی کی رپورٹیں بھی منگائی جاتی ہیں اور اس کے بعد ادارے کا سربراہ اگر چاق و چوبند ہو تو پھر بجٹ بڑھانے کی تجویز متعلقہ وزارت تک پہنچتی ہے اور پھر وزارت کا سربراہ مثبت سوچ کا حامل ہو تو بات آگے بڑھتی ہے۔ این سی پی یو ایل کی خوش قسمتی ہے کہ دونوں سطحوں پر اردو کے فروغ کے لیے مثبت فکر و نظر کے پیکر موجود ہیں۔ نوجوان وزیر جتن پرساد، پروفیسر وسیم بریلوی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام کا اتحاد ثلاثہ اردو کے لیے ایک نیک فال ہے۔

بشکریہ: روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 10 نومبر 2012

■

Jamshed Adil Alig, Roznama Rashtriya Sahara Noida

▪ وہاج الدین علوی

وارث کرمانی

شبو میاں

(1925-2012)

قرۃ العین حیدر کے 'شبو' اہل خاندان کے شبو چچا اور حلقۂ علم وادب کے پروفیسر وارث کرمانی، آخر کو وہیں پہنچ گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے
چلی جاتی ہرواں خلقت خدا کی

بقرعید سے ایک دن پہلے 26 اکتوبر صبح 6½ بجے ان کے چھوٹے داماد عبدالحلیم صاحب کا فون آیا کہ بھائی جا (پروفیسر کرمانی کے گھر والے انھیں 'بھائی جا' ہی کہتے تھے) کا انتقال ہوگیا۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون٥

یہ کھٹکا تو اسی دن سے لگا تھا جس دن انھیں Ventilatior پر رکھا گیا تھا، لیکن ڈاکٹر اطمینان دلا رہے تھے کہ حالت پہلے سے بہتر ہورہی ہے۔ آخری بار ان سے ملاقات کرنے جب میں اور میری بیوی لائنس ہاسپٹل (دہلی) پہنچے تو ہوش وحواس میں باتیں کررہے تھے۔ لیکن دوسری رات ان پر نمونیا کا شدید حملہ ہوا اور انھیں بترا ہاسپٹل منتقل کرنا پڑا۔

وارث کرمانی کم وبیش 87 برس کی عمر طبعی کو پہنچے۔ ان کی علمی اور تخلیقی عمر 60 برس کی ہوسکتی ہے۔ باقی ماندہ عمر عزیز انھوں نے رایگاں نہیں گنوائی بلکہ اودھ کے جاگیردارانہ ماحول میں مرحوم نے تہذیب وروایات کے سارے رنگوں کو اپنے اندر جذب کرنے اور برتنے میں گزاری اور جب ہوش آیا تو

ایں قدر ہست کہ بانگ جرسِ می آید

کا معاملہ تھا۔ تعلقہ داری کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ مغربی اضلاع کا حال معلوم نہیں مگر اودھ کے بیشتر زمیندار اور تعلقہ دار ان اپنی آن بان قائم رکھنے کے لیے قطعات اراضی اور باغات فروخت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اسی سیلاب افلاس و تنگدستی کا شکار پروفیسر کرمانی بھی ہوئے، جس کی طرف مرحوم نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

اب گھر کہاں کہ وہ در و دیوار بھی نہیں
اس سرزمیں کے اب کوئی آثار بھی نہیں

بہرکیف ان در و دیوار پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کرمانی صاحب نے علی گڑھ کے لیے رخت سفر باندھا اور 'ارض کنعاں' میں اترے (مرحوم نے علی گڑھ یونیورسٹی کو عرض کنعاں کہا ہے) علی گڑھ میں اپنے بیٹے شاہ رخ کرمانی کے ساتھ دوبارہ پڑھائی کا آغاز کیا۔ باپ ایم اے میں اور بیٹا PUC میں۔ ایم اے انگریزی اور ایم اے فارسی کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں معلّمی کرتے ہوئے صدر شعبۂ کی حیثیت سے سبکدوش

ہوئے۔ اپنے وطن دیوا شریف کو پھر مسکن بنایا، کرمان نہ جا سکے دیوا شریف میں 'خانۂ ایران' بنا ڈالا۔ جشن نوروز تو مناتے نہیں تھے لیکن روز روز کے جشن سے خانۂ ایران پر رونق رہا کرتا تھا۔

کرمانی صاحب کی نوجوانی میں ترقی پسند تحریک جوانی میں جدیدیت اور بڑھاپے میں مابعد جدیدیت کے افکار و نظریات ادب میں داخل ہوئے۔ کچھ کو انھوں نے برتا اور کچھ کو ریجکٹ کیا لیکن ادب سے وابستگی تا مرگ باقی رہی۔

ہند ایرانی تہذیب کے پروردہ پروفیسر کرمانی سہ لسان تھے۔ اردو ان کی مادری زبان۔ فارسی ذوقی زبان اور انگریزی علمی زبان تھی۔ ان تینوں زبانوں میں ان کی تصانیف اہلِ ذوق و ادب کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ شرافت نفس، نفاست طبع اور اپنے لہجے کی شگفتگی اور شیرینی کے باعث وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد و ممتاز تھے۔ ان کو قدرت نے شاعر کا دل اور نقاد کا دماغ عطا کیا تھا۔ ان کا بچپن اور لڑکپن اودھ کے قصبات میں گزرا تھا، جہاں سعدی، حافظ، خسرو، میر و غالب، مثنوی 'سحر البیان' اور 'زہرِ عشق' کے اشعار 'نمکِ خان تکلم' تھے۔ ضلع جگت اور پھبکتی کا فن جانِ محفل ہوا کرتا تھا۔ ایسے معاشرے کے تربیت یافتہ وارث کرمانی کی شاعری اور نثری کاوشیں ہماری کلاسیکی روایت کی امین اور عہد حاضر کی عکاس ہیں۔ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں قرۃ العین حیدر کی کزن عذرا حیدر کی ہجو کہی تھی۔ اس کے یہ شعر دیکھیے:

آپا عذرا جو کام میں ہیں دخیل
ہوگیا ہے یہ کاروبار ذلیل

گھر میں طوفانِ بے تمیزی ہے
جیسے طغیانیوں میں رودِ نیل

خس و خاشاک زیب فرش ہوا
کیونکہ جاروب کش کو دی تعطیل

اسی ردیف و قافیہ میں نصف صدی کے بعد عینی آپا کی ہجو لکھ مارا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

قرۃ العین ہیں ادب میں دخیل
جیسے ملکِ عرب میں اسرائیل

شہر دہلی میں حشر برپا ہے
متفکر ہیں سب فہیم و عقیل

اک قیامت ہے آگ کا دریا
نذرِ آتش ہوئی ہے فکر جمیل

آپ کی فکر سے لرزتی ہے
روحِ سعدی و ھومر و ورجیل

آپ کے صفحوں میں ہے پوشیدہ
دعوتِ خورد و نوشِ عزرائیل

وارث کرمانی کی Ph.D کا مقالہ تو غالب کی فارسی شاعری کی تفہیم و تحسین کے نکات پر مبنی ہے لیکن اردو شاعری کے دیگر شعرا مثلاً سعدی، خسرو، حافظ، میر، داغ، جذبی، مجروح، مجاز پر ان کے مضامین دل و دماغ کے لیے سامان انبساط و وسیلۂ خبر ہیں۔

ہند ایرانی تہذیب کے پروردہ پروفیسر کرمانی سہ لسان تھے۔ اردو ان کی مادری زبان۔ فارسی ذوقی زبان اور انگریزی علمی زبان تھی۔ ان تینوں زبانوں میں ان کی تصانیف اہلِ ذوق و ادب کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ شرافت نفس، نفاست طبع اور اپنے لہجے کی شگفتگی اور شیرینی کے باعث وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد و ممتاز تھے۔ ان کو قدرت نے شاعر کا دل اور نقاد کا دماغ عطا کیا تھا۔ ان کا بچپن اور لڑکپن اودھ کے قصبات میں گزرا تھا، جہاں سعدی، حافظ، خسرو، میر و غالب، مثنوی 'سحرالبیان' اور 'زہرِ عشق' کے اشعار 'نمکِ خان تکلم' تھے۔ ضلع جگت اور پھبکتی کا فن جانِ محفل ہوا کرتا تھا۔ ایسے معاشرے کے تربیت یافتہ وارث کرمانی کی شاعری اور نثری کاوشیں ہماری کلاسیکی روایت کی امین اور عہدحاضر کی عکاس ہیں۔

ان کی مشہور کتاب 'Dreams Forgotten' فارسی شعرا بلکہ سبک ہندی کے معروف شاعروں کا بہترین انتخاب ہے۔ اس انتخاب کی خوبی یہ ہے کہ شعرا کا مختصر تعارف بمع سنین کے دیا گیا ہے پھر غزلوں قصائد اور قطعات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ فارسی شعرا کے اشعار تذکروں اور تواریخ کی کتب میں دستیاب ہے لیکن مرزا مظہرِ جانِ جاناں کے 'خریطۂ جواہر' کے بعد اس طرز کا پہلا کام ہے۔ 'خریطۂ جواہر' خریطۂ جواہر ہے۔ قدر و قیمت کے لحاظ سے 'Dreams Forgotten' لعلِ گراں بہا کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی قدر شناسی کے طور پر مملکتِ ایران نے اِسے فارسی رسم الخط میں شائع بھی کروادیا ہے۔

تین شعری مجموعے 'نارسیدہ' دردل کشا اور تیسرے کا نام اس وقت ذہن سے محو ہوگیا ہے، ان کے ذوقِ خامہ فرسا کی یادگار ہیں۔ ان مجموعوں میں فارسی اور اردو کی کلاسیکی روایت، ہند اسلامی تہذیب کے نقوش مرتسم ہیں۔ ان کے اشعار میں جذب و مستی کے ساتھ شوخی و بے باکی کا امتزاج ہندوستانی مزاج کا غماز ہے۔ ان کی آخری کتاب 'گھومتی ندی' ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے، جو اپنے اسلوب، شگفتگی، مفاہیم شفافیت اور سچائی کے باوصف خودنوشت نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس اودھی تہذیب کے مرحوم دلدادہ و شیدا تھے اس کا بہترین مرقع ہے۔

زبان کی چاشنی محاورہ کی چستی اور روزمرہ کی برجستگی نے اس خودنوشت کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اسی ہفتہ مجھے ایک رفیق کار نے بتایا کہ ان کی خودنوشت پر ڈی ڈی اردو سیریل بنا رہا ہے۔

جشن برپا کرنا اور محفلیں سجانا بھی کرمانی صاحب کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ چنانچہ اکثر وہ میرے گھر آتے تو چند احباب کے ساتھ مزے دار گفتگو اور شعرخوانی کی مجلس ضرور بپا ہوجاتی۔ تین چار برس ہوئے کہ امریکہ سے چودھری نعیم صاحب دہلی آئے ہوئے تھے اور میرے گھر پر وارث کرمانی صاحب اور میرے خسر خورشید انور رضوی صاحب بھی موجود تھے تینوں صاحب ہمعصر اور ہم وطن تھے۔ پھر میں نے پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی اور جناب مسعود حق صاحب کو بھی مدعو کرلیا۔ دیر تک یہ بزرگ ایام گزشتہ کی محفلیں یاد کیا کیے۔ تہذیب گم گشتہ کے سرے تلاش کیے جاتے رہے۔ حال میں واپس آئے تو کرمانی صاحب سے کلام کی فرمائش ہوئی۔ کرمانی صاحب نے جو غزل سنائی اس کے قوافی جواب، حساب، خطاب وغیرہ تھے اور ردیف تھی 'اس نے دیا' مجھے ایک شعر یاد رہ گیا:

متاعِ کون و مکاں چھین کر زہے قسمت
گدائے خاک نشیں کا خطاب اس نے دیا

یہ گدا کے خاک نشیں اب علی گڑھ کے قبرستان منٹوای میں پیوند خاک ہے جہاں نہ کوئی دانشوری کی روایت ہے نہ فلسفہ — بس اللہ ہی اللہ ہے۔

■

Wahajuddin Alvi, Deptt of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

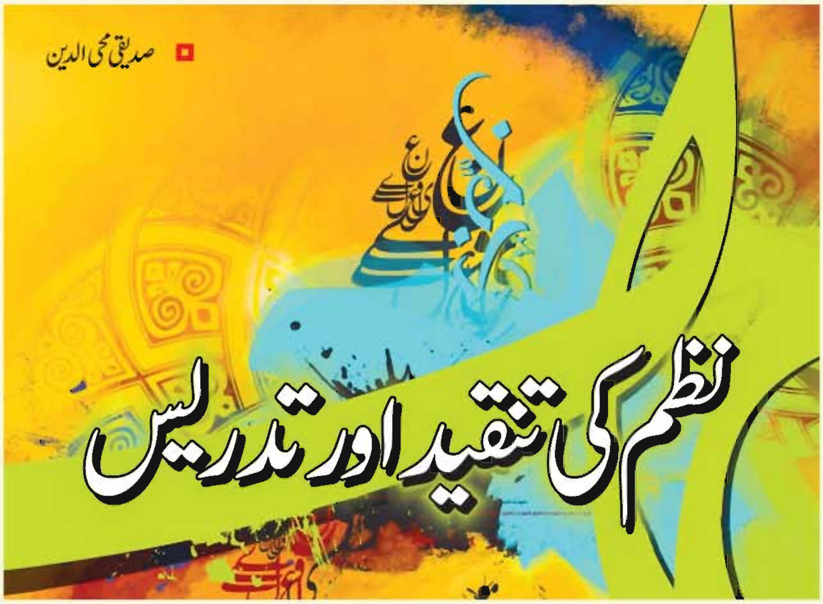

نظم کی تنقید اور تدریس

صدیقی محی الدین

نظم شاعری کی ایک ہمہ گیر اصطلاح ہے۔ ایک لحاظ سے یہ اصطلاح شاعری کی تمام اصناف کو محیط ہے۔ اگر چہ کچھ اصناف موضوع اور ہیئت کی بنا پر علیحدہ شناخت رکھتی ہیں، لیکن اپنے وسیع مفہوم میں یہ سب نظم کی ہی صورتیں ہیں۔ قصیدہ اور مرثیہ اگر چہ مخصوص موضوعات کے لیے مختص ہیں، جب کہ غزل اور مثنوی موضوعی لحاظ سے بے پایاں امکانات کی حامل اصناف ہیں۔ غزل یوں تو قصیدے کی ہی ہیئت سے برآمد ہوئی ہے، لیکن اس نے قصیدے کی موضوعی تخصیص سے انحراف کیا اور لامحدود موضوعی امکانات کی ترجمان بن گئی، ایک لحاظ سے یہ چاروں اصناف نظم کے ہی مختلف اظہارات ہیں۔

ادبیات میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ کچھ مقبول اور بڑی شعری اصناف روایتی طور پر قائم رہتی ہیں، یا پھر کچھ اصناف اذکار رفتہ ہوجاتی ہیں، جس کی مثال صنف قصیدہ سے دی جاسکتی ہے، مثنوی اگر چہ بطور صنف قائم ہے لیکن اس کی نوعیت و ماہیت یکسر بدل گئی ہے، کبھی کوئی صنف معاصر ادبی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت وجود میں آتی ہے، اردو شاعری میں نظم ایک ایسی مخصوص صنف ہے، اگر چہ یہ صنف اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی قلی قطب شاہ کے کلام میں پائی جاتی ہے، لیکن اس وقت یہ مستقل اور عام رجحان نہیں تھا، بعد میں ولی اور سراج کے کلام میں یہ پائی جاتی ہے۔ سراج نے مختلف عنوانات کے تحت مثنوی کی صورت میں مختصر نظمیں لکھی ہیں۔ بعد ازاں میر اور ان کے کچھ معاصرین نے مختصر مثنویوں کی صورت میں اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں نظیر اکبرآبادی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے مستقل طور پر نظم نگاری کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، معاصر زندگی اور اس کے مختلف سماجی، معاشرتی، تہذیبی، مذہبی، اخلاقی اور روزمرہ زندگی کے مظاہرات پر نظیر نے بھرپور انداز میں نظمیں لکھی ہیں، اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو انھوں نے نظم کا موضوع بنایا، سماج کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طبقے اور ہر موضوع پر نظمیں کہی ہیں، لیکن اس وقت نظیر کی یہ کاوشات عام ادبی رجحان نہیں بن سکیں۔ اس وقت کے ادبی منظرنامے میں نظیر ایک جزیرے کی طرح دکھائی دیتے ہیں لیکن نظیر کی یہ کاوشات اردو نظم کی تاریخ کا بے حد قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ نظمیں ہماری زندگی میں آج بھی اسی اہمیت و افادیت کی حامل ہیں۔ نظیر کی شاعری سے متعلق ڈاکٹر میاں صادق لکھتے ہیں:

''نظیر اردو کے غالباً بہترین بیانیہ شاعر ہیں اور اپنے دور کے تہذیبی مشاغل کے متنوع نقشے جو انھوں نے کھینچے ہیں، اس سے لاکھوں انسانوں کی دلچسپی کی ایک جامع تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے، ظاہر ہے اپنی قوت بیانیہ کو زوردار اور موثر بنانے کے لیے انھیں محسوسات پر انحصار کرنا پڑا۔ چنانچہ محسوسات کو ان کی شاعری کا اہم جزو تسلیم کرنا چاہیے۔ خصوصاً ان تفصیلات کو جو بصارت اور سماعت سے تعلق رکھتی ہیں۔''

نظیر کے فوری بعد کوئی بڑا نظم گو شاعر ایسا نہیں ہے جس نے صرف نظم کو مرکزی وسیلۂ اظہار بنایا ہو، اردو شاعری اپنی روایتی اصناف کے تحت ارتقا پاتی رہی ہے۔ یہیں سے ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ سیاسی طور پر مغلیہ حکومت کا زوال اور برطانوی سامراج کا اقتدار ایک عظیم انقلاب کا نقیب ثابت ہوا۔ یہیں سے سوچ اور فکر کے دھارے بدل گئے۔ انگریزی زبان و ادب اور جدید علوم عام ہونے لگے۔ یہیں سے اردو شاعری کے فکری رویے بھی بدلنے لگے۔ سرسید احمد خاں کی تحریک نے تعلیمی میدان میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ 1874 میں محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی ایما سے انجمن پنجاب کے مشاعروں کے تحت جدید نظم نگاری کی تحریک شروع کی، جس میں مولانا حالی بھی فوری اس تحریک کے سرگرم رکن بن گئے۔ آزاد اور حالی نے نظم نگاری کے ایک نئے رجحان کو عام کیا، غزل گوئی سے شعوری طور پر انحراف کیا گیا۔ بطور خاص انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں 'نظم اور کلام موزوں کے بارے میں خیالات' کے عنوان سے اپنا ایک مضمون بھی پیش کر چکے تھے۔ آزاد اور حالی کی اس تحریک کے تحت نظم گوئی کا ایک رجحان چل پڑا۔ دراصل اردو شاعری کی تاریخ میں یہی وہ موڑ ہے جہاں پر نظم کو ایک مخصوص صنف کی حیثیت سے شناخت حاصل ہوئی۔

نظیر کے فوری بعد کوئی بڑا نظم گو شاعر ایسا نہیں ہے جس نے صرف نظم کو مرکزی وسیلۂ اظہار بنایا ہو، اردو شاعری اپنی روایتی اصناف کے تحت ارتقا پاتی رہی ہے۔ یہیں سے ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ سیاسی طور پر مغلیہ حکومت کا زوال اور برطانوی سامراج کا اقتدار ایک عظیم انقلاب کا نقیب ثابت ہوا۔ یہیں سے سوچ اور فکر کے دھارے بدل گئے۔ انگریزی زبان و ادب اور جدید علوم عام ہونے لگے۔ یہیں سے اردو شاعری کے فکری رویے بھی بدلنے لگے۔ سرسید احمد خاں کی تحریک نے تعلیمی میدان میں ایک انقلاب پیدا کیا۔

غزل کی شعریات کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اس کے اشعار معنوی لحاظ سے مربوط نہیں ہوتے، بلکہ ہر شعر مختلف اور کبھی کبھی متضاد معنوی جہاں کا عکاس ہوتا ہے۔ غزل کی یہی مخصوص صفت اسے دیگر شعری اصناف سے ممیّز کرتی ہے۔ اس کے برخلاف نظم کی شعریات کا تقاضا یہ ہے کہ ابتدائی شعر سے انتہائی شعر تک نظم ایک متحدہ معنوی جہت کی ترسیل کرے۔ اس میں کسی ایک موضوع کے مختلف ابعاد تسلسل اور ارتقائی مراحل کے ساتھ کسی نتیجہ خیز صورت حال کو واضح کرتے ہیں۔ پوری نظم معنوی اتحاد کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی تخلیقی ارتکاز حاصل کرتی ہے۔

یہ شاعر کے تخلیقی عمل پر مبنی ہے کہ وہ کس موضوع کو کتنے اختصار اور جامعیت کے ساتھ کسی نتیجہ خیز امر تک اس کے تخلیقی ارتفاع تک پہنچاتا ہے یا پھر وسعت وکشادگی کے ساتھ اس کا تخلیقی سفر ماضی کی گرہ کشائی کرے یا مستقبل کے امکانات کو پیش کرے۔ اقبال کی خضر راہ اور دیگر طویل نظموں میں بھی یہ دونوں کیفیات تخلیقی تعمیر وتشکیل کے ساتھ فن کا شاہکار بن گئی ہیں۔ نظم 'شمع وشاعر' میں مسلمانوں کے تابناک ماضی کی بازگوئی کے بعد حال تک بدحالی کے ذکر اور بندۂ مومن کو اس کا صحیح مقام ومنصب یاددلاتے ہوئے کہتے ہیں:

بے خبر تو جو ہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اسی نظم کا آخری بند مستقبل کی صورت گری اور اُن کے رجائی پیغام کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ خوش کن اور حوصلہ افزا کیفیت ان کی دیگر نظموں میں بھی کارفرما ہے، جو یاس وحرماں نصیبی سے نکل کر حرکت وعمل اور تسخیر فطرت کے اعلیٰ مقاصد کی جانب گامزن کرتا ہے، مستقبل کی یہ تصویر کشی دیکھیے:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہوجائے گی

اور اس بند کے یہ آخری دواشعار اقبال کی تخلیقی فکر کا شاہکار بن گئے ہیں:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

بہرحال طویل نظم بڑے اور کثیرالجہات موضوع کے شعری اظہار کے لیے بہترین صنف سخن ہے۔ اس میں مثنوی کی طرح وسعت اور کشادگی ہوتی ہے۔ اُردو میں طویل نظموں کا قابل لحاظ سرمایہ موجود ہے۔ ن م راشد کی طویل نظمیں 'دل مرے صحرا نورد پیر دل' اور 'حسن کوزہ گر' اور 'صلصلۃ الجرس' اردو کی شاہکار شعری تخلیقات ہیں۔ یہ نظمیں ایسے ہی مثالاً عرض کی گئی ہیں جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، اردو میں طویل نظموں کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ مختصر نظم بھی اپنے تاثر کی شدت اور اثر انگیزی کے لحاظ سے مقبول اور بے حد اہم شعری تخلیق ہے۔

آزاد اور حالی کی نظم گوئی کی تحریک کے بعد بیسویں صدی میں اقبال، چکبست سرور جہاں آبادی، جوش ملیح آبادی، اکبرالہ آبادی، اختر شیرانی کے علاوہ بے شمار شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس صنف کو ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا نے متنوع موضوعات اور اسالیب کے ذریعے اظہار و بیان کے لامحدود امکانات سے روشناس کروایا، دراصل اس دور میں نظم گوئی کا یہ سرمایہ باعثِ صدافتخار ہے۔

نظم ایک شفاف اور سیال صنف شاعری ہے، یہ ہر شعری ہیئت میں لکھی جاسکتی ہے، ہماری تنقید میں پابند نظم کی اصطلاح مخصوص ہیئت بحر اور ردیف وقافیے کی پابندی سے عبارت ہے۔ اردو نظم کے قاری پر یہ بات عیاں ہے کہ پابند نظم کے تحت بھی نظم ہمہ گیر اور بیکراں وسعت کی حامل ہے۔ نظم کی ہیئت میں تبدیلی کے لحاظ سے اقبال کی کاوشات بہت اہم ہیں، اگرچہ انھوں نے پابند نظم کی ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے نظم کے موضوع اور خیال کی وسعت کے لحاظ سے نظموں کو مختلف بندوں میں تقسیم کیا، اس طرح موضوع اور بحر کا تسلسل بھی برقرار رہا، ان کی

اردو شاعری میں نظم نے ایک مخصوص صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرلی ھے۔ آزاد اور حالی کی کاوشات کے بعد بیسویں صدی میں اقبال اور ان کے معاصرین نے اس صنف کو مختلف النوع شعری اظہارات سے آشنا کروایا، جیسا که ابھی عرض کیا گیا ھے۔ جدیدیت کے تحت بھی اس صنف نے اردو شاعری میں اپنی انفرادیت اور استحکام ثابت کیا، اور شاعری کی مقبول صنف، بن گئی۔

طویل نظموں میں ہر بند کے آخر میں جداگانہ ردیف و قافیے کا ایک شعر لکھ کر اپنی بات مکمل کی ہے، اس سے نظم میں اثر انگیز آہنگ بھی پیدا ہوا ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اقبال کی نظم غزل کی شعریات سے آزاد نہیں ہوسکی۔

نظم کی ہیئت میں تجربات کے لیے اگرچہ عبدالحلیم شرر اور عظمت اللہ خاں کے نام لیے جاتے ہیں لیکن ان کی کاوشات محض تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ یوں بھی ان لوگوں نے شاعری میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا، دراصل بیسویں صدی میں مغربی علوم وفنون اور شعروادب کی ترویج سے بھی مشرقی شعریات میں تجربے اور تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بطورِ خاص انگریزی شاعری کے اثرات کے نتیجے میں بھی نظم میں ہیئتی تجربات کیے جانے لگے، انگریزی شاعری کے تراجم کے ذریعے بھی اردو نظم کی ہیئت اور اسالیب میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اب اردو میں نظم چونکہ اظہار کا موثر اور مقبول ذریعہ بن چکی تھی، لہٰذا نظم نے ان ہیئتی تجربات کو بھی بالکل فطری انداز میں قبول کیا، اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم کی ہیئتیں بے حد مقبول ہوئیں۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا نے نظم کی مذکورہ ہیئتوں میں ایک جہان معنیٰ کی سیر کی، ترقی پسند تحریک سے زیادہ حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے اس خصوص میں متنوع اسالیب اور طرزِ اظہار اختراع کیے، بطور خاص میراجی اور ن م راشد نے آزاد نظم کو تخلیقی اعتبار اور استحکام عطا کیا، اب آزاد نظم ایک مقبول اور کامیاب ترین صنف کے طور پر اپنی شناخت قائم کرچکی تھی۔ لہٰذا 1960 کے بعد جدیدیت کے ادبی رجحان کے حوالے سے بھی آزاد نظم مستند اور دلچسپ شعری ہیئت کے طور پر پسند کی گئی۔ لہٰذا عمیق حنفی، شہریار، قاضی سلیم، بلراج کومل، مجید امجد، شفیق فاطمہ شعریٰ، وحید اختر، عادل منصوری اور کمار پاشی کے علاوہ متعدد شعرا آزاد نظم کے تابندہ اسمائے گرامی ہیں۔

اردو شاعری میں نظم نے ایک مخصوص صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔ آزاد اور حالی کی کاوشات کے بعد بیسویں صدی میں اقبال اور ان کے معاصرین نے اس صنف کو مختلف النوع شعری اظہارات سے آشنا کروایا، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے۔ جدیدیت کے تحت بھی اس صنف نے اردو شاعری میں اپنی انفرادیت اور استحکام ثابت کیا، اور شاعری کی مقبول صنف بن گئی۔

ادب کی دیگر اصناف کی طرح نظم کی تدریس کے بھی اپنے طریق کار ہیں، اگر ہم بی اے یا ایم اے کے طلبا و طالبات کو نظم پڑھا رہے ہیں تو ابتدا میں شاعر کا تفصیلی تعارف وسوانح، صنف نظم کی نوعیت و ماہیت اور شاعری میں اس کے ارتقائی مراحل پر بھی اظہار کریں۔ جس شاعر کی نظم زیر تدریس ہے اس کے شعری رویوں اور عصری شعری رجحانات بھی واضح کریں، نظم کی قرأت طلبا سے بھی کروائیں۔ نظم کے مختلف اشعار کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے مرکزی موضوع پر بھی اظہار خیال کریں، آخر میں نظم کا لسانی اور اسلوبی لحاظ سے بھی تجزیہ کریں۔

■

Dr. Saddiq Mohiuddin, Assot. Prof. Dept of Urdu, Dr. Baba Saheb Ambedkar, Marathwada University, Auranagabad - 431001 (MS)

محمد اسد اللہ

پنچ سالہ منصوبے اور بنیادی تعلیم

15 اگست 1947 کو ہمارا ملک آزاد ہوا اور 26 جنوری 1950 کو ہمارے ملک کا آئین نافذ ہوا۔ بنیادی تعلیم کے متعلق اس آئین کے آرٹیکل 45 میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ ''صوبہ اس آئین کے نافذ ہونے کے دن سے لے کر دس سال کے اندر 14 سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرے گا۔'' تبھی سے ہمارے ملک میں بنیادی تعلیم کو مفت اور لازمی بنانے کی جانب سخت قدم اٹھائے گئے۔ یہ دیگر بات ہے کہ دس سال کیا ہم 65 سال کے بعد بھی آج تک اس ہدف کو حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ اس ہدف کو حاصل کرنے میں کئی مشکلیں درپیش رہی ہیں جس میں سماجی، اقتصادی پسماندگی، بڑھتی ہوئی آبادی ہماری ذمے داریاں اور ایمانداری اہم ہے۔

1951 سے ہمارے ملک میں ترقی یافتہ کاموں کے لیے منصوبہ بند طریقے اپنائے گئے۔ پہلا پانچ سالہ منصوبہ 1951-56 شروع ہوا اس منصوبے میں تعلیم پر 153 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جس میں سے 85 کروڑ روپے صرف بنیادی تعلیم کی ترقی کے لیے خرچ ہوئے۔ دوسرا پانچ سالہ منصوبہ 1956-61 میں تعلیم پر 273 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جن میں سے 95 کروڑ روپے بنیادی تعلیم پر خرچ ہوئے۔ اس منصوبے کے دوران 1957 میں مرکز (Center) میں (All Indian Council for Elementry Education) اے آئی سی ای ای کی بنیاد رکھی گئی اور اسے بنیادی تعلیم کو ترقی کے لیے مشورہ دینے کا کام سپرد کیا گیا۔ اس کونسل نے بنیادی تعلیم کی ترقی کے لیے نشاۃ ثانیہ کا کام کیا جس کے نتیجے میں بنیادی تعلیم کی ترقی میں تیزی آئی۔

تیسرے پانچ سالہ منصوبے 1961-66 میں تعلیم پر 589 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جس میں سے 201 کروڑ روپے بنیادی تعلیم پر خرچ ہوئے۔ اس پانچ سالہ منصوبے کے دوران بنیادی اور تحتانوی (Uper Primary) دونوں طرح کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا۔ اسی درمیان کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ پیش ہوئی اس کمیشن نے تعلیم حاصل کرنے کے برابری کے مواقع پر خاص توجہ دی اور حکومت کی توجہ پسماندہ طبقے St, Sc اقلیت اور قبیلوں کے بچوں کی تعلیم کی طرف مبذول کرائی ساتھ ہی بنیادی سطح پر Dropout ہونے والے بچوں کو روکنے کے مشورے بھی دیے اسی بنیاد پر تعلیمی پالیسی 1968 کا قیام عمل میں آیا۔

چوتھے پانچ سالہ منصوبے 1969-74 میں تعلیم پر 786 کروڑ روپے خرچ ہوئے جن میں سے 239 کروڑ روپے بنیادی تعلیم کی ترقی کے لیے خرچ کیے گئے اس پانچ سالہ منصوبہ کے دوران Basic School کا قیام عمل میں آیا جس کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

پانچویں پانچ سالے منصوبہ 1974-79 میں تعلیم پر کل 912 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جن میں سے 317 کروڑ روپے بنیادی تعلیم کی ترقی کے لیے خرچ ہوئے اس پانچ سالہ منصوبہ کے دوران بنیادی اسکول کے طلبا اور طالبات کے لیے مفت (mid-day meal) مڈ ڈے میل کا انتظام کیا گیا اور پسماندہ طبقے کے طالب علموں کے لیے آشرم اسکول (Ashram School) کھولے گئے۔ کچھ علاقوں میں لڑکیوں کو مفت پوشاک (Uniform) بھی بانٹے گئے۔ اس سے لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے داخلے میں اضافہ ہوا۔ اس منصوبہ کے آخری سال 1979 میں 6 سے 14 سال تک کی عمر کے ایسے بچوں کے لیے جو کسی وجہ سے رسمی تعلیم (Formal Education) کا فائدہ نہیں حاصل کر پا رہے تھے ان کے لیے غیر رسمی (Non Formal Education) کی شروعات کی گئی۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے 1980-85 میں تعلیم پر کل 2530 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جن میں 836 کروڑ روپے بنیادی تعلیم پر خرچ ہوئے۔ اس پانچ سالہ منصوبہ کے دوران بنیادی اور تحتانوی اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا ساتھ ہی غیر رسمی تعلیم کی ترقی کا کام بھی کیا گیا۔ اس سے بنیادی تعلیم کے شعبے میں تسلی بخش ترقی ہوئی لیکن ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لحاظ سے یہ کافی نہیں تھی۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبہ 1985-90 میں تعلیم پر کل 7633 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جن میں سے 2849 کروڑ روپے بنیادی تعلیم کی ترقی پر خرچ ہوئے۔ اسی درمیان 1986 میں National Education Policy کا قیام عمل میں آیا اس قومی تعلیمی منصوبے میں بنیادی تعلیم کو ہمہ گیر بنانے کے ہدف کو منظور کیا گیا اور اس کی ترقی اور بہتری دونوں پر خاص توجہ کے ساتھ ہی اس منصوبے کے تحت بنیادی تعلیم کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے 1987-88 میں (Opration Black Board) آپریشن بلیک بورڈ شروع کیا گیا اس کے تحت بنیادی اسکولوں کے لیے عمارتیں بنوائی شروع کی گئیں اساتذہ کی تقرری کی گئی اور اسکول کے لیے دیگر ضروری اشیا کا انتظام کیا گیا۔

آٹھویں پانچ سالہ منصوبے 1992-97 میں تعلیم

ہرکل 19600 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جن میں سے 9201 کروڑ روپے بنیادی تعلیم پر خرچ کیے گئے اس منصوبہ کے دوران 1992 میں سویڈن (Sweden) کے ایک ادارہ اور مرکزی حکومت کی مشترکہ کوششوں سے راجستھان میں لوک جنبش (Lok Junbish) پروگرام شروع کیا گیا اس میں عام لوگوں کی حصے داری پر خاص توجہ دی گئی حال میں اسے بھی Sarva Shiksha Abhiyan سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کوششیں بنیادی تعلیمی ترقی میں بہت مدگار ثابت ہورہی ہیں۔ دسمبر 1993 میں دنیا کے نوکثیر آبادی والے ملک چین، ہندوستان، پاکستان، بنگلا دیش، برازیل، میکسیکو، نائیجریا، انڈونیشیا اور مصر کی پہلی (Summit) اعلیٰ سربراہوں کی کانفرنس ہوئی جس میں بیسویں صدی کے آخر تک سبھی کو بنیادی تعلیم مہیا کرانے کا عہد لیا گیا اور اس کے راستے میں آنے والی تمام مشکلوں کو دور کرتے ہوئے بنا کسی تعصب کے سبھی بچوں کو بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی کوششوں میں تیزی لانے پر توجہ دی گئی۔ یوں تو ہمارے ملک میں پہلے سے بھی بنیادی تعلیم کو عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن اس قدم کے بعد اس میں اور تیزی آ گئی۔ 1994 میں تعلیمی سطح پر پسماندہ ضلعوں میں Distric Primary Education Program کا آغاز کیا گیا۔ یہ تعلیمی اعتبار سے پچھڑے ضلعوں میں بنیادی تعلیم کی ترقی میں کافی مددگار ثابت ہوا۔ 15 اگست 1995 کو Mid-day Meal Scheme کی شروعات کی گئی اس کا بنیادی مقصد بچوں کا زیادہ سے زیادہ داخلہ کرانا اور انھیں اسکول میں روکے رکھنا ہے۔ اس منصوبہ کے دوران 23 ہزار بنیادی اور 29 ہزار تحتانوی اسکول کھولے گئے۔ ساتھ ہی Black Bord Scheme منصوبے کے تحت 5 لاکھ 30 ہزار بنیادی اسکولوں کو (Teaching Learning TLM) میٹریل مہیا کرائے گئے۔ ایک لاکھ 47 ہزار اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری کی گئی اور ایک لاکھ (74) ہزار کمرے بنوائے گئے۔ اتنا ہی نہیں 47000 تحتانوی اسکولوں کو بھی TLM مہیا کرانے کے لیے 40,40 ہزار روپے دیے گئے اور اس سطح پر 33600 تحتانوی اساتذہ کا تقرر کیا گیا۔

نویں پانچ سالہ منصوبہ 1997-2002 میں تعلیم کے لیے 20381.6 کروڑ روپے خرچ کیے گئے جن میں سے 1636.5 کروڑ روپے بنیادی تعلیم پر خرچ کیے گئے اس منصوبے کے دوران بنیادی تعلیم کی ترقی اور بہتری کے لیے پہلے سے چلائے جارہے سبھی پروگرام تو چلتے ہی رہے ساتھ ہی نومبر 2000 کو Sarva Shiksha Abhiyan کو منظوری دی گئی اور جنوری 2001 میں اسے شروع کردیا گیا اس کا مقصد 2003 تک بنیادی تعلیم کو سہل بنانا 2007 تک سبھی بچوں کو پانچ سال کی بنیادی تعلیم کو مکمل کرانا اور 2010 تک سبھی بچوں کو آٹھ سال کی بنیادی تعلیم مکمل کرانا طے کیا گیا۔ یکم اپریل 2001 کو غیررسمی تعلیم کو Education Guaranty Scheme کی شکل میں بدل دیا گیا۔ (Education Guarnty Scheme) خاص طور پر تعلیم سے محروم سماج کے ان بچوں کے لیے بنائی گئی ہے جو مزدوری کرتے ہیں یا سڑکوں پر اپنی زندگی گزارتے ہیں یا فطری مشکل حالات میں اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اس کا انتظام ایسے مخصوص علاقوں میں کیا جارہا ہے جہاں ایک کلومیٹر کے اندر کوئی بھی رسمی بنیادی اسکول نہیں ہے اور 6 سے 14 سال تک کی عمر کے اسکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد 15 سے 20 ہیں جب کہ مشکل ترین پہاڑی اور جنگلی علاقوں میں 10 بچوں پر بھی اس اسکیم کے تحت اسکول کھول دیے جاتے ہیں۔ اس منصوبے کے تحت تقریباً 80 ہزار بنیادی اور تحتانوی اسکول کھولے گئے۔ نتیجتاً 2001 میں بنیادی اور تحتانوی اسکولوں کی تعداد 8 لاکھ 45 ہزار ہوگئی اور طالب علموں کی تعداد بڑھ کر 15 لاکھ 44 ہزار ہوگئی۔

حال میں گیارھواں پانچ سالہ منصوبہ 2007-2012 چل رہا ھے۔ سرکاری جانکاری کے مطابق اس منصوبے کا خاص مقصد بنیادی تعلیم کو ھمہ گیر بنانے کے ھدف کو حاصل کرنا ھے۔ اس ھدف کو حاصل کرنے کے لیے SSA چلتا رھے گا اور ان جگھوں پر بنیادی اسکول قائم کیے جائیں گے جھاں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر کوئی بنیادی اسکول نھیں ھے۔ ساتھ ھی ایسی جگہ جھاں تین کلومیٹر کے فاصلے پر تحتانوی اسکول نھیں ھے وھاں تحتانوی اسکول بھی کھولے جائیں گے۔

دسویں پانچ سالہ منصوبہ 2002-2007 میں تعلیم کے لیے (42850) کروڑ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جن میں سے (28750) کروڑ روپے بنیادی تعلیم کی ترقی اور بہتری کے لیے خرچ کیے گئے اس منصوبے کا خاص مقصد بنیادی تعلیم کو ہمہ گیر بنانا تھا جس کے تحت 6 سے 11 سال تک کے بچوں کا سوفی صد داخلہ 2003 کے آخر تک اور گیارہ سے 14 سال تک کے سوفی صد بچوں کا داخلہ 2007 تک کرنے کا ہدف متعین کیا گیا اور اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت کے مطابق اسکول قائم کرنا 40 بچوں پر ایک معلم کا تقرر کرنا، بنیادی اسکول کے کمرہ جماعت کی مرمت کرانا اور انھیں سہولت یافتہ بنانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اسی منصوبے کے دوران دسمبر 2002 میں آئین میں 81واں Amendment کر آرٹیکل 21-A جوڑا گیا جس کے تحت 4 سے 14 سال تک کے سبھی بچوں کے مفت اور لازمی تعلیم کو اس کا بنیادی حق قرار دیا گیا اس کے علاوہ 2003 میں Opration Black Board کو SSA کا ضمنی حصہ بنا دیا گیا اس منصوبے کے تحت 2004-2005 تک تقریباً ایک لاکھ نئے بنیادی اسکول اور 70 ہزار تحتانوی اسکول کھولے گئے جس کے نتیجے میں 2004-2005 میں بنیادی اسکولوں کی تعداد تقریباً 10 لاکھ 42 ہزار ہوگئی اور اس میں داخلہ لینے والے طالب علموں کی تعداد بڑھ کر 18 کروڑ دو لاکھ ہوگئی۔

حال میں گیارہویں پانچ سالہ منصوبہ 2007-2012 چل رہا ہے۔ سرکاری جانکاری کے مطابق اس منصوبے کا خاص مقصد بنیادی تعلیم کو ہمہ گیر بنانے کے ہدف کو حاصل کرنا ہے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے SSA چلتا رہے گا اور ان جگہوں پر بنیادی اسکول قائم کیے جائیں گے جہاں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر کوئی بنیادی اسکول نہیں ہے۔ ساتھ ہی ایسی جگہ جہاں تین کلومیٹر کے فاصلے پر تحتانوی اسکول نہیں ہے وہاں تحتانوی اسکول بھی کھولے جائیں گے۔ اتنا ہی نہیں حکومت کے ذریعے چلایا جارہا Opretion Black Board اسکیم بھی چلتا رہے گا جس کے ذریعے بھی بنیادی اور تحتانوی اسکولوں کے Infrustructure کو بہتر اور سہولت یافتہ بنایا جائے گا۔ ضرورت کے مطابق بنیادی اسکولوں میں کمرے بنوائے جائیں گے۔ سبھی اسکولوں میں کتب خانے کا انتظام کیا جائے گا اور کچھ خاص بنیادی اسکولوں میں Computer کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ ساتھ ہی بنیادی اسکولوں میں اساتذہ کی کمیوں کو بھی دور کیا جائے گا۔ بس اب دیکھنا یہ ہے کہ اس منصوبے کے آخر تک طے شدہ ہدف کی حصولیابی کہاں تک ہو پاتی ہے۔

■

Md.Asadullah,Model School Chandanpatti, Laheriasarai, Darbhanga- 846001 (Bihar)

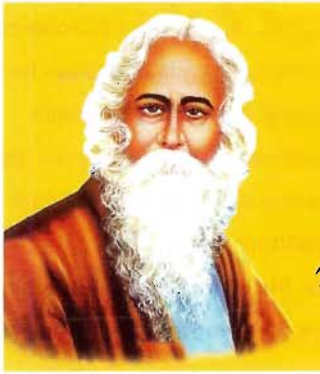

مطالعۂ ٹیگور کا ایک زاویہ

سیدہ جعفر

ٹیگور کے آرٹ نے شاعری، مصوری، فکشن اور موسیقی کے عناصر سے جلا پائی تھی اور ان کا باہمی ربط اور ان کا تجزیہ ٹیگور کی سائیکی اور ان کے جمالیاتی شعور کے مطالعے کا موضوع بن سکتا ہے۔ ٹیگور سنگیت کے دلدادہ تھے۔ ان کے گھر میں والدین مذہبی محفلیں منعقد کرتے تو سرسوتی وندنا میں روحانی راگ الاپے جاتے اور بھگتی گیتوں کو سرتال میں گایا جاتا۔ اس طرح ابتدا ہی سے موسیقی ان کے وجود میں سماگئی تھی انھوں نے آگے چل کر موسیقی کے ہندوستانی مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئی دھنوں کی تخلیق کی۔ ان کی ایجاد کردہ 'رابندر سنگیت' موسیقی کی دنیا میں قابل قدر اضافہ ہے۔ لندن کے قیام میں آئرش موسیقی بھی سیکھی تھی۔ ہندوستانی اور آئرش موسیقی کے میل سے کچھ نئے سرتال بھی نکالے تھے۔ رابندر سنگیت کی ممتاز گلوکارہ سچترا مترا کہتی ہیں کہ رابندر سنگیت کی دھن، سر اور تال کے مناسب امتزاج سے تشکیل پاکر بے مثل ہوگئی ہے۔ شانتی نکیتن، رابندر سنگیت کا ادارہ ہے۔ للت کلا شاستر سے رابندر سنگیت کا ارتباط نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ دھن گوپال مکرجی نے رابندر سنگیت کے گیتوں میں پراکرتی (فطرت) پریم (محبت) اور جمالیات (Aesthetics) کے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ یہ سنگیت دل میں سوز و گداز پیدا کرتی اور محبوب کے قرب کی تمنا کو اکساتی ہے اور یہ احساس دلاتی ہے کہ

جس کا پیا بن ساون بیتے آگ لگے اُس ساون کو

مغربی موسیقی اور نئی سنگیت کی مقبولیت نے رابندر سنگیت کی ہر دل عزیزی میں کمی ضرور پیدا کردی ہے لیکن اہل دل اس کی بڑی پذیرائی کرتے ہیں اور حساس افراد کے لیے اس کا اپنا ایک لطف اور ایک وجدانی کیفیت ہوتی ہے۔ راگ راگنیوں کی تصویریں پیش کرنا، ان کی تجسیم ہی کے تصور پر مبنی نہیں بلکہ ان راگنیوں سے پیدا ہونے والی جذباتی کیفیت کو مہمیز کرنا بھی پیش نظر رہا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے ٹیگور کی تصویر دیکھ کر راگنی کی شبیہ کو یاد کیا تھا۔ موسیقی ٹیگور اور امیرخسرو کے فن میں ایک خاص معنوی اور جذباتی تناظر کے ساتھ رونما ہوئی ہے۔ امیر خسرو نے ترانہ بسیط، راگ صنم، راگ عشاق، راگ زیلیف، راگ مواحق اور راگ انگولہ اختراع کیے تھے۔ ٹیگور اور امیر خسرو و غالب کی طرح 'مے ونغمہ' کو اندوہ ربا نہیں سمجھتے تھے ان کی دانست میں موسیقی محبوب سے قرب کا ایک وسیلہ بن گئی ہے، عیش و عشرت کا ذریعہ نہیں۔ امیر خسرو سماع کی کیفیت کو اس طرح محسوس کرتے ہیں کہ:

رگ رگ سے جس طرح جاں کھینچتے ہیں

غالب نے کہا تھا:

دم کیوں نکلنے لگتا ہے تن سے دم سماع

امیر خسرو اور ٹیگور میں موسیقی کے شغف اور اس کی گہرائی میں ڈوب جانے کے رجحان کے علاوہ اور بھی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں شاعر عشق مجازی کو 'قنطرہ الحقیقت' کا درجہ دیتے تھے۔ امیر خسرو اور ٹیگور عشق کے معرکے کو مجاز کی دین اور اس کی ارتقائی صورت تصور کرتے ہیں۔ ٹیگور نے نلنی کے گھر سے گنگا تٹ تک پہنچتے پہنچتے اور امیر خسرو نے اپنے ٹھکانے سے نظام الدین اولیاء کے حجرے تک رسائی حاصل کرتے ہوئے اہم حقیقتوں کا ادراک کیا تھا اور ان پر یہ رموز منکشف ہوئے تھے کہ:

(1) کائنات رنگارنگ ہے اور اس کی نیرنگی حیرت انگیز ہے لیکن اس کی اصل ایک ہی اور اس کا خالق بے مثال۔

(2) سرآئینہ بھی جمال ہے پس آئینہ بھی جمال ہے

پھولوں کی رنگینی، ندی کی خوبصورتی، درختوں کی شادابی اور انسانی حسن اسی حسن مطلق کی جلوہ گاہ ہیں۔ حسن پوری کائنات پر محیط ہے۔ ٹیگور نے قوت باصرہ اور سامعہ کی مدد سے اپنی پیکر تراشی اور امیجری کو تقویت عطا کی ہے۔ انگ، مناظر اور آہنگ کا احساس ان کی امیجری کا بنیادی وصف ہے۔ ٹیگور صاحب نظر کو حسن کا رمزشناس تصور کرتے ہیں۔ حسن مطلق اور مجازی حسن کی رمزآشنائی کے لیے دیدہ بینا کی اثرآفرینی کے قائل ہیں۔ ٹیگور سمجھتے ہیں کہ مجازی عشق میں محبوب یوں ہی 'راحت جاں' اور 'آفت جاں' نہیں بن جاتا یہ چاہنے والے کی نظر کا فیض ہے۔ ٹیگور کی جمالیاتی حس بہت تیز اور گمبھیر تھی۔ فنکار کی جمالیاتی آگہی کا عکس اس کی شاعری، مصوری اور فکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔ 'اللّٰہ جمیل ویحب الجمال' اور 'احسن التقویم' کی تشریح وتفسیر امیر خسرو کے کلام میں بار بار نمایاں ہوگئی ہے۔ ٹیگور مجازی پیکر کی اہمیت محسوس کرتے ہیں۔ محبوب کے سانسوں کی مہک اور اس کے وجود کی گرمی کو انھوں نے زندہ، موجود اور نامیاتی حقیقت کے طور پر محسوس کیا ہے ان کی نظموں میں اس کی مثالیں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ ٹیگور حسن کو ایک مثبت اور آفاقی حقیقت تصور کرتے ہیں۔ مجاز سے روحانیت کی طرف پرواز کرتے ہوئے امیر خسرو انفس و آفاق کے تناظر میں نفس کی تطہیر اور قلب کی یکسوئی کو عشق کی آخری منزل تسلیم کرتے ہیں جو بقول فریدالدین گنج شکر دائمی سکون کا مخزن ثابت ہوتی ہے۔ ٹیگور نے 'ایکو برھما دوتی ناستی' اور امیر خسرو نے 'لا موجود الا اللّٰہ' کے راستے سے 'ہمہ اوست' کی منزل تک رسائی حاصل تھی اور ٹیگور 'نظریہ ادویت' کی وسعتوں اور اس کی معنویت سے روشناس ہوئے تھے۔ ٹیگور قلب انسانی کو جمال خداوندی کی جلوہ گاہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اُس دن جب کنول کھلا افسوس میرا قلب بھٹکتا پھر رہا تھا اور میں اس سے بے خبر تھا کہ ایک غم میرے اوپر طاری ہوا میں اپنے خواب سے چونک پڑا اور بادِ جنوب میں ایک عجیب وغریب کیفیت کا شیریں سراغ میں نے پایا... مجھے اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ تو اس قدر قریب ہے... مکمل شیرینی میرے ہی عمق قلب میں شگفتہ ہورہی ہے۔''

موسیقی کو ٹیگور نے ایشور بھگتی کا ایک روپ قرار دیا ہے۔ ہندوی فلسفے میں بھگتی، موسیقی اور جمالیات کے عناصر ایک دوسرے میں جذب ہوکر ایک فکری اکائی بن گئے ہیں۔ ٹیگور ایک جگہ کہتے ہیں:

''تیری موسیقی کی روشنی عالم کو منور کررہی ہے۔ تیری موسیقی کا نفس حیات ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک دوڑا پھرتا ہے۔''

ٹیگور کا بیان ہے:

''میرا قلب آرزومند ہے کہ تیرے نغموں کا ہمنوا ہوجائے لیکن ایک آرزو کے لیے بیکار تڑپ رہا ہے میں بولتا ہوں لیکن بول نغمہ نہیں ہے۔''

ٹیگور کا بیان ہے کہ میری والہانہ وابستگی کی وجہ سے رات کی تاریکی اور تنہائی میں وہ رگِ جاں سے قریب

محسوس ہوتا ہے۔ خواجہ میر درد نے صوفیانہ اضطراب کے کسی جانگداز لمحے میں کہا تھا:

کون سی رات آن ملیے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

ٹیگور کہتے ہیں:

''وہ آیا اور میرے پہلو میں بیٹھ گیا لیکن میں نہ جاگی ہائے وہ نیند کیسی کمبخت نیند تھی وہ آیا جب رات خاموش اور ساکن تھی اس کے ہاتھ میں بربط تھا اور اس کے نغموں سے میری نیندیں معمور تھیں۔''

شانتی نکیتن کا ماحول خانقاہی نظام کے ماحول کی یاد دلاتا ہے جہاں اذکار، مراقبہ، مجاہدہ اور تزکیہ نفس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ٹیگور کی تخلیقات میں روحانیت کی پرچھائیں، معنویت، تعمق اور وسعت فکر کی آئینہ دار ہیں۔ امیر خسرو روح کی 'امر الٰہی' تصور کرتے ہیں اور ساری کائنات کو محبوب کے رنگ میں ڈوبا ہوا اور اس کے حسن سے مسحور اور معمور تسلیم کرتے ہیں ٹیگور نے روح اور بدن کے تعلق پر گہری فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ مادہ پرست روح کی جداگانہ حیثیت کے بارے میں یہ تصور کرتے ہیں کہ عناصر کی خاص ترتیب پانے کی وجہ، اس کا سبب ہے۔ صوفیا نے نفس کی پاکیزگی اور تطہیر کے سلسلے میں (1) نفس امارہ (2) نفس لوامہ (3) نفس ملہمہ اور (4) نفس مطمئنہ کی تشریح کی ہے اور نفس مطمئنہ کو نفس کے ارتقا کی آخری منزل قرار دیا ہے "یا ابوھل نفس المطمئنہ ارجعی الا ربک راضیۃ مرضیہ" نفس کی عظمت کی انتہا ہے ظاہر ہے کہ ٹیگور کا روحانی سفر اس راستے سے بالکل مختلف تھا لیکن انھوں نے جہاں تزکیہ نفس کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ان کا طرز فکر صوفیانہ انداز نظر کے بعض پہلوؤں کی یاد دلاتا ہے۔ ٹیگور کی تخلیقات کے مطالعے سے پریم بھگتی کے مراتب اور اس کی وسعتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا نظریہ عشق بھگتی مارگ کی نمائندگی کرتا ہے۔ شانت رس، داسیہ رس، واتسلیہ رس اور مدھر رس کی کیفیات جابجا اپنا جلوہ دکھاتی رہتی ہیں۔ داسیہ رس (عبارت) کا ایک نظم میں اس طرح اظہار ہوا ہے:

''تو نے مجھے گیت گانے پر اکسایا خوشی کے موقع پر غم کے وقت تو نے مجھ سے گیت کہلوائے۔ تیرا کھیل مسلسل ہے۔ تجھے چھونا چاہوں تو ہاتھ نہیں آتا تو قریب آتا ہے لیکن ہاتھ پکڑنے سے پہلے دور چلا جاتا ہے اور پل پل میری جان کو تڑپاتا ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ محبت کے ایک ارفع مرحلے میں طالب و مطلوب کا درمیانی فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ 'گارڈنر' (Gardener) کی ایک نظم میں ٹیگور کہتے ہیں:

"I hold her hands and press her to my breast. I try to fill my arms with the loveliness to plunder her sw eet smile with kisses to drink her dark glance with my eyes.

Ah! but where is it? who can strain the blue from the sky?"

اس سلسلے میں ٹیگور کادمبری دیوی سے inspired تھے۔ کادمبری دیوی نے خودکشی کرلی تھی۔ محبوب کی عطا کو بے وقعت سمجھا تھا اور اپنی دانست میں بشر کے اختیارات کی طرف متوجہ کیا تھا۔ کادمبری کے سانحہ ارتحال کے بعد ٹیگور کے کلام میں یہ رنگا پھیکا پڑ گیا۔ سادھنا کی کہانیوں،

> امیر خسرو اور ٹیگور میں موسیقی کے شغف اور اس کی گھرائی میں ڈوب جانے کے رجحان کے علاوہ اور بھی مماثلتیں نظر آتی ھیں۔ یہ دونوں شاعر عشق مجازی کو 'فطرہ الحقیقت' کا درجہ دیتے تھے۔ امیرخسرو اور ٹیگور عشق کے معرکے کو مجاز کی دین اور اس کی ارتفاعی صورت تصور کرتے ھیں۔

پراکرتیرتی شودہ اور 'چترا' کے ڈرامے اور 'گارڈنر' کی نظموں میں روحانیت کی پرچھائیں قاری کے دل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یورپ کے سفر نے ٹیگور کے نظریات کو globlisation کے رجحان سے آشنا کیا تھا۔ یہ میلان امیر خسرو کے یہاں بھی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ انھوں نے اپنے وسیع مشاہدے، ژرف نگاہی اور دیدہ وری سے زندگی کے جلوہ صد رنگ کا نظارہ کیا تھا اور اس سے ان کے لاشعور میں تحریک پیدا ہوئی تھی ٹیگور کی سائیکی میں صدیوں کے ہندوستانی اور آریائی افکار و تصورات جذب ہو گئے تھے۔ ہندوستان علم و ادب کے خزانوں سے معمور ملک ہے اور قدیم سرمائے میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والے مباحث کی بڑی اہمیت رہی ہے اور فن کی تفہیم میں انھیں اساسی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ راگ، النکار، رس، بھاؤ اور انو بھاؤ وغیرہ نظریات ادبی تھیوری کی بنیادوں میں کارفرما رہے ہیں۔ ان نظریہ سازوں میں پانتی، اچاریہ بھرت ہری اچاریہ بھٹناک، آچاریہ آنند وردھن اور اچاریہ کنتک نے لفظ و معنیٰ کے ارتباط، فنی خد و خال کی معنیٰ آفرینی اور ادبیت کے عناصر کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کیے تھے۔ شعریات (Poetics) اور جمالیات (Aesthetics) کی بنیادوں میں حسن کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ٹیگور جمالیاتی حس کی اہمیت اور جمالیاتی آگہی کے قائل تھے اور علماء نے شعور اور جمالیات کی جو توضیحیں کی ہیں ان سے بخوبی واقف تھے۔ ٹیگور کی تخلیقات میں جمالیاتی جہت ان کی انفرادیت کی پہچان بن گئی ہے۔ ٹیگور کے کلام میں مذہب اور جمالیات کے موضوعات ان کے فکری محور کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ ٹیگور گنگا کے کنارے بیٹھ کر اس کائنات کی اصلیت پر غور و خوض کرتے انھیں تمام مظاہر میں حسن کا جلوہ نظر آتا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کائنات میں توازن اور تناسب کی بڑی اہمیت ہے۔ اجرام فلکی سے لے کر ارضی مظاہر تک تمام مظاہر اسی کے رہین منت ہیں۔ اپنی نظموں میں انھوں نے اس رمز کی تشریحیں پیش کی ہیں۔ ٹیگور کے طرز فکر اور صوفیا کے انداز نظر میں بعض جگہ قربت کا احساس ہوتا ہے۔ 'گیتانجلی' کے ترجمے 'عرض نغمہ' میں نیاز فتح پوری کے مندرجہ ذیل بیانات ملاحظہ ہوں:

(1) ٹیگور نے موسیقی کی زبان میں اظہار جذبات کیا ہے اسی طرح اس نے رنگ و تعطر سے اپنی دلبستگی کا ثبوت دیا ہے۔

(2) ''اس کتاب میں جتنی نظمیں ہیں قریب قریب سب میں مختلف کیفیات قلب کے ساتھ نوع انسان اور ذات باری کے باہمی تعلقات کا اظہار ہے۔''

(3) سوائے جمال خداوندی کے تمام عالم کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا۔

(4) اے بھائیو مجھے خیر باد کہو .... روانہ ہوتا ہوں اور اپنے دروازے کی کنجیاں دیتا ہوں ... اب دن نکل آیا ہے اور چراغ جو میرے تاریک گوشے کو منور رکھتا تھا گل ہو گیا ہے ... اب میں سفر کے لیے آمادہ ہوں۔''

ٹیگور کا فلسفہ حیات اور ان کے افکار و تصورات، متصوفانہ زاویہ نظر سے بعض جگہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ آخری بیان 'موتو انت قبل موتو' کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے مراد طبعی موت نہیں اختیاری موت ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں (1) شہادت مبدا (2) شہادت عمدا (3) شہادت وجدا اور (4) شہادت شہدا، نفس امارہ کو مارنے اور تزکیہ نفس کی چار منزلیں ہیں۔ ٹیگور کے کلام کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ صوفیا کی طرح کائنات کے تمام مظاہر کو 'آثار اللہ' تصور کرتے ہیں۔ مجاز سے حقیقت کے تصور تک پہنچنے کے دو مختلف درجوں پر اہل طریقت نے

روشنی ڈالی ہے 'عروج' اور 'نزول' اسی طرح سالک یاد حق کے دو طریقوں کو اپناتے ہیں (1) مقید اور (2) مطلق۔ مقید میں اسم کا ذکر کیا جاتا ہے اور مطلق میں 'یافت مسمیٰ' کا تصور ہوتا ہے۔ ٹیگور کی تخلیقات میں یہ فریبی جہاں نفس انسانی، روح اور انفس و آفاق کا ذکر کیا گیا ہے وہاں صوفیانہ افکار پر تو نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں 'التوحید اسقاط الاضیافات' کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس میں ماسوا اللہ کو بے وقعت اور بے بضاعت تصور کیا جاتا ہے۔

دو ہزار سے زیادہ پینٹنگز مکمل کرنے والے مصور ٹیگور نے مغربی ممالک کے سفر میں پکاسو، پالکی اور کینڈسکی کی پینٹنگز سے اثر قبول کیا تھا ان کا مشاہدہ بہت وسیع اور ان کی قوت باصرہ بہت تیز تھی اور باصرہ کی حس مصوری میں بنیادی رول ادا کرتی ہے۔ ٹیگور نے خطوط، دائروں، رنگوں، 'روشنی اور سایہ' کا سہارا لے کر انسان کے باطنی جذبات کی بھی عکاسی کی ہے۔ سنگیت کی طرح پینٹنگز کا باطنی اثر رنگ ونسل، رسم و رواج، عقائد اور قومیت کی سرحدیں مٹا کر اس بنیادی حقیقت کا احساس دلاتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی خالق کی مخلوق اور ہیومنزم کے شائستہ انسان کی پہچان ہے۔ یہ احساسات ٹیگور کی پینٹنگز میں نظر کے واسطے سے دل میں اتر جاتے ہیں۔

ٹیگور اس خیال کے حامل ہیں کہ زندگی اور کائنات کا حسن زندہ اور اس کا تخلیقی عمل مسلسل ہے۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ تم ایک ہی ندی میں دو بار قدم نہیں رکھ سکتے کیونکہ تم بدلتے رہتے ہو۔ ٹیگور کا خیال ہے کہ ایک خاص ندی میں دو بار اس لیے بھی قدم نہیں رکھا جاسکتا کہ خود ندی کا بہاؤ بدل جاتا ہے۔ میر نے کہا تھا:

ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر
زمین و زماں ہر زماں اور ہے

ٹیگور نے بڑی گہرائی میں اتر کر وجود اور کائنات کے ہر لحہ تبدیل ہوتے ہوئے حسن کو محسوس کیا۔ جمالیات میں بھامہا (Bhamaha) نے شعری ادب میں شیرینی (Madhurya) اور ستھرائی (Parasoda) اور لفظوں میں احساس اور جذبے کی شدت (OJAS) کی اہمیت واضح کی ہے۔ ٹیگور کی نظمیں اس کی اچھی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیگور کی جمالیاتی حس (Aesthetic Sensesibility) نے ان کے فن کو تابنا کی عطا کی ہے۔

ٹیگور کی ایشور بھگتی کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسے مسرت آگیں بنا دیا ہے۔ ٹیگور نے ترک دنیا کے قدیم تصور کو نئے انداز میں منقلب کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ نجات فرار میں نہیں بلکہ زندگی کے تجربات کا سامنا کرنے اور انھیں قبول کرنے میں ہے۔ ہم اپنی زندگی کو سکون اور اطمینان عطا کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"Deliverance is not for me in renunciation, I feel the embra nce of freedom in a thousand bound s of delight. No I will never shut the doors of my senses. The delight of sight and hearing touch will bear they delight."

ٹیگور کا تصور یہ ہے کہ صرف خانقاہ کی تنہائی اور اس کے تاریک گوشے میں پرستش کرنے سے خدا نہیں ملتا بلکہ اس کا جلوہ اس کاشتکار کی مشقت میں نظر آتا ہے جو سخت زمین پر ہل چلاتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے 'گیتانجلی' کی ایک تخلیق کا اس طرح ترجمہ کیا ہے:

''یہ (عبارت) نغمہ سوسرور تسبیح خوانی چھوڑ اور دروازہ بند کر کے خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں تو اس کی پرستش کر رہا ہے آنکھیں کھول۔ تیرا خدا تیرے روبرو نہیں؟ وہ وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین پر ہل چلاتا ہے جہاں سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے وہ ان کے ساتھ دھوپ میں بارش میں ہے اور اس کا ملبوس خاک میں اٹا ہوا ہے۔''

ٹیگور کا فلسفہ حیات اور ان کے افکار و تصورات، متصوفانہ زاویہ نظر سے بعض جگہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ آخری بیان 'موتو انت قبل موتو' کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے مراد طبعی موت نہیں اختیاری موت ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں (1) شہادت مبدا (2) شہادت عمدا (3) شہادت وجدا اور (4) شہادت شہداء نفس امارہ کو مارنے اور تزکیہ نفس کی چار منزلیں ہیں۔ ٹیگور کے کلام کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ صوفیا کی طرح کائنات کے تمام مظاہر کو 'آثاراللہ' تصور کرتے ہیں۔ مجاز سے حقیقت کے تصور تک پہنچنے کے دو مختلف درجوں پر اہل طریقت نے روشنی ڈالی ہے 'عروج' اور 'نزول' اسی طرح سالک یاد حق کے دو طریقوں کو اپناتے ہیں (1) مقید اور (2) مطلق۔ مقید میں اسم کا ذکر کیا جاتا ہے اور مطلق میں 'یافت مسمیٰ' کا تصور ہوتا ہے۔

فطرت کی حسن شناس ٹیگور کی شاعری کا بنیادی جوہر ہے اور فطرت ان کا سب سے معنی خیز استعارہ جس کا زندگی اور مظاہر کائنات سے براہ راست رشتہ ہے۔ ٹیگور نے زندگی کے خدوخال پہچان لیے تھے اس لیے ان کا آرٹ زندگی کی سچائیوں کا رمز آشکار کرتا ہے اور ان کی شاعری جہت دار شاعری ہے۔ ٹیگور کی تخلیقات پر اپنشدوں کے فلسفے، کالی داس، جے دیو اور کبیر داس کی شاعری کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ٹیگور نے کالی داس کی 'میگھ دوت' کو خراج تحسین پیش کر کے خود اپنی شاعری کے مزاج کی طرف ایک بلیغ اشارہ کیا ہے۔ شانتی نکیتن میں ٹیگور نے پرشکوہ عمارتوں پر فطری ماحول ترجیح دی ہے ٹیگور نے شان وشوکت سے نہیں انسان سے محبت کرنا سکھایا ہے اور ان کی تمام تخلیقات میں ہیومنزم کا اثر جاری وساری ہے۔

اردو کے شعرا اور ادیب ٹیگور کے افکار و تصورات سے متاثر ہوئے تھے۔ رومانی تحریک پر ٹیگور کے طرز اظہار کا عکس دیکھا جاسکتا ہے: جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، پریم چند، بجنوری، عابد حسین، سدرشن یلدرم، سجاد انصاری، فراق، افسر اور مخدوم وغیرہ نے ٹیگور سے اثر قبول کیا ہے۔ نیاز فتح پوری نے 'عرض نغمہ' کے نام سے گیتانجلی کا ترجمہ کیا ہے۔ محزوم اور نادم سیتاپوری نے ٹیگور کی زندگی میں ان پر کتابیں لکھیں اور انھیں خراج مدحت پیش کیا ہے۔ افسر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:

ایک ہو دیوان حافظ دوسرا گیتانجلی
ہوں یہ دونوں چیز تو انسان دولت مند ہے

ادب میں جمالیاتی نقطۂ نظر اور فطرت پرستی کی اہمیت اجاگر کرنے والوں میں ٹیگور کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ انگریزی ادب میں ورسواتھ، سنسکرت میں کالی داس، بنگالی میں ٹیگور اور اردو ادب میں انیس و دبیر نے حسن فطرت کے لازوال مرقعے پیش کیے ہیں۔

حواشی:

(1) رابندرسنگیت

رابندرسنگیت کو Tagore Songs بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی اور روایتی لوک گیتوں کا آمیزہ ہوتا ہے۔ ٹیگور نے 2230 گیت لکھے ہیں ان کا مجموعہ Gitabitan سے موسوم ہے۔ اس کے موضوعات پوجا (عبادت) پریم (محبت)، پراکرتی (فطرت) اور حب الوطنی وغیرہ سے متعلق ہیں۔

Syeda Jafar, 9-1-24/1, Langer Nagar
Hyderabad (A.P.)

شمس بدایونی

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی وفیات نگاری

وفیات نگاری ایک جدید اصطلاح ہے جس کے تحت وہ تمام کتب، دواوین، تاریخی قطعات، مضامین اور بیاضیں آجاتی ہیں جو اکابر و رجال کے سالہائے اموات کو محفوظ کرنے کے خیال سے ترتیب دی گئی ہوں۔ اردو میں دوسرے موضوعات کی بہ نسبت اس پر توجہ تاخیر سے دی گئی۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں بعض محققین کا اس جانب التفات نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ماضی میں، عربی کے تتبع میں فارسی اور فارسی کے تتبع میں اردو میں متعدد رسائل وکتب ترتیب دی گئیں جن کا تعارف راقم الحروف اپنے ایک مضمون 'اردو میں وفیات نگاری کی روایت' (مطبوعہ آج کل دہلی ستمبر 2005) میں کرا چکا ہے۔

اردو محققین کے نزدیک وفیات نگاری اصطلاح کے تحت صرف تاریخ و سالہائے اموات کو محفوظ و مرتب کرنے کا مفہوم ہی درست ہے اور یہی متعارف بھی ہے لیکن گزشتہ چند سالوں سے مرحوم شخصیات پر رسائل کے اطلاعی کالم شذرات، تعزیتی مضامین کو بھی اس اصطلاح کے مفہوم میں شامل کیا جانے لگا ہے۔ آج سے پہلے مذکورہ ماتمی مضامین، رسائل کے شذرات، ماتمی خبریں وغیرہ یادرفتگاں، بزم رفتگاں، کاروانِ رفتہ، ہم نفسان رفتہ، منثور مرثیہ، جانے والوں کی یاد آتی ہے، عنوانات کے تحت تعزیتی مضامین کے زمرے میں آتے تھے۔ اصناف نثر میں انھیں شخصی خاکوں کے تحت شمار کیا جاچکا ہے۔ مثلاً چند ہم عصر (مولوی عبدالحق) ہم نفسانِ رفتہ (رشید احمد صدیقی) یاد رفتگاں (سید سلیمان ندوی) عظمتِ رفتہ (ضیاء الدین برنی) کاروانِ رفتہ (ڈاکٹر محمد ایوب قادری) وہ صورتیں الٰہی (مالک رام) پرانے چراغ (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) وغیرہ۔

ماتمی مضامین کی اصطلاح مولانا عبدالماجد دریابادی (ف 1977) نے وضع کی تھی، جو اُن کے اخبارات سچ (اجرا1925)، صدق (1935) اور صدق جدید (دسمبر 1950) میں استعمال ہوتی رہی۔ لیکن بالعموم رائج نہ ہوسکی۔ موجودہ دور میں ماتمی یا تعزیتی مضامین اُس طور نہیں لکھے جاتے جس طور ہمارے قدما یا بزرگان دارالمصنّفین لکھتے رہے ہیں لہٰذا وفیات عنوان یا اصطلاح ہی مذکورہ تمام ماتمی تحریروں کو محیط سمجھ لی گئی ہے۔ راقم الحروف بھی اسی اصطلاح کے تحت اولاً معارف کے باب وفیات اور ثانیاً مولانا ضیاء الدین اصلاحی (پیدائش[1]: 3 جولائی 1937، وفات: 2 فروری 2008) کے ماتمی مضامین اور شذرات پر گفتگو کرے گا۔ یہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ مولانا اصلاحی کے ماتمی مضامین معارف کے باب وفیات ہی کا تسلسل ہیں۔

رسائل و جرائد کی دنیا میں ماھنامہ 'معارف' (اعظم گڑھ) کی کئی اوّلیات ھیں جن میں سے ایک یہ بھی ھے کہ شامل اشاعت مواد کو الگ الگ عنوانات کے تحت تقسیم کردیا جائے اور بعض عنوانات کو مدیر، مجلس ادارت کے کسی رکن یا رفقائے دارالمصنّفین ھی کے قلم سے مخصوص رکھا جائے تاکہ علم و ادب کی دنیا میں معارف کے امتیازات و مختارات الگ معلوم ھوسکیں۔ انھیں عنوانات میں شذرات، اخبار و آثارِ علمیہ و ادبیہ، وفیات اور مطبوعات جدیدہ بھی ھیں جو معارف کے تقریباً ھر شمارے میں اختیار کیے جاتے ھیں۔

رسائل و جرائد کی دنیا میں ماہنامہ 'معارف' (اعظم گڑھ) کی کئی اوّلیات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شامل اشاعت مواد کو الگ الگ عنوانات کے تحت تقسیم کردیا جائے اور بعض عنوانات کو مدیر، مجلس ادارت کے کسی رکن یا رفقائے دارالمصنّفین ہی کے قلم سے مخصوص رکھا جائے تاکہ علم و ادب کی دنیا میں معارف کے امتیازات ومختارات الگ معلوم ہوسکیں۔ انھیں عنوانات میں شذرات، اخبار و آثار علمیہ و ادبیہ، وفیات اور مطبوعات جدیدہ بھی ہیں جو معارف کے تقریباً ہر شمارے میں اختیار کیے جاتے ہیں۔

'وفیات' کا کالم کب سے شروع ہوا یہ بتانا سردست مشکل ہے۔ لیکن سلسلہ وفیات کا آغاز معارف کے دوسرے شمارے ہی سے ہوگیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی (ف 1953) نے مولانا شبلی نعمانی کی وفات (1914) کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ زمیندار لاہور کی فروری 1915 کی اشاعت میں شامل ہوا تھا جب جولائی 1916 میں معارف کا اجرا ہوا تب اگست 1916 کے شمارے میں یہی مضمون بہ عنوان 'مولانا شبلی کے مرض الموت کے حالات' وفات اور آخری احوال' شائع ہوا۔ اس کے بعد وفیات کا یہ سلسلہ معارف کے کالم شذرات میں جاری رہا۔ اپنی ادارت کے آخری دور میں سید سلیمان ندوی نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لاہور (ف 1984) کی تجویز پر شذرات میں اہل علم کا ماتم کرنا بند کردیا تھا۔ اس کے بجائے 'وفیات' عنوان کے تحت علیحدہ

سے مضمون لکھنے لگے تھے۔[2] ادارت کا یہ آخری دور 1945 تا1950 رہا ہوگا کیونکہ 14 جون 1950 کو سید صاحب پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔[3] جون 1951 تک معارف پر ان کا نام بحیثیت مرتب شائع ہوتا رہا۔

سید صاحب نے اپنے دورِ ادارت میں 135 شخصیات پر تعزیتی مضمون لکھے جو ان کی کتاب یادرفتگاں (باراوّل: کراچی 1955) میں شامل ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر تمام مضامین معارف میں شذرات اور وفیات عنوان کے تحت شائع ہوئے تھے۔ وفیات کے ذخیرے میں ان مضامین کی اہمیت سے سید صاحب بخوبی واقف تھے۔انھوں نے یادِرفتگاں کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''اسلامی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں، لاکھوں، بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے۔ تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں۔ کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں۔'' (ص5)

سید صاحب کے بعد شاہ معین الدین احمد ندوی (1903-1947) جولائی 1951 میں مدیر معارف کی صورت میں جلوہ افروز ہوئے۔ اس سے قبل وہ معارف کی مجلس ادارت میں شامل تھے۔ انھوں نے سید صاحب کے قائم کردہ وفیات کے کالم کو جاری رکھا اور جولائی 1951 سے دسمبر 1974 تک کم و بیش 23 سال شذرات اور وفیات کا کالم لکھتے رہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ان کی لکھی 147 وفیات مرتب کی ہیں، جو'وفیات معین' کے نام سے منتظر اشاعت ہیں۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد جنوری 1975 میں مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن (1911-1987) معارف کے مدیر منتخب ہوئے۔ انھوں نے بھی اپنے پیش رو کی طرح وفیات کے کالم کو جاری رکھا اور ملک کے اہلِ علم وخبر کی وفات پر ماتمی مضامین لکھتے رہے۔ انھوں نے کم وبیش 76 ماتمی مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے اکثر بزم رفتگاں (دو جلد: ج1 دہلی۔ 1981۔ ج2 اعظم گڑھ، سنہ ندارد) میں شامل ہو کر طبع ہو چکے ہیں۔

ہمارے ممدوح مولانا ضیاء الدین اصلاحی (2008-1937) اس سلسلے کی چوتھی کڑی ہیں۔ وہ دارالمصنّفین سے رفیق کی حیثیت سے 1957 میں وابستہ ہوگئے تھے۔ 1974 میں معارف کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے۔ 18 نومبر 1987 کو (بعد رحلت مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن) وہ دارالمصنّفین کے ناظمِ اعلیٰ قرار دیے گئے اور معارف کی ادارت بھی انھیں سونپ دی گئی۔ جنوری 1988 سے معارف پر مدیر کی حیثیت سے ان کا نام شائع ہونے لگا۔ معارف کے مرتب و مدیر کی حیثیت سے انھوں نے جو پہلا اداریہ لکھا وہ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کی موت پر طویل ماتمی مضمون تھا (دسمبر 1987) جسے علمی حلقوں میں پسند کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی وہ رفیق اور مجلس ادارت کے ایک رکن کی

حیثیت سے وفیات کا کالم لکھتے رہے تھے۔

مولانا اصلاحی نے دسمبر 1987 سے فروری 2008 تک تقریباً سوا بیس سال میں کل 243 شذرات اور تقریباً 146 وفیات لکھیں۔ 45 وفیات انھوں نے ادارت (1988) سے پیشتر کی مدت میں لکھیں اس طور انھوں نے کل 191 وفیات لکھیں۔ شذرات کے تحت جو وفیاتی مضامین لکھے ہیں وہ اس تعداد پر اضافہ ہوں گے۔ تعداد کا یہ تعین میرے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ معارف کا مکمل فائل میرے پاس محفوظ نہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے خاص میرے لیے معارف کے فائل کھنگالے اور مجھے مطلوبہ اعداد وشمار فراہم کیے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

اصلاحی صاحب نے مارچ 1975 میں وفیات کالم کے تحت پہلا ماتمی مضمون مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی پر لکھا تھا اور آخری مضمون مہاتما گاندھی کے پوتے رام چندر گاندھی کی موت پر لکھا ہے، جو معارف اکتوبر 2007 میں شائع ہو چکا ہے۔

وفیات کے تحت اصلاحی صاحب نے جن شخصیتوں پر مضامین لکھے ہیں ان میں ہند بیرون ہند کے علما وفضلا شعرا وادبا، اعزہ واحباب، سیاسی وسماجی رہنما، سربراہانِ مملکت، مختلف مذاہب و مسالک اور سماج کے مختلف نظریات ومیلانات کے حامل افراد شامل ہیں۔ اسلوب و پیش کش کے لحاظ سے یہ مضامین خاکہ نگاری کے زمرے میں آتے ہیں، جو معاصرین کے شخصی نقوش ابھارنے اور ہم نفسانِ رفتہ کی دید وشنید کو تاثرات و واقعات کی صورت دینے میں معاون بنتے ہیں لیکن یہ چونکہ موت کے فوراً بعد لکھے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ اپنے عہد کے وفیات کے اوراق ہیں۔ ان کی اس حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اصلاحی صاحب کے یہ مضامین مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ ادب و انشا کے خوبصورت نمونے بھی ہیں اور معلومات واطلاعات کے دفتر بھی۔ یہ رقت آمیز بھی ہیں اور خبر کی حد تک محدود بھی۔ جن شخصیات کی وفات کو انھوں نے ذاتی صدمے اور قومی نقصان کی صورت میں دیکھا یا جن کے علم وکمال سے زیادہ باخبری یا جن سے ذہنی وفکری یگانگت تھی۔ ان پر ایسے ماتمی مضامین لکھے ہیں کہ بقول شاعر:

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات پر طویل ماتمی مضمون کے دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

''عین نصف النہار کے وقت وہ آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا جس سے ہندوستان اور پوری دنیائے اسلام منور تھی۔ اُس وجودِ مقدس کا خاتمہ ہوگیا، جس کے ذکر جمیل سے مسجدیں، خانقاہیں، مدارس، جدید تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور سیاست وحکومت کے ایوان پرشور رہتے تھے۔ وہ برگزیدہ ہستی معدوم ہوگئی جس کے ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے میں سندانِ عشق تھا۔ وہ میرِ کارواں رخصت ہوا جس کا شغل، ذکر کے ساتھ فکر اور جس کا معمول تسبیح ومناجات کی طرح وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل تھا۔ وہ نہ ملت کے جوانوں کی طرح نخچیرِ زمانہ

تھا اور نہ پیرانِ کہن سال کی طرح بیگانہ ایام۔ یہی وہ چراغ تھا جس سے علم و عرفان اور شریعت و طریقت کی بزم روشن تھی۔ اس کے فیض سے ایمان کی بادِ بہاری چل رہی تھی۔ معرفت و یقین کی دوکان آراستہ تھی۔ دریائے علم رواں اور دوائے دل ارزاں تھی۔

آہ وہ پُردرد آواز خاموش ہوگئی۔ واحسرتا وہ بے قرار دل ساکت ہوگیا جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت پر تڑپتا اور تڑپاتا رہتا تھا۔ وا اَسفا وہ اشک آلود آنکھیں بند ہوگئیں جو دین وملت کے ہر غم میں خوں بار رہتی تھیں۔ ہائے اس پر جوش سینے کا تلاطم ختم ہوگیا جو آلام ومصائب کے پہاڑوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا تھا۔ ہم کس کس چیز کا ماتم کریں اور کس کس کے لیے روئیں، وہ ایک فرد نہیں ایک شخص نہیں ایک قوم ایک ملت اور تنہا نہیں مجموعہ صفات وکمالات تھا:

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكَ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانف قَوم تَهْدِمَا

(معارف فروری 2000)

جسٹس خواجہ محمد یوسف کی وفات پر بھی اُن کا قلم سوگوار ہوگیا۔ یہ اقتباس دیکھیے:

یہ ممتاز و ماہر قانون داں اِس کا سزاوار ہے کہ اس کے غم میں نہ آنسو تھمیں اور نہ شورِ گریہ کم ہو۔ یہ دردمند، دوراندیش، صائب الرائے مستحق ہے کہ سینہ افلاک سے بھی آہ سوزناک اٹھے اور وطنِ گیتی سے بھی نالہ شرربار اٹھے:

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

آہ! قوم وملت کے نازک اور پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے والا نہیں رہا۔ وہ جاں نثار چلا گیا جو اپنی خدمات قوم کو نچھاور کررہا تھا۔ وہ غم گسار رخصت ہوگیا جو سب کے غم کو اپنا غم سمجھ کر سینہ سپر رہتا تھا۔ بنگال کا وہ مسیحا نفس باقی نہیں رہا جو اس میں روحِ حیات پھونک رہا تھا۔ وہ روشن خیال اور عالی دماغ مصلح دنیا سے اٹھ گیا جو کلکتہ کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لارہا تھا اور اُن کی معاشرتی، سماجی، معاشی اور ذہنی دماغی اصلاح وتربیت کے لیے فکرمند اور سرگرم رہتا تھا۔ اس کے مرجانے سے قوم یتیم ہوگئی۔ کلکتہ اجڑ گیا اور مغربی بنگال میں سناٹا چھا گیا:

گلشن میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

(معارف مارچ 2005)

ان مضامین میں مرحوم شخصیتوں کے خدوخال کے ساتھ ساتھ گزشتہ 32 سالوں کے علمی معاملات، سیاسی واقعات، ملکی اور غیرملکی تحریکات اخلاقی و مذہبی رجحانات، ملی حادثات اور بعض اضافی معلومات بھی محفوظ ہیں، جن سے زیرِ قلم شخصیت کا کسی نہ کسی طور تعلق رہا تھا۔

یہ ماتمی تحریریں محض مرحومین کی بزرگی، اور ان کی شخصی اہمیت ومرتبہ ہی کو اجاگر نہیں کرتیں بلکہ خود مصنف کی پاک طینتی، وسیع المشربی، محبت واخلاص سے بھرپور دل، فکروجودت سے مملو دماغ، اخلاص ومحبت، سادگی و انکساری کو مشتہر کرتی ہیں۔ ان تحریروں میں اُن کے اسلوب وقلم کی توانائی کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

وفیات کے تحت اصلاحی مرحوم نے جن معاصرین کا ماتم کیا ہے ان میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں:

مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا کوثر نیازی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، جسٹس تقی عثمانی، مولانا نجیب اللہ ندوی، قاضی اطہر مبارکپوری، قتیل شفائی، صہبا لکھنوی، پنڈت آنند نرائن ملا، علی سردار جعفری، خلیل الرحمٰن اعظمی، معین احسن جذبی، مالک رام، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، احمد ندیم قاسمی، گیان چند جین، کالی داس گپتا رضا، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، خان عبدالغفار خاں، رام چندر گاندھی، شاہ فہد، جنرل محمد ضیاء الحق، کرنل بشیر حسین زیدی، حکیم عبدالحمید، ڈاکٹر رفیق زکریا، پروفیسر علی محمد خسرو، چودھری سبط محمد نقوی، علی جواد زیدی، ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی، سید علی نقوی، نجیب محفوظ، شیخ محمد مجذوب، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ وغیرہ۔

یہاں ایک سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ اصلاحی مرحوم کے زیرِ گفتگو مضامین معارف میں لکھنے والے ان کے پیش رو بزرگوں کے تحریر کردہ مضامین کا تسلسلِ محض ہیں یا یہ اُن سے کسی خصوصیت میں ممتاز ومنفرد ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا، اُس وقت تک مناسب نہیں ہوگا جب تک سید صاحب، شاہ صاحب اور عبدالرحمٰن صاحب کے ماتمی مضامین کا علیحدہ علیحدہ جائزہ نہ لیا جائے اور ان میں ایک دوسرے کے یہاں پائی جانے والی خصوصیات و امتیازات کو نشان زد نہ کیا جائے۔ ان بزرگوں کے علاوہ رفقائے دارالمصنّفین نے بھی وقتاً فوقتاً وفیات کالم کے تحت مضامین لکھے ہیں۔ اُن کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ تاہم راقم الحروف نے اصلاحی مرحوم کے ماتمی مضامین کی بعض خصوصیات کو نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے ان کو سلسلہ وار درج کیا جارہا ہے:

(1) اصلاحی مرحوم عموماً مضمون کا آغاز ماتمی جملے سے کرتے ہیں
(2) موت کے واقعے کی تفصیل دیتے ہیں۔
(3) اپنے تعلق اور ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔
(4) سوانحی کوائف بیان کرتے ہیں۔
(5) عملی وتصنیفی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔
(6) اگر شخصیت کی کارگزاری کے متعدد پہلو ہوں تو ہر پہلو پر ایک ایک پیراگراف لکھتے ہیں۔
(7) حسب موقع عربی، فارسی واردو اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔
(8) زبان کو رواں اور شگفتہ رکھتے ہیں۔ خاکہ نگاری کی طرح انشاپردازی اور شیوابیانی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔
(9) مرحوم شخصیت کا دارالمصنّفین سے تعلق، نسبت اور اس کی نوعیت کو بھی آشکارا کرتے ہیں۔
(10) نظریات کے اختلاف کو اعتراف کمال میں مانع نہیں آنے دیتے۔ مثلاً:

مصر کے مشہور ادیب اور ناول نگار نجیب محفوظ (ف 30 اگست 2006) کمیونسٹ خیالات کے حامی تھے۔ مصر میں ان کے ایک ناول 'اولادُ حارتینا' (1959) پر پابندی لگادی گئی تھی کیوں کہ مسلم حلقوں کو اس کے بعض حصوں پر بڑا اعتراض تھا۔ مصر کے ایک عالم دین شیخ عمر عبدالرحمٰن نے نجیب محفوظ کو سزائے قتل کا مستحق قرار دیا تھا۔ 1994 میں ان پر جان لیوا حملہ بھی ہوا تھا جس میں

اُن کا ایک ہاتھ بیکار ہوگیا تھا۔ ان تمام واقعات سے واقفیت کے باوجود اصلاحی مرحوم کے قلم سے کہیں کوئی جملہ کوئی لفظ ایسا رقم نہیں ہوا جس سے ادب کے نوبل انعام یافتہ اُس عرب ادیب کی توہین یا تحقیر ہو۔ متعلقہ اقتباس درج کردینا مناسب ہوگا جس میں انھوں نے حقائق بیان کرنے کے بعد اپنے نظریات کے اختلاف کو ایک دعائیہ کلمے میں سلیقے سے پیش کردیا:

''اس میں شبہ نہیں کہ وہ ترقی پسند، آزادی رائے اور روشن خیالی کے حامی تھے اور اس میں وہ عام سطح سے آگے نکل جاتے تھے۔ مارکسزم کے اثرات بھی ان پر تھے۔ انھوں نے سلمان رشدی کی مدافعت کی اور جب امریکہ کے اشارے پر مصر اور اسرائیل کے درمیان کیمپ ڈیوڈ معاہدہ عمل میں آیا تو نجیب محفوظ نے اس کی حمایت کی۔ وہ عرب و اسرائیل تعلقات کے بھی حامی تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کی عافیت بخیر کرے۔ (معارف نومبر 2006)

(11) اصلاحی مرحوم شخصیت کے کمزور پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں مگر احتیاط سلیقے اور تدبر کے ساتھ، دو مثالیں:

پروفیسر نثار احمد فاروقی (ف 28 نومبر 2004) کے مزاج کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نثار صاحب نے اپنے بارے میں خود لکھا ہے کہ وہ عہدوں کے حصول کے لیے کبھی سرگرداں نہیں رہے۔ خود دار تھے، خود بینی اور خودنمائی، خوشامد، تملق، سخن سازی، ریشہ دوانی اور مطلب براری کے لیے داؤ پیچ کے فن سے ناآشنا تھے۔ لگی لپٹی بات نہیں کرتے، صاف گوئی سے کام لیتے۔ تاہم مغلوب الغضب اور تنک مزاج تھے۔ بہت جلد برہم ہوجاتے تھے۔ اسی لیے اپنے دوستوں سے اکثر ان کی اَن بن ہوجاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ 1947 میں اپنے قصبے اور دلی میں مسلمان گھرانوں کی جو حالت دیکھی تھی اس کی تلخی ان کے رگ و ریشے میں سرایت کرگئی تھی۔ اس کی وجہ سے مزاج میں حدت آگئی تھی گو بہ ظاہر کھُور معلوم ہوتے تھے مگر اندر سے نرم تھے۔'' (معارف مارچ 2005)

پروفیسر عبدالمغنی پٹنہ (ف 5 ستمبر 2006) کی شخصی کمزوری پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''بشری لغزشوں سے کوئی شخص مبرا نہیں ہوتا۔ عبدالمغنی صاحب میں بھی انانیت، ترفع اور خودرائی تھی اور انھیں اپنی علمی فضیلت و برتری کا احساس بھی رہتا تھا جو اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ تاہم ان کے علمی کمالات اور ادبی تنقیدی خدمات مسلم ہیں۔ وہ مسلمانوں کی علمی، تعلیمی اور معاشی پس ماندگی دور کرنے اور ان کے گوناگوں پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ (معارف، اکتوبر 2006)

(12) دعائیہ کلمات پر مضمون کا اختتام کرتے ہیں:

''بارِ الٰہا! اپنے اس نیک بندے اور دارالمصنفین کے بے لوث خدمت گزار کو اپنے دامن رحمت سے ڈھانک لے اور اس کی تربت کو پرانوار کر۔ (مولانا صباح الدین عبدالرحمن، دسمبر 1987)

''اللہ تعالیٰ دین وملت اور علم وحکمت کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔'' (مولانا حکیم زماں حسینی، جنوری 2000)

مولانا اصلاحی نے دسمبر 1987 سے فروری 2008 تک تقریباً سوا بیس سال میں کل 243 شذرات اور تقریباً 146 وفیات لکھیں۔ 45 وفیات انھوں نے ادارت (1988) سے پیشتر کی مدت میں لکھیں اس طور انھوں نے کل 191 وفیات لکھیں۔ شذرات کے تحت جو وفیاتی مضامین لکھے ہیں وہ اس تعداد پر اضافہ ہوں گے۔

''اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انھیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (پروفیسر خورشید الاسلام، اگست 2006)

مضمون کے اختتام پر دارالمصنفین کے ذمے داران سے یہ گزارش کروں گا کہ معارف کے شذرات و وفیات کو یکجا کرکے پیش کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ سید صاحب کے شذرات طبع ہوچکے ہیں۔ ابھی نصف صدی کے شذرات کتابی صورت حاصل کرنے کے منتظر ہیں۔ وفیات کی صورت بھی شذرات کی سی ہے۔ سید صاحب اور رحمان صاحب کی وفیات شائع ہوچکی ہیں۔ باقی منتظر اشاعت ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ رفقائے دارالمصنفین میں متعدد افراد کی لکھی وفیات ہیں ان کی جمع آوری کی بھی ضرورت ہے۔ 1920 میں جب سید صاحب یورپ کے سفر پر گئے تب مولانا عبدالماجد دریابادی نے تقریباً آٹھ ماہ معارف کی ادارت سنبھالی اسی طرح جولائی 1946 میں جب سید صاحب ریاست بھوپال کے امور مذہبی کے افسر اعلیٰ بن کر چلے گئے تو اس وقت بھی رسالے کی نگرانی مولانا ماجد کے ذمے تھی۔ 4 اس درمیان لکھے جانے والے شذرات اور وفیات میں مولانا ماجد کا نام تلاش کرنا ناگزیر ہے۔

1947 میں ایک سال کے لیے مولانا سید ریاست علی ندوی (ف 14 نومبر 1976 بھی مدیر رہے۔ شذرات و تبصرے لکھے۔ 5 کہنے کا منشا یہ ہے کہ مذکورہ تعداد وفیات 549 کے علاوہ بھی وفیات کی ایک قابل ذکر تعداد معارف کے فائلوں میں موجود ہے جسے شماریات کی حد میں لاتے ہوئے یکجا ومرتب کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مصنف وار اور ایک عہد وار۔ جو صورت آسان ہو اختیار کی جاسکتی ہے۔

اگر معارف کے باب وفیات کی سلسلہ وار ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا جاتا ہے تو عربی ادب کی طرح اردو میں یہ دفیات الاعیان (ابن خلکان) فوادالوفیات (صلاح الدین صفدی) کی طرح ضخیم یادگاری کام ہوگا اور جو لوگ اسے مرتب کریں گے وہ تاریخ میں اپنی جگہ بنالیں گے اور اس شعر کے حقیقی مصداق ہوں گے:

ورق ورق سوزنِ قلم سے قبائے جاں اپنی سی رہے ہیں
نہ مار پائے گی موت ہم کو کہ ہم کتابوں میں جی رہے ہیں6

حوالے و حواشی:

(1) ہوز ہو آف انڈین رائٹرس 1999، ج2، ساہتیہ اکادمی دہلی 1999، ص 1487، یہ تاریخ خود مولانا کی تحریر کردہ ہے۔ عام طور پر ان کا سنہ پیدائش 1838 لکھا جاتا ہے جو غلط ہے۔ دیکھیے دارالمصنفین کی تاریخ۔ پروفیسر خورشید نعمانی ج1، اعظم گڑھ 2003، ص 106

(2) دارالمصنفین کی تاریخ ج2، ص 281، مطبوعہ اعظم گڑھ 2004

(3) علامہ سید سلیمان ندوی: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، ندوی مکتبہ فردوس، لکھنؤ 1985، ص 86

(4) دارالمصنفین کی تاریخ ج2، ص 267

(5) علامہ سید سلیمان ندوی، ص 369

(6) یہ معروف محقق حنیف نقوی کا شعر ہے۔

■

Shams Badayuni, 58 New Azad Puram Colony, Izzat Nagar, Bareilly - 243122 (U.P)

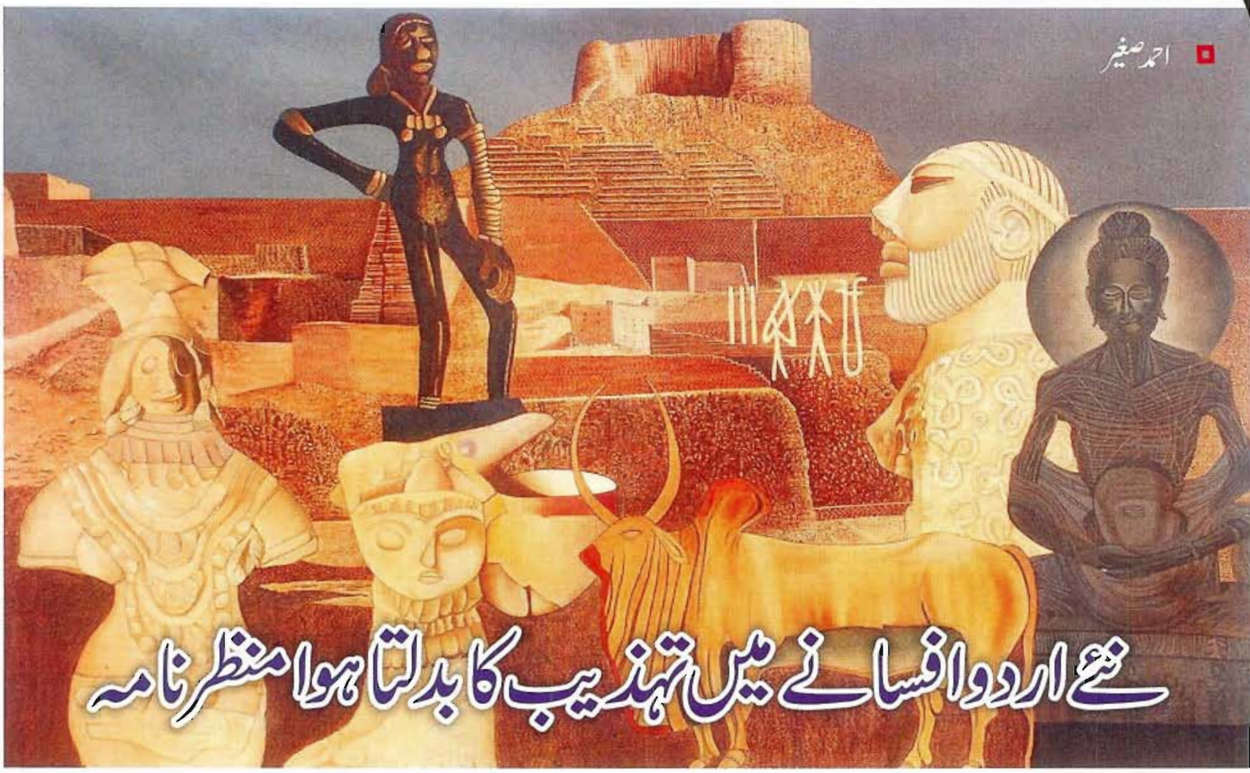

احمد صغیر

نئے اردو افسانے میں تہذیب کا بدلتا ہوا منظر نامہ

ادب بلاشبہ تہذیب کی پیداوار ہے اور تہذیب چند اصولوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ زندگی سے جب یہ اصول الگ ہوجاتے ہیں تو پھر زندگی اس انتشار کا شکار ہوتی ہے جسے ہم جنگل راج بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے بلاشبہ جانوروں کی طرح ہی اپنی زندگی اور اپنے عہد کا آغاز کیا۔ مورخین کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے کوئی پانچ لاکھ سال قبل انسان کا اس دھرتی پر وجود ہوا یا آدمی کی وہ شکل دیکھنے کو ملی جسے آج ہم انسان کہہ رہے ہیں۔ اس وقت کے آدمی میں اور اس کے ساتھ رہنے والے دوسرے جانداروں میں کوئی فرق نہیں تھا ہر ایک کی بس یہی کوشش ہوتی تھی کہ اس کا پیٹ بھر جائے اور وہ محفوظ رہے۔ لیکن آدمی میں دھیرے دھیرے اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی کچھ فکر پیدا ہوئی اور یہی تہذیب کا پہلا زینہ ہے اور اسی زینے پر کھڑے ہوکر اس نے دنیا کا سب سے پہلا قانون بنایا اور اس پر عمل بھی شروع کیا کہ شکاری جانور پر جس کا پتھر پہلے پڑے گا اس شکار پر اس کا حق ہوگا۔ جانور کے گوشت سے بھوک مٹاتے تھے اور جنس کی آسودگی عورت سے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی قانون بنا کہ جس مرد نے عورت سے پہلے تعلق بنا لیا اس عورت پر اسی کا حق ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ یہ دو قانون نہ بنتے تو آدمی کبھی بھی تہذیب کی وادیوں میں واپس نہ آتا۔ انھیں قوانین نے آدمیوں کو ایک ساتھ رہنے کا سلیقہ دیا اور ساتھ رہنے کا یہ سلیقہ آدمی کو تہذیب کی ایک دوسیڑھی اور اوپر لے جاتا ہے مگر آدمی جس ماحول میں تھا جن درندوں سے اس کا سامنا تھا جن طوفان، زلزلوں اور آفات ارض وسماں سے اس کا واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لیے دھیرے دھیرے اسے ایک دوسرے کی فکر سے زیادہ قریب کر دیا۔ آدمی کے اندر خباثت تو بھری پڑی تھی کاٹنے اور بھنبھوڑنے کی ساری صلاحتیں موجود تھیں یہ اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے تھے اور ان کی تہذیب کئی سیڑھی لڑھک کر نیچے چلی جاتی تھی۔ حرص وہوس کی تیز دھاروں نے فرعون، ہلاکو اور چنگیز کو جنم دینا شروع کیا تو پوری بستی، پورا کا پورا علاقہ دیکھتے ہی دیکھتے درندگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آدمیوں نے مجبوراً کچھ ایسی چیزوں کی تلاش کی جو اسے بھیانک ابلتے والے آتش فشانی مظالم سے بھی محفوظ رکھ سکے یہی کسی ان دیکھی طاقت کے آگے سر جھکانے اور بندھے ٹکے اصولوں کو تسلیم کرنے کی عادت نے مذہب کی شمع روشن کر دی جس نے بہت حد تک قارونوں، شدادوں اور ہلاکوؤں کو ایک انجانے خوف میں مبتلا کیا تو پھر بستیاں آباد ہوتی چلی گئیں اور تحفظ اور آسودگی کے اصول وضع ہوتے چلے گئے اور یہیں سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ باقاعدہ تہذیب کا آغاز ہوتا ہے اس کے آس پاس ایشیا اور یوروپ کے بڑے علاقے میں فکری اصولوں نے قدم جمایا چین کے بڑے علاقے میں کنفیوشس اور لاوزے نے بہت حد تک جنگل راج کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ یوروپ میں عیسائیت نے پرچم سنبھالا مشرق وسطیٰ میں نبیوں اور پیغمبروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہندوستان میں مہاتما بدھ اور مہابیر نے فکری نظام کو آگے بڑھایا اور لوگ سوچنے لگے کہ آخر برائی کیوں ہوتی ہے اور اچھائی کس طرح جنم لے گی۔ اسلام نے اگر عربوں کی خباثت دور کی تو حضرت موسیٰؑ کے ماننے والوں نے فرعونوں کو مزید جنم دینے سے روکا۔ رام کے عہد میں ہندوستان میں فکری انقلاب، راون کے تصور کو شکست دے کر ابھرا لیکن مجموعی طور پر ہماری تہذیب یا ہمارا کلچر ذاتی مفاد میں الجھ کر رہ گیا۔ ذاتی مفاد نے کبھی کبھی حرص وہوس کی چنگاریوں نے شعلہ بنا دیا تو کتنے مہابھارت نے جنم لیا اور کافی کچھ کھونے کے بعد آدمی کو زیادہ سے زیادہ پانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس خیال کو مذہبی گروپ نے اپنے اپنے طور پر فروغ دینے کی کوشش کی لیکن جو سب سے زیادہ موثر قدم ہوا وہ تھا ادب کی نشوونما اور تمثیلی انداز میں گناہ وثواب کے اثرات کی وضاحت۔ ہم اگر ایک نظر ڈالیں تو ہمارے ہندوستان کے وسیع وعریض علاقے میں جس قدر زبانیں بالیدہ ہوچکی تھیں اور ان میں ادب کروٹیں لینے لگا تھا تو ہر ایک کا جو نظریہ تھا عام طور پر یہی تھا کہ تم برا نہ کرو ورنہ برا ہوگا اور اگر تم اچھا کروگے تو تمھاری منزل بھی تمھاری خواہش کے

مطابق ملے گی۔ اس خیال پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی اثرات کی موٹی چادر چڑھی ہوئی تھی اسی لیے جب ہمارے یہاں اردو ادب نے انگڑائی لی تو حسب مطابق پہلے شاعری نے اپنے دائروں کو وسیع تر کیا اور تاثراتی انداز میں نیکی کی طرف آنے کی آواز دی۔ اخلاق کو بلند کرنے کی ترغیب دی اور امن وشانتی کی زندگی گزارنے کا ایک فکری نظام بنانے کی مختلف کوششیں شروع کیں پھر یہ ادب کا رُخ جب نثر کی طرف آتا ہے تو چھوٹی موٹی حکایتیں فارسی زبان کے زیراثر ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں بھی یہی ترغیب تھی اچھا کرو انجام اچھا ہوگا۔ حکایتوں نے کہانی کی شکل لی اور یہ قصے جمع ہوکر داستان کی شکل بھی بن گئے الف لیلیٰ کی داستان شروع ہوتی ہے تو اس لیے شروع ہوتی ہے کہ راجہ کی غلط فہمی کی وجہ سے اب آنے والے دنوں میں کسی عورت کی گردن محل کے برج پر نہیں ٹنگے۔ گویا ایک اصلاحی رنگ سامنے آیا۔ داستانیں اپنا علاقہ وسیع کرتی گئیں۔ 'گل بکاؤلی کی داستان ہو' داستان امیر حمزہ ہو'، 'طلسم ہوش ربا' ہو ہر جگہ وہی ایک اصلاحی نظام کے تار بنے جانے لگے اور تہذیب کے اثرات سامنے آتے گئے لیکن بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب ہمارے یہاں افسانہ انگڑائی لیتا ہے تو جو سب سے پہلے افسانہ لکھا گیا وہ سماجی ناہمواری کے خلاف تھا کہہ سکتے ہیں کہ اصلاحی تھا لیکن ہمارے افسانہ نگار یہ بھی دیکھنے لگے کہ مسجدوں، مندروں، کلیساؤں اور گرودواروں پر جن لوگوں کا قبضہ ہے وہ اس کا فائدہ عوام تک پہنچنے نہیں دیتے۔ مولوی اگر کوئی بات کہتا ہے اور وہ بات اگر اس کے خلاف جاتی ہے تو فوراً اس کی تاویل بھی کر دیتا ہے۔ یہی حال دوسرے مذہبی رہنماؤں کا تھا۔ تو ہمارے فنکار بہت گھٹن میں تھے اور جو کلاسیکی نظام، جو دیواریں کھڑی تھیں انھیں وہ پہلے تو حقارت سے دیکھتا ہے پھر اس سے نفرت کرتا ہے اور پھر اس کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے تو پریم چند کے دور کے پہلے کا ادب جو منظر پیش کرتا ہے پریم چند کے عہد میں وہ دھیرے دھیرے بدل جاتا ہے۔ اب صرف ہم مسجد، مندر اور گرودواروں کی تہذیب کے سائے میں زندہ نہیں رہنا چاہتے ہیں بلکہ ہم کھلی فضا چاہتے ہیں اور یہیں سے افسانے کا دوسرا تہذیبی منظر شروع ہوتا ہے جو دھماکہ خیز ضرور ہے مگر وہ ایک ذہنی جھٹکا دیا کہ ہمیں بھی اس طرح کے سوچنے کا حق دیتا ہے اور ہم اس حق سے دست بردار نہیں ہوں گے اس جھٹکے کا نام 'انگارے' ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت مستند افسانہ نگاروں کا نہیں ہے لیکن جو لوگ ہیں پوری طرح متعارف ہیں اور ہم ان کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں اس لیے کچھ لوگوں نے ان پر ناک بھوں چڑھایا، کچھ لوگوں نے ناملائم الفاظ کا استعمال بھی ان کے لیے کیا لیکن ہمارے قلم کار اس کشمکش میں مبتلا ہوگئے کہ ہم

کرشن چندر نے موضوعات کے انتخاب میں انفرادیت تو برتی ہی لیکن انھوں نے ایک اور تجربہ بھی کیا کہ روایتی زبان کو جدید لب و لہجے سے ہم آہنگ کیا تو اس خوبصورت زبان سے اظہار کو بڑی تقویت ملی اور اب ہمارے سامنے صرف پریم چند کے گاؤں اور زمینداروں کی دہشت کا ہی ماحول نہیں تھا بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقے میں جو تہذیبی رنگا رنگی تھی وہ بھی ہمارے افسانے میں شامل ہو گئی۔ پنجابی زبان کی کشش بھرے ٹکڑے' کشمیری لہجے کی کھنک اور یوپی کے تہذیبی رویوں کی کھنک جب ہمارے افسانوں کی زبان کو ملی جس کا بڑا فائدہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے اٹھایا اور ایک سجی سجائی با محاورہ زبان وجود میں آئی۔

کیا کریں اور یہ وہ مسئلہ تھا جس نے اردو افسانے کے منظر نامے کو بلندیوں سے ہم کنار کر دیا اور اب ہم موضوع کے انتخاب کے لیے آزاد ہوگئے۔ یہاں تک کہ افسانے کے ساتھ ساتھ ناول میں بھی گھسے پٹے موضوعات کو ترک کیا گیا زمیندارانہ نظام کے خلاف آواز اُٹھائی اور رئیسوں کی من مانی کے نتیجے پر معاشرتی ناہمواری پریم چند نے بلا جھجک لکھنے کی تحریک چلائی۔ پریم چند کا افسانہ 'منتر' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ اس افسانے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پریم چند کے گرد جو روایت کی زنجیریں بندھی تھیں کٹ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کے انھیں کا افسانہ 'نجات' سامنے آیا اور 'کفن' نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

کرشن چندر نے موضوعات کے انتخاب میں انفرادیت تو برتی ہی لیکن انھوں نے ایک اور تجربہ بھی کیا کہ روایتی زبان کو جدید لب و لہجے سے ہم آہنگ کیا تو اس خوبصورت زبان سے اظہار کو بڑی تقویت ملی اور اب ہمارے سامنے صرف پریم چند کے گاؤں اور زمینداروں کی دہشت کا ہی ماحول نہیں تھا بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقے میں جو تہذیبی رنگا رنگی تھی وہ بھی ہمارے افسانے میں شامل ہوگئی۔ پنجابی زبان کی کشش بھرے ٹکڑے' کشمیری لہجے کی کھنک اور یوپی کے تہذیبی رویوں کی کھنک جب ہمارے افسانوں کی زبان کو ملی جس کا بڑا فائدہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے اٹھایا اور ایک سجی سجائی با محاورہ زبان وجود میں آئی۔ 'مہا لکشمی کا پل' صرف ایک ایسا پل نہیں ہے جس پر مختلف رنگ کی ساڑیاں ٹنگی ہوئی ہیں بلکہ کرشن چندر نے اسے ایک تہذیبی منظر بنا دیا ہے۔ اس پل کا وجود ایک دھڑکتا ہوا افسانہ بن گیا ہے جسے بلا شبہ کرشن چندر کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بیدی کے یہاں شروعات تہذیب اور روایت کے ملے جلے موضوعات سے ہوتی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'بھولا' ایک معصوم بچے کی نفسیاتی گرہیں نیز ہماری روایتی تہذیب کے عکس کو بہت موثر انداز میں پیش کرتی ہیں اور پھر وہ افسانہ جو بے حد مقبول ہوا 'گرم کوٹ' اُس نے بیدی کو اونچے زینے تک پہنچا دیا اور سماج کی کسمپرسی کو ایک خوبصورت زبان عطا کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وہ افسانہ یادگار افسانہ بن گیا۔ یہاں جو تہذیبی منظرنامہ ہے اس کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔ روایت کی بھی اور عہد حاضر کی بھی اور ہمارے سامنے پوری انسانی زندگی کا ایک تصور پیدا ہو جاتا ہے۔

عصمت چغتائی نے بڑی جرأت سے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جرأت انھیں رشید جہاں سے یقیناً ملی ہوگی لیکن پھر عصمت چغتائی آگے بڑھتی گئیں گویا ادب عالیہ کے طرف گامزن ہوگئیں۔ نسوانی لب و لہجے کو ہمارے اودھ کے حضرات جنسی تلذذ

کے لیے استعمال کرتے تھے مشہور شاعرہ جان صاحبہ نے نسوانی انداز اس لیے استعمال کیا تھا کہ ان کی پذیرائی زیادہ ہوگی لیکن عصمت کے یہاں ایسا لگتا ہے کہ ایک فطری سرچشمہ ابلا چلا آرہا ہے۔ اردوئے معلی نے جو قیمتی ورثہ ہماری زبان کو دیا بلاشبہ اس کو اودھ نے بھی سنبھال کر رکھا لیکن عصمت نے تو اس چنگاری کو شعلہ بنا دیا ان کے اکثر افسانے اس لیے مشہور ہیں کہ اس میں نسائی فکر کی چاشنی بےطرح ہے 'لحاف' ہو 'چوتھی کا جوڑا' ہو یا ان کا کوئی بھی مشہور افسانہ پڑھیے تو پڑھنے کے بعد بہت سے جملے گھنٹوں آپ کے ذہن میں کلبلاتے رہیں گے اور آپ محظوظ ہوتے رہیں گے۔ ترقی پسند افسانوں کو عصمت نے واقعی تروتازگی بھی دی۔ مواد کی شدت بھی دی اور تہذیب کے وہ مناظر جو چہار دیواری میں بند تھے اسے بڑی خوبصورتی سے منظر عام پر لایا اور کھلی فضا اسے دی جس کی وجہ سے بھی ترقی پسند افسانہ مقبولیت کے زینے طے کرتا چلا گیا۔

افسانے کا ایک منظر وہ بھی سامنے آتا ہے جب افسانے کو اپنے انداز میں منٹو پیش کرتے ہیں۔ بعض افسانے تو بڑی سادگی لیے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'جی آیا صاحب'۔ ایک بچے کے ذہن کا مطالعہ بیدی نے بھی کیا تھا 'بھولا' میں کہ دن میں کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اس محض روایتی جملے نے بھولا کی زندگی میں کیا انقلاب پیدا کیا اس کو پیش کرنے میں بیدی نے واقعی کمال کر دکھایا لیکن منٹو نے 'جی آیا صاحب' میں قاسم کے اس کرب کو دکھایا ہے کہ سخت مشقت کے باوجود اسے ایک اچھی سی نیند ملنا دوبھر ہو گیا تھا لیکن جب اس کی انگلی کٹ جاتی ہے' زخم سے خون گرنے لگتا ہے اور مالکن اس سے کہتی ہے کہ پانی کا وہ کوئی کام نہیں کرے ورنہ زخم بھرے گا نہیں یہ اس کے دماغ میں حیرت انگیز ایجاد تھی ایک چھوٹا سا چاقو کا زخم اسے تین دن تک خراٹے کے ساتھ سونے کی اجازت دے دیتا ہے تو اس کے ذہن کی دنیا ہی بدل جاتی ہے اور پھر اسے اپنا ہاتھ ہی کٹوا دینا پڑتا ہے کہ زخم لاعلاج ہو گیا تھا۔ ایک بچے کا اس طرح خون ہوتا ہے یہ ایک نفسیاتی الجھن تھی جو منٹو پیش کرتے ہیں' ایسا ہی ایک افسانہ ڈاکٹر محمد محسن کا بھی ہے کہ جس میں گورکن کی بیٹی کسی کی موت کی خبر آتے ہی مسکرا پڑتی تھی یہاں تک کہ اپنے بچے کی موت پر بھی اس کے ہونٹوں پر تبسم بھر جاتا ہے۔ 'انوکھی مسکراہٹ' بے شک محمد محسن کا یادگار افسانہ ہے لیکن 'بھولا'، 'انوکھی مسکراہٹ' اور 'جی آیا صاحب' کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منظر نامے صرف ظاہری زندگی کے تبدیل نہیں ہو رہے تھے بلکہ نفسیاتی اور ذہنی مناظر بھی بدل رہے تھے۔

پریم چند نے سماجی منظر نامے کو بدلتے ہوئے دکھایا، کرشن چندر نے جغرافیائی مناظر کی بدلتی خوبصورت تصویریں پیش کی۔ عصمت چغتائی نے زبان کا منظر نامہ بدلا تو بیدی اور منٹو اور محسن نے نفسیاتی مناظر کو بھی بدلتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے دکھلایا۔ منٹو کے بہت سے افسانوں کا ذکر بھی کیا جائے تو اس ذکر سے ہی ذہنی مناظر کی بدلتی ہوئی تصویریں واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً 'بو'، 'کالی شلوار'، 'کھول دو'، 'موزیل'، 'ٹھنڈا گوشت' وغیرہ۔

میرے مضمون کا موضوع نئے افسانے میں تہذیب

کا بدلتا ہوا منظر نامہ ہے۔ اس لیے 1980 کے بعد افسانے میں جو تہذیبی تبدیلی آئی اور ہمارے افسانہ نگاروں نے تہذیب کی تبدیلی کو جس طرح محسوس کیا اپنے افسانوں میں بخوبی برتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے دو افسانوں کا یہاں ذکر کرنا چاہوں گا 'دادا اور پوتا' اور 'کاتیائن بہنیں'۔

'دادا اور پوتا' میں دراصل تین نسلوں کا تصادم ہے۔ دادا جو اپنی زندگی جی چکا ہے اب وہ اپنی آئیڈیالوجی اور طرزِ زندگی اپنے پوتے کو سونپنا چاہتا ہے جبکہ پوتا اکیسویں صدی کا پروردہ ہے اور اپنے ڈھنگ سے زندگی جینا چاہتا ہے۔ باپ جو دونوں کے درمیان جھول رہا ہے میانہ روی اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ ایک طرف اپنے باپ کا فرمانبردار ہے۔ ان کے آرام کا پورا خیال ہی نہیں رکھتا بلکہ جب دادا اپنے پوتے کے بارے میں شکایت کرتا ہے تو ان کی باتیں بھی غور سے سن لیتا ہے مگر وہ کرتا وہی ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ باپ ترقی یافتہ کلچر سے بخوبی واقف ہے لہٰذا اس نے کبھی اپنے بیٹے کی آزادی میں دیوار بننا پسند نہیں کیا۔ 'کاتیائن بہنیں' میں تہذیب کا وہ کریہہ منظر مشرف عالم ذوقی نے دکھایا ہے جسے ہمارا سماج ابھی تک قبول نہیں کر رہا ہے۔ ذوقی نے پہلی بار اس موضوع کو اٹھایا ہے اور اس کا نباہ بھی بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔

''ہاں' ہم لیسبین (Lesbian) ہیں... لیسبین''...... وہ بڑے اطمینان سے ناخون چباتے ہوئے بولی۔

'لیسبین' بھوپیندر پر بہار اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''ہاں میں لیسبین ہوں... لیکن تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے میں کوڑھی ہوں یا ایڈز ہو گیا ہے۔''

''لیکن تم''—— اس کی آنکھیں اب بھی پھٹی پھٹی تھیں۔

''کیوں آتے ہو میرے پاس خوب جانتی ہوں۔ اپنے باپ کو بھی جانتی تھی۔ تمھیں بھی... تمھارے اس پورے مردانہ سماج کو۔ حیران مت ہو۔ بس وہی غلط فہمی پر مبنی روایتیں۔ مرد ہونے کی خوش خیالی یہ احساس اچانک تمھیں ایک بیوقوف راکشس بنا دیتا ہے۔ تم سمجھتے ہو سب تمھاری طاقت کے ماتحت ہیں۔ یہ تمھاری ناسمجھی ہے... سنو بھوپیندر پر بہار... تمھاری بیوی نہیں ہے۔ یہ بات ذہن کی گانٹھ کھول کر نکال کیوں نہیں دیتے کہ تمھاری بیوی دس برس پہلے ہی کھوئی نہیں تھی بلکہ مر چکی تھی اور تم نے مارا تھا اسے''۔

بیگ احساس کا افسانہ 'سانسوں کے درمیاں' میں بھی باپ بیٹے کے کردار میں بازار واد کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ باپ پر دل کا دورہ پڑتا ہے اور شہر کے مشہور اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ اس ہسپتال کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے بیٹا اپنی حیثیت سے اوپر اٹھ کر اپنے لیے اچھے کپڑے خریدتا ہے' بیوی کے لیے میکسی' بیٹی کے لیے جینس پینٹ اور ٹی شرٹ۔ کھانا ہوٹل سے آنے لگا۔

رات دیر گئے تک ٹی وی دیکھنا یعنی صرف ہسپتال کی وجہ سے زندگی بدل گئی۔

''ڈاکٹر کے جانے کے بعد بیوی نے کہا——

''کچھ پیسے چاہیے۔''

''کیوں؟''

''بیوٹی پارلر جاؤں گی''

''بال بنواؤں گی........ اس لمبی ڈاکٹر کی طرح........آئی بروز بھی بنوانا ہے۔ مینی کیور پیڈی کیور........''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہاں رہنے تک تو بھرم رکھنا ہوگا نا؟''

وہ چپ ہوگیا اس کی بیوی نے پیسوں کے بنڈل سے کتنے نوٹ نکالے اس نے دیکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ بیوی پیسہ لے کر چلی گئی۔

بیگ احساس نے اس افسانے میں نمائشی دنیا میں جینے والے لوگوں پر طنز کیا ہے۔ موجودہ دور میں بازار واد اس طرح حاوی ہو گیا ہے کہ نمائشی زندگی جینے کی وجہ سے وہ مقروض ہو جاتا ہے اور سبھی رشتے دار ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ زندگی اجیرن بن جاتی ہے وہ آدمی جس کی وجہ سے یہ سب نمائش کی گئی آخر میں وہ مر بھی جاتا ہے۔

معین الدین جینا بڑے 'رنگ ماسٹر' میں آج کے بدلتے تہذیبی منظر نامے کو پیش کیا ہے جس میں انسان سرکس کے شیر کی طرح ہو گیا ہے اور کوئی اس پر رنگ ماسٹر کی طرح کوڑے برسا رہا ہے۔ خورشید اکرم نے ''ایک غیر مشروط معافی نامہ'' میں تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار کو بہت مؤثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ عام طور پر گھر کی نوکرانی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اس افسانے کی بنیاد اسی رویہ پر قائم ہے۔ وہ شخص جو سماج کے ظلم وستم، مساوات اور موجودہ نظام سے نبرد آزما ہے اپنے دوست کی ملازمہ کے ساتھ منہ کالا کر کے اپنے کو گناہگار تسلیم کرتا ہے اور خود اپنے لیے ایک سزا تجویز کرتا ہے۔ اس افسانے میں متضاد صورت حال پیدا کی گئی ہے۔ اوّل تو یہ کہ جو کردار جبر اور استحصال کے خلاف لڑ رہا ہے، سماج واد کا نعرہ بلند کیے ہوئے ہے وہ جنسی اعتبار سے بے حد کمزور ہے اور مایا کے سوئے جسم کو دیکھ کر اس کے اندر کا مرد جاگ جاتا ہے۔ یہ فطری عمل ہے، ایسا کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے مگر وہ شخص فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے اور خود سے اپنے لیے ایک سزا تجویز کرتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار شاید یہ دکھانا چاہتا ہے کہ سماج واد کا نعرہ دینے والے لوگ عملی طور پر کتنے کمزور ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہمارے سماج کا ایک المیہ ہے۔

غضنفر کا افسانہ 'خالد کا ختنہ' اور 'تصویر تختِ سلیمانی' میں موجودہ تہذیب کا وہ کریہہ چہرہ دکھایا ہے جس سے انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ پیغام آفاقی نے موجودہ حالات' ماحول اور سماج کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور ایک خاص زاویہ نگاہ سے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اپنے افسانے کے ذریعے قارئین کو دکھایا بھی ہے۔ نورالحسنین کے افسانے 'پچھلے پہر کی خوشبو'، 'دوسرے کنارے تک' اور 'گڑھی میں اترتی شام' تہذیب سے پیوست ہیں۔ ان افسانوں میں ماضی و حال کا اتار چڑھاؤ اور ہمارا حقیقی ماحول گردش کرتا نظر آتا ہے۔ نورالحسنین جہاں ایک طرف غربت اور افلاس زدہ لوگوں کی کشمکش کو پیش کرتے ہیں وہیں دوسری طرف شہری زندگی اور انکے مسائل کو بھی اپنے افسانے کے ذریعے اٹھاتے ہیں۔ جہاں اقدار پامال ہورہے ہیں' رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور انسانیت آنسو بہا رہی ہے۔

معین الدین جینا بڑے 'رنگ ماسٹر' میں آج کے بدلتے تہذیبی منظر نامے کو پیش کیا ہے جس میں انسان سرکس کے شیر کی طرح ہو گیا ہے اور کوئی اس پر رنگ ماسٹر کی طرح کوڑے برسا رہا ہے۔ خورشید اکرم نے "ایک غیر مشروط معافی نامہ" میں تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار کو بہت مؤثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ عام طور پر گھر کی نوکرانی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اس افسانے کی بنیاد اسی رویہ پر قائم ہے۔

خالد جاوید کے افسانے زیادہ تر نفسیاتی ہوتے ہیں لیکن 'عکس نا آفریدہ' میں شوہر بیوی کے رشتے کی نزاکت کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بیوی حاملہ ہے شوہر کا ذہن میلا ہے وہ بیوی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہونے والے بچے کی شکل کو کئی زاویے سے دیکھتا ہے۔ شوہر بیوی کے نازک رشتے کو خالد جاوید نے اس افسانے میں نمایاں کیا ہے۔

ابن کنول کے افسانوں کی شناخت ان کا داستانوی اسلوب ہے لیکن ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'بند راستے' ہے جو موجودہ سیاسی نظام کی خرابیاں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی مسائل اور خانگی الجھنیں اس مجموعے میں شامل افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ انجم عثمانی نے اپنے افسانہ 'شہر گریہ کا مکیں' میں اس ذہنیت کا نوحہ قلم بند کیا ہے جس کے تحت ہماری اپنی مٹی ہمارے لیے اجنبی ہو جاتی ہے۔

اسلم جمشید پوری اپنے افسانوں کے لیے سماج کے چلتے پھرتے اور ٹوٹتے بکھرتے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں جس میں ہماری تہذیب کا وہ منظر سامنے آتا ہے جو اکثر ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ وہ کرداروں کو اپنے ماحول میں اپنے طور پر جینے کی آزادی بھی دیتے ہیں۔ 'مشین کا پرزہ' میں آج کی مشینی زندگی کو بہت ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ افسانہ 'یہ ہے دلّی میری جان' میں فقیروں کی غنڈہ گردی کو بہت تلخ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ تہذیب کا گرتا ہوا معیار ہی ہے جہاں شریف انسان ان فقیروں کے چنگل میں پھنس کر دو چار سو روپیہ اپنی جیب سے نکال ہی دیتا ہے اور رسوائی الگ ہوتی ہے۔

مظہر سلیم نے 'اندر کا آدمی' میں انسان کے اندر کے خوف کو موجودہ حالات میں پیش کیا ہے جبکہ 'باگھ مارنے' میں آج کے نظام کے خلاف احتجاج ہے۔ معین الدین عثمانی نے اپنے افسانہ 'نئے سورج کا پجاری' میں آج کی بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں پر گہرا طنز کیا ہے جبکہ 'واپسی' میں مشینی زندگی کے خلاف ایک خاموش احتجاج ہے۔ اختر آزاد کے افسانے 'ایک سمپورن انسان کی گاتھا'، 'ہم کہاں جائیں بابولال'، 'پانی' یا 'پانو سے جوتے کے درمیاں کی دوری' میں ماحول کی حقیقت نگاری موجود ہے۔ راقم الحروف کے کئی افسانوں میں تہذیب کی بنتی بگڑتی ہوئی تصویریں ہیں جو عام انسان سے روپوش رہتی ہیں۔ 'انا کو آنے دو' میں نکسلی موومنٹ کو پہلی بار اردو افسانے میں پیش کیا ہے۔ 'تعفن'، 'ڈوبتا ابھرتا سورج'، 'پناہ گاہ' میں پہلی بار دلت سماج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'مسیحائی'، 'منڈیر پر بیٹھا پرندہ'، 'کچھ بھی تو نہیں بدلا'، 'درمیاں کوئی تو ہے' ایسے افسانے ہیں جس میں آج کی تہذیب' آج کے سماج کا وہ چہرہ ہے جسے یکسر ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خورشید حیات کا افسانہ 'آدم خور' میں اس پرانے قبیلے کی یاد دلاتا ہے جہاں ایک آدمی پورے قبیلے پر حکومت کرتا تھا' ظلم اور استحصال کرتا تھا اور کوئی بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تھا۔ آج وہی آدم خور ہر گھر میں موجود ہے۔ انسان کا خون ہو رہا ہے اور کوئی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا رہا ہے۔ خورشید حیات کے دوسرے افسانے 'پانچ انگلیاں'، 'طوفان سے پہلے طوفان کے بعد' میں آج کی تہذیب اور سماج کی عکاسی نظر آتی ہے۔

■

Dr. Ahmad Sagheer, Anugarah Memorial College, Katari Hill Road, Gaya - 823001

اردو نعت گوئی
ایک جائزہ

منیر حسین حرہ

نعت عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی مدح، ثنا، تعریف وتو صیف کے ہیں یعنی ''اچھی اور قابل تعریف صفت کا کسی شخص میں پایا جانا۔ان صفات کا بیان کرنا'' شعری اصطلاح میں ''ایسے اشعار جن میں نبی اکرمؐ کی مدح وستائش اور اوصاف بابرکت کا ذکر ہو اسے نعت یا نعتیہ اشعار کہلاتے ہیں۔'' ایک معنی حمد بھی ہے لیکن اہل علم اور اہل قلم حضرات نے لفظ 'حمد' اللہ تعالیٰ کی تعریف کے لیے اور 'نعت' حضور اکرمؐ کی تعریف وتو صیف کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ مثنوی نگاروں نے مثنویوں میں یہ رسم جاری کی کہ مثنوی کا آغاز حمد ونعت اور منقبت سے کیا جائے۔اس کی پیروی تمام ہندو اور مسلم شعرا نے دل و جان سے کی اور یہ آج بھی جاری ہے اور تمام مثنویوں میں یہ نمونے ملتے ہیں۔مثلاً میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' میں حمد کے 38 اشعار ملتے ہیں۔پہلا شعر بطور نمونہ پیش ہے:

کروں پہلے تو حید یزداں رقم   جھکا جس کے سجدے کو اول قلم

اسی مثنوی میں نعت کے 29 اشعار ملتے ہیں جس کا پہلا شعر اس طرح ہے:

نبیؐ کون؟ یعنی رسول کریم   نبوت کے دریا کا در یتیم

نعت عربی سے لے کر اردو تک ایک الگ صنف شاعری ہے۔مگر اس میں دوسری اصناف سخن کی طرح ہیئت کی کوئی قید نہیں ہے۔بلکہ غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، آزاد نظم کی ہیئت میں بھی نعتیں قلم بند کی گئی ہیں۔عربی، فارسی اور اردو میں صنف نعت صرف حضور اکرمؐ کی تعریف میں رائج اور جاری رہی بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں اور بولیوں میں بھی یہ صنف رائج اور مقبول رہی۔رسول خداؐ کی ذات اقدس کی تعریف وتوصیف نظم اور نثر دونوں میں بیان کی گئی ہیں۔لیکن ہماری مراد نظم سے ہے جس میں بے شمار شعرا نے گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں۔

سب سے پہلے نعت عربی زبان سے فارسی اور ترکی زبان میں منتقل ہوئی اور دونوں ادب میں اس کا رواج عام ہوا اور رفتہ رفتہ دنیا کی تمام زبانوں میں نعت کہی جانے لگیں۔ اس کا اثر سب سے زیادہ مسلمان ممالک میں پڑا اور جہاں جہاں اسلام کا نور پھیلتا گیا وہاں وہاں نعت و منقبت کا بڑا اثر رہا ہے۔ اور حضور سے عقیدت کا خراج پیش کرتے رہے۔

صنف نعت رسول خداؐ کی زندگی میں ہی وجود میں آئی تھی۔سب سے پہلے حضرت ابو طالبؑ نے رسول خداؐ کی شان میں نعت کہی ہے۔اس طرح تاریخ میں سب سے پہلے نعت گو حضرت ابو طالبؑ ہیں۔اس کے بعد اصحاب کرام نے بھی حضورؐ کے ساتھ عقیدت ومحبت کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہیں۔حضرت فاطمہ زہراؑ نے بھی اپنے بابا جان جناب رسول خداؐ کی شان میں نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ڈاکٹر عمر فاروق لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ خود حضورؐ نے اپنی حیات طیبہ میں کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ، کعب بن مالک اور حسان بن ثابت وغیرہ سے اپنی نعتیں سماعت فرمائی تھیں''

(اصطلاحات نقد: ڈاکٹر عمر فاروق، ص262)

جہاں تک نعت کا تعلق ہے خود باری تعالیٰ نے اپنے حبیب جناب رسولؐ خدا کی تعریفیں کیں۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے رسولؐ کی شان میں تعریف کی۔جو جا بجا قرآن مجید کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

سب سے پہلے نعت عربی زبان سے فارسی اور ترکی زبان میں منتقل ہوئی اور دونوں ادب میں اس کا رواج عام ہوا اور رفتہ رفتہ دنیا کی تمام زبانوں میں نعت کہی جانے لگیں۔ اس کا اثر سب سے زیادہ مسلمان ممالک میں پڑا اور جہاں جہاں اسلام کا نور پھیلتا گیا وہاں وہاں نعت ومنقبت کا بڑا اثر رہا ہے۔اور حضور سے عقیدت کا خراج پیش کرتے رہے۔بقول ڈاکٹر نسیم اقتدار علی:

''حبشی زبان میں بھی نعت گوئی کے کچھ اچھے نمونے پائے جاتے ہیں'' (رسالہ نیا دور لکھنؤ، اپریل 2009، ص4)

اردو شاعری نے فارسی ادبیات کی تقلید کی اور ہر اصناف میں فارسی زبان نے اردو شاعری کی آبیاری کی۔فارسی میں جتنی اصناف تھیں وہ اردو میں منتقل ہوتی تھیں۔اس کا خاص اثر وہاں سے آئے ہوئے علما، بادشاہ وغیرہ کا رہا ہے۔وہ اپنے ساتھ وہ تمام چیزیں لائے جو وہاں رائج تھیں۔اردو جاننے والوں نے ان چیزوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔یہ مسلم ہے کہ اردو میں نعت کے نمونے ابتدائی دور سے ہی صوفی شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔مگر اردو میں نعت کا آغاز کب اور کس نے کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی رقم طراز ہیں:

''اس سلسلے میں پہلا نام خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینیؒ کا آیا ہے۔ہمیں ابتدائی نعت کا جو نمونہ اردو میں ملتا ہے وہ انھیں سے منسوب ہے۔ان کا انتقال 1422 میں ہوا تھا۔گویا اردو میں نعت گوئی کا سلسلہ پندرہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے شروع ہو گیا تھا۔'' (رسالہ نیا دور لکھنؤ، اپریل 2009، ص4)

یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ خواجہ بندہ نواز کی درگاہ گلبرگہ کرناٹک میں ہے۔ جو حیدر آباد سے تقریباً 200 کلومیٹر دور ہے۔گلبرگہ کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔خواجہ صاحب کا سلسلہ نسب امام زین العابدینؑ سے ملتا ہے۔یہ شجرہ گنبد خواجہ صاحبؒ کی دیوار پر کندہ ہے اس کے علاوہ گنبد کے اندرونی حصے میں ناد علی بھی کندہ ہے۔خواجہ صاحبؒ کی نعت کے چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے ہیں:

اے محمدؐ جل وجَسم جَسم جلوہ تیرا   ذات تجلی ہوے گی سیس سپورنہ سہرا
لولاک لما خلقت الافلک خالق بالائے   فاضل افضل جتنے مرسل ساجد مسجود آئے
امت رحمت بخشش ہدایت تشریف پائے

اردو میں خواجہ کے بعد نعت گوئی میں جو نام سامنے آتا ہے وہ حیدر آباد دکن کے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کے تیسرے بیٹے محمد قطب شاہ کا ہے۔ان کی تخت نشینی 1580 میں ہوئی اس نے اکتیس سال تک حکومت کی اور 1611 میں سینتالیس سال کی عمر میں

وفات پائی۔اردو کی ترقی و ترویج میں دکن کی سرزمین سرفہرست اور خاص کر وہاں کے بادشاہوں اور درباریوں کا اس زبان سے تعلق رہا ہے۔خود ان بادشاہوں نے شاعری کو بڑھاوا دیا اور مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔دکن کا سب سے پہلا شاعر قلی قطب شاہ ہے جس نے شاعری کی مختلف اصناف پر قلم اٹھایا۔صنف نعت میں بھی انھوں نے اپنے نقوش چھوڑے۔مسعود حسین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ہر چند محمد قلی اپنے مقطعوں میں 'نبی صدقے' کے فقرے کو مکرر لایا ہے اور ایک طرح سے اسے 'ٹیک' سا بنا لیا ہے لیکن شان رسولؐ میں وہ کوئی بڑا نقش پیدا نہیں کرسکا۔ پانچ نعتیں جو کلیات میں شامل ہیں معمولی شاعری کی مثال پیش کرتی ہیں کہیں کہیں ایسے اشعار مل جاتے ہیں:

با تاں گھرسیاں نر، لیاں واریا جو تیرے نانوں پر
سو جائے کر آسماں پر ہر یک بجن تارا ہوا''

(محمد قلی قطب شاہ: مسعود حسین، ص 37)

اس کے علاوہ قلی قطب شاہ کی شاعری کی خاصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری سے قدیم دور کی دکنی اردو کا پتہ چلتا ہے۔چند اشعار بطور نمونہ ہیں:

اسم محمدؐ تھے رہے، جگ میں سو خاقانی مجھے
بندہ نبی کا جم رہے، سہنی ہے سلطانی مجھے
شاہان غروری ٹھاؤں تھے، کرتے ہیں اپنی دھاؤں تھے
مستی مری تج ناؤں تھے، کہتی ہے دیوانی مجھے
شاہان منے بھومان تھے، کرنا بڑائی جان تھے
انپڑیا علیؓ کے دان تھے، تشریف شاہانی مجھے

قلی قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے بھی نعت لکھی ہیں۔ان کے زمانے میں بھی شعر و شاعری کو خوب فروغ ہوا۔عبداللہ قطب شاہ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے۔ان کا انتقال 1672 میں ہوا تھا ان کے چند نعتیہ اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمدؐ کا — آفاق صفا پایا دن دین محمدؐ کا
جو بارہ اماماں ہیں لاکھاں ان پہ سلاماں ہیں — ہم ان کے غلاماں ہیں دن دین محمدؐ

اس کے بعد جب اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو نعت گوئی میں ولی دکنی کا نام خاص طور پر آتا ہے۔دراصل ولی سے ہی باقاعدہ طور پر اردو شاعری کی ابتدا ہوئی اور انھیں اردو شاعری کا بابا آدم کہا گیا ہے۔خاص طور سے جب ان کا کلام دلی پہنچا تو وہاں کے شعرا جن میں زیادہ تر فارسی گو شعرا شامل تھے اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور اردو کا اثر قبول کیا۔ولی دکنی کی عظمت یہ ہے کہ وہ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ان کی اردو شاعری کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''ولی اردو شاعری میں ایک طرز خاص کے مالک ہیں۔ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی معنویت اور ان کے طرز ادا میں عجیب و غریب دل کشی پائی جاتی ہے۔کچھ عرصے سے ان کی زندگی اور شاعری کے مطالعے میں بڑی دلچسپی لی جارہی ہے۔خصوصاً دکن میں ان کے متعلق خاصا کام ہوا ہے۔جو قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے جس کی وجہ سے ولی کے رتبہ شناسوں اور مداحوں کو ان کے کلام کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔'' (ولی سے اقبال تک: ڈاکٹر سید عبداللہ، ص 13)

غزل میں ولی نے جو ہر دکھائے ہیں اور اسی کے ساتھ زیادہ تر وابستہ رہے مگر دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ان میں نعت بھی شامل ہیں نعت کے چند اشعار پیش کئے گئے ہیں:

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے — ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے
یا محمدؐ دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں — خلق کو لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے
عارفاں بولیں گے جان و دل سے لاکھوں آفریں — جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

دکنی سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں سے بلند پایہ شعرا پیدا ہوئے جن کے کارنامے آج بھی دل و جان سے یاد کیے جاتے ہیں۔ایک مشہور شاعر سراج اورنگ آبادی بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا اصلی نام سید سراج الدین۔آپ سادات حسینی مشائخ سے تھے۔آپ کا انتقال 1763 میں ہوا۔صنف نعت میں بھی بیش بہا جوہر چھوڑے ہیں۔نمونہ کلام کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

نام تیرا مطلع فہرست ہے دیوان کا — ہے زباں کا ورد خاصا اور وظیفہ جان کا
کر سراسر شوق میں بے ہوش مجھ کو یا حبیبؐ — دے مجھے بھر کر پیالہ نشۂ عرفان کا

دکن میں جہاں اردو شاعری کا چلن مقبول عام ہوا وہیں اس کا اثر پھیلتے ہوئے اور قبول کرتے ہوئے دہلی اس کا خاص مرکز بن گیا۔دہلی میں جتنے شعرا اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ان میں تقریباً ہر شاعر نے نعت کہی ہے اور جناب رسولؐ کی شان میں عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔یہ شاید انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس کا دل زندہ ہو وہ ضرور رسولؐ و آل رسولؐ کی مدح میں کچھ نہ کچھ نقش کرتا ہے۔اس کے بغیر اس کا پیمانہ نظر نہیں آتا ہے۔یہ ایک ایسا طریق حیات ہے جو آخرت کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔مرزا محمد رفیع سودا متوفی 1718۔یہ میر تقی میر کے عہد کے دوسرے بڑے شاعر ہیں۔سودا دراصل قصیدے کے شاعر ہیں۔نعت گوئی میں بھی طبع آزمائی کی۔نمونہ کلام اس طرح ہیں:

دلا دریائے رحمت قطرہ ہے آب محمدؐ کا — جو چاہے پاک ہو پیرو ہو اصحاب محمدؐ کا
ہوا ہے کیا کچھ اہل بیتؐ پر سودا نہ دم مارا — خدا بن کون ہے آگاہ آداب محمدؐ کا

مثنوی نگاروں نے مثنویاں تحریر کرتے وقت یہ خیال ضرور رکھا ہے کہ مثنوی کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے ہو۔انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کا ثبوت دیا۔بلند پایہ مثنوی نگار میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی 'سحرالبیان' کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے کیا۔ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق میر حسن دلی کے محلّہ سید واڑہ میں 1153 مطابق 42-1741 کے آس پاس پیدا ہوئے اور غرہ محرم 1201 مطابق 24 اکتوبر 1786 کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔(بحوالہ مثنوی سحرالبیان، میر حسن، اترپردیش اردو اکادمی، تیسرا ایڈیشن 1995) میر حسن کی اس مثنوی سے نعت رسول کے چند اشعار ذیل میں درج کیے گئے:

نبیؐ کون؟ یعنی رسول کریمؐ — نبوت کے دریا کا دُرِ یتیم
ہوا گو کہ ظاہر میں اُمی لقب — پہ، علمِ لدُنی کھلا دل پہ سب
بغیر از لکھے، اور کیے بے رقم — چلے حُکم پر اُس کے لوح و قلم

جہاں فیض سے ان کے ہے کامیاب نبی آفتاب و علی ماہتاب دیاشنکر نسیم لکھنوی نے بھی اپنی مثنوی 'گلزار نسیم' میں اللہ اور رسول و آل رسول کی خدمت میں عقیدت کے گل کھلائے۔دیاشنکر نسیم 1811 میں پیدا ہوئے اور 1845 اس دنیا سے اٹھ گئے۔

غزل کے امام، اردو کے سب سے بڑے شاعر میر تقی میر نے اگرچہ غزل میں اپنا کارنامہ انجام دیا مگر سب سے پہلے تو مرثیہ، نعت و منقبت میں طبع آزمائی کی۔ان کی ولادت 1712 وفات 1781۔نعتیہ کلام کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

جرم کی کھو شہ مگینی یا رسول اللہؐ — اور خاطر کی حزینی یا رسول اللہؐ
کھینچوں ہوں نقصان دینی یا رسول اللہؐ — تیری رحمت ہے یقینی یا رسول اللہؐ
رحمۃ اللعالمینی یا رسول اللہؐ — ہم شفیع المذنبینی یا رسول اللہؐ

ایک زمانہ ایسا بھی آیا ہے جو تاریخ کے اوراق میں اپنا وہ منظر دکھاتا ہے یعنی جب دہلی میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ان حالات نے نہ صرف انسان کے رہن سہن

اوران کے دلوں کو توڑ کے رکھ دیا بلکہ انسانی فکر اور سب سے اہم سرمایہ شاعری کو بھی درہم برہم کر دیا۔ ان ہولناک مناظر کو دیکھ کر بڑے بڑے صاحبان علم وفن نے ہندوستان کے دیگر شہروں کا رخ کیا جہاں پر امن وامان کا کچھ اثر قائم تھا ان میں لکھنؤ خاص مقام رکھتا ہے۔ ان شہروں میں ادبی مراکز پر نئی رونق آئی۔ آہستہ آہستہ جب حالات بدلے تو ایک بار پھر اجڑی ہوئی دہلی نے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ادب کو ایک نئی رونق بخشی اور ادبی مرکز کو نئے سرے سے زندہ کیا۔ جہاں ذوق، مرزا غالب، مومن اور داغ دہلوی افق شاعری پر چمک اٹھے۔ ایسے بھی شعرا گزرے جنھوں نے دہلی کے حالات سے تنگ آ کر لکھنؤ چل کر سکون حاصل کیا۔ ان میں میر حسن، میر تقی میر اور انشاء اللہ خاں انشا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشا 1752 میں مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور 1817 میں انتقال کر گئے۔

لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر شیخ قلندر بخش جرأت ولادت 1749 متوفی 1810 دبستان لکھنؤ کی بنیاد رکھنے والوں میں یہ ایک خاص نام ہے۔ ان کے نعتیہ کلام کا نمونہ پیش خدمت ہیں:

رکھے ہے منزلت یہ آسان سرور عالم   کہ فخر سلطنت ہے مرتبہ داں کی گدائی کا
اسی کے عشق میں پابند الفت رہ دلا ہر دم   کہ ہووے گا یہی روز جزا موجب رہائی کا

شیخ غلام ہمدانی مصحفی ولادت بقول حسرت موہانی 1164 ہجری متوفی 1240 ہجری مطابق 1824۔ مصحفی اردو کے پرگو شاعر اور بہت بڑے مصنف ہیں۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ اردو شعرا کے دو تذکرے لکھے۔ فارسی کے علاوہ اردو شاعری کے آٹھ دیوان بھی چھوڑے۔ انھوں نے تذکرہ، غزل، قصیدہ، مثنوی اور دیگر اصناف میں مقام حاصل کیا۔ نعت میں ان کا خاصا کلام موجود ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

محمد عربی معجزوں کا جس کے کبھی   نہ کر سکے فلک پیر کا شمار انگشت
چمن میں اس کی رسالت کا جب کچھ آئے ہے ذکر   علم کرے ہے شہادت کی شاخسار انگشت
کرے جو وصف وہ اس تاج انبیا کی رقم   قلم کی جوں نئے نرگس ہو تا جدار انگشت

نظیر اکبر آبادی اصل نام شیخ ولی دہلی میں 1740 میں پیدا ہوئے اور پھر آگرہ میں زندگی بسر کی۔ ان کا انتقال نوے برس کی عمر میں 1830 میں ہوا۔ شاعری میں کمال حاصل کیا اور صنف نعت سے آخرت کا سکون حاصل کیا۔

شیخ امام بخش ناسخ 1771 کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انھیں بچپن میں ہی لکھنؤ کی سرزمین کی بو آئی اور وہیں چلے گئے۔ ان کا انتقال 1838 میں لکھنؤ میں ہوا۔ ان کو زیادہ تر اصلاح زبان کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے اصلاح زبان کے اصول وضع کیے اور اردو میں ایک نئی راہ نکالی۔ ان کے نعتیہ کلام سے بھی زبان کی صفائی کا پتہ چلتا ہے۔

بلھے شاہ ایک صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ان کا دوسرا نام میر بہلی شاہ بھی تھا۔ یہ پنجاب سند کے ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ شاہ عنایت کے مرید ہوئے تھے اور بلھے شاہ بحیثیت صوفی شاعر مشہور ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا مصدقہ ذریعہ نہیں ملتا۔ تاہم علمائے ادب اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی سال ولادت 1680 اور سال وفات 1758 ہے۔ بقول سریندر کوہلی ''بلھے شاہ کی ولادت اورنگ زیب کے دور حکومت کے 21 ویں سال میں ہوئی۔ جب اورنگ زیب کی وفات ہوئی تو بلھے شاہ کی عمر 27 برس تھی۔ بلھے شاہ کے دل میں خدا اور رسول کے عشق کی آگ روشن تھی۔ انھوں نے اپنے کلام میں خدا اور رسولؐ کی شان بیان فرمائی۔ یہاں ان کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس سے ان کے مذہبی فلسفے کا بھرپور پتہ چل سکے:

احد احد وچ فرق نہ بلھیا   اک رتا بھیت مروڑی دا
عین غین دی ہکا صورت   وچ نقطے شور مچایا ہے
تسی سبھانی بھکی تھیندے ہو   تم تمام بھیوں میں موجود ہو
تم ہر جگہ دکھائی دیتے ہو

اسماعیل میرٹھی شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ انھوں نے کثرت سے دونوں اصناف میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی میں بھی تصنیف وتالیف کا کام کیا ہے۔ ان کی ولادت 12 نومبر 1844 کو میرٹھ کے ایک محلے مشائخان میں ہوئی۔ 1857 کی جنگ آزادی کا آغاز اسی شہر سے ہوا تھا۔ اسماعیل کا انتقال یکم نومبر 1917 میں 73 سال کی عمر میں ہوا۔ انھوں نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ اور غزل کی ہیئت میں ہی حمد ونعت منقبت وغیرہ کا خاصا کلام موجود ہے۔ اسماعیل ایک صوفی شاعر تھے۔ ذیل میں ان کے صوفیانہ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ذرہ ذرہ حیرتی ہے مہر پرتنویر کا   بے خودی آئینہ ہے ہنگامہ تکبیر کا
ہے مسلم نازیکتائی اسے ہر رنگ میں   جلوہ نقش آفریں خاکہ ہو جس تصویر کا

دبستان لکھنؤ کے تمام شعرا نے نعت کہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ومقبول اور سرفہرست میر انیس اور مرزا دبیر ہیں۔ ان دونوں نے صرف مرثیہ میں گلہائے عقیدت کھلائے۔ نعت اور منقبت مرثیہ کا حصہ بھی رہا ہے۔ دبستان دہلی میں حکیم مومن خاں، ذوق، بہادر شاہ ظفر، مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں اور خاص کر داغ دہلوی کا نام بھی ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ داغ کی پیدائش 1831 اور وفات 1905 میں ہوئی۔ ان تمام شاعروں نے نعت قلم بند کی ہیں البتہ نعت گوئی میں خاص مقام حاصل نہیں ہے داغ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

کرو غم سے آزاد یا مصطفیٰ   تمھیں سے ہے فریاد یا مصطفیٰ
زباں پر ترا نام جاری رہے   کرے دل تری یاد یا مصطفیٰ
رہوں حشر میں آپ کی ذات سے   طلب گار امداد یا مصطفیٰ

داغ دہلوی کے ہم عصر شاعر بھی تھے۔ ان میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی قابل ذکر ہیں۔ امیر مینائی 1826 لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وفات 1900 میں ہوئی۔ ان کا اصل نام امیر احمد تھا۔ امیر مینائی کے نعتیہ کلام کے چند اشعار بطور تبرک پیش ہیں:

سکہ رائج جب سے دین مصطفیٰ کا ہو گیا   غلغلہ ساری خدائی میں خدا کا ہو گیا
جب سے دل دیوانہ محبوب خدا کا ہو گیا   مصطفیٰ اس کے ہوئے اور وہ مصطفیٰ کا ہو گیا
مصطفیٰ اس کے ہوئے اور وہ مصطفیٰ کا ہو گیا   نعت میں ہم نے جو لکھا ایک پرچہ بھی امیر
مل گئی دولت وہ نسخہ کیمیا کا ہو گیا

محسن کاکوروی اس شخصیت کا نام ہے جس نے دوسرے اصناف سخن سے زیادہ صرف نعت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ان کے استاد امیر مینائی رہے ہیں۔ انھوں نے قصیدہ، مثنوی، غزل، قطعہ، رباعی، وغیرہ کو نعت گوئی میں ہی استعمال کیا۔ ان کا میدان صرف نعت گوئی رہا ہے۔ انھوں نے اپنی پرانی روایات کے اثر سے نعتیہ کلام کو اسی رنگ میں پیش کیا۔ یہاں تک کہ ان کی پوری کلیات نعت گوئی پر مشتمل ہے۔ ان کی ولادت 1827، وفات 1905۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل   برف کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہا جن سے ابھی   کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح

■

Muneer Hussain Hurrah, Badgam, Kashmir (J&K)

رئیس الغزل مولانا حسرت موہانی

عبدالحی

حسرت بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور غزل کے رسیا بھی۔ غزل کی جانب ہی جھکاؤ رہا اور غزل کو ہی مشق سخن بنایا اور ادب میں رئیس المتغزلین کہلائے۔ حسرت کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع اُناؤ کے قصبے موہان میں 1881 میں ہوئی تھی۔ والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ حسرت کا پورا نام سید فضل الحسن تھا۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم موہان میں ہوئی پھر میٹرک کی تعلیم کے لیے فتح پور گئے اور 1898 میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے۔ حسرت نے علی گڑھ سے 1903 میں بی اے کیا۔ بی اے کا نتیجہ آنے سے قبل ہی انہوں نے اردوئے معلیٰ کا پہلا شمارہ شائع کردیا تھا۔ حسرت نے اپنے رسالے میں ادبی، مذہبی اور سیاسی مضامین لکھنے شروع کیے اور بہت جلدی ان کا مجلّہ لوگوں میں کافی مقبول ہوگیا۔ حسرت کی شادی نشاط النسا بیگم سے 1901 میں ہوئی تھی۔ صحافتی زندگی کا آغاز کرنے کے بعد انھوں نے اپنی شریک حیات کو بھی علی گڑھ ہی بلا لیا اور مرسل گنج میں سکونت اختیار کی۔ ان کی بیگم بڑی بہادر اور حوصلہ مند عورت تھیں ان کا انتقال طویل علالت کے بعد 18 اپریل 1937 کو کان پور میں ہوا تھا۔ حسرت نے ددوسری شادی 1938 میں کی تھی۔ حسرت بڑے خوددار انسان تھے اور غریبی میں بھی کبھی خودداری سے پیچھے نہیں ہٹے۔ کبھی اپنی بدحالی کا شکوہ زبان پر نہیں لایا۔ مطالعے کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ بڑے بااصول، سچے اور نڈر انسان تھے۔ حسرت موہانی جنگ آزادی کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کیا۔ اس کے لیے وہ آخر دم تک مقابلہ کرتے رہے اور قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں۔ حسرت پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنھوں نے سودیشی تحریک کی شروعات کی تھی اور علی گڑھ میں خلافت اسٹور لمیٹڈ قائم کیا جہاں سودیشی کپڑے فروخت ہوتے تھے۔ اِس بارے میں مولانا شبلی نے کہا تھا:

''تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالی ٹیشین بنے اور اب بنئے ہوگئے۔''

(حسرت موہانی، ص 37)

1945 میں وہ اتر پردیش اسمبلی سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے اور اسمبلی میں کھل کر اپنے سیاسی نظریات کا اظہار کرتے رہے۔ وہ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ حسرت کی صحت 1949 کے بعد آہستہ آہستہ گرنے لگی تھی۔ 1950 میں آخری بار حج کیا۔ اس سے پہلے دس بار حج کر چکے تھے گویا انھوں نے کل گیارہ حج کیے اور مدینہ طیبہ کی زیارت کی۔ وفات سے کچھ عرصے پہلے لکھنؤ آ گئے تھے اور فرنگی محل میں عارضی طور پر سکونت اختیار کرلی۔ اپنی بیماری کے دوران بھی حسرت کا عزم و حوصلہ قابل تعریف تھا۔

''دوا استعمال کرنے اور انجکشن لینے سے بھی بہت الجھتے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے طنزاً کہا کہ مولانا آپ ذرا سی سوئی کی تکلیف سے ڈرتے ہیں۔ اس پر سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ میں اپنی تمام زندگی کسی تکلیف سے نہیں ڈرا، آپکی سوئی سے کیا ڈروں گا۔ مزاحمت اس لیے کرتا ہوں کہ اس کو بیکار سمجھتا ہوں۔

دوران علالت میں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی مرحوم عیادت کے لیے تشریف لائے۔ کلمات تسکین وتشفی کے طور پر کہنے لگے۔ مولانا گھبرائیے نہیں۔ آپ کی علالت خطرناک نہیں ہے آپ اچھے ہوجایئے گا۔ مولانا حسرت اٹھ کر بیٹھ گئے اور جواب دیا۔ سنئے صاحب میں بیمار تو ہوں مگر بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا وقت آ گیا ہے۔''

(کلیات حسرت موہانی۔ حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، نارتھ ناظم آباد کراچی، پاکستان، ص 49)

انھیں اپنی موت کے آنے کا اندازہ ہوگیا تھا۔ 1 جنوری 1951 سے 16 مارچ 1951 تک لکھے روزنامچوں میں انہوں نے اپنی علالت اور موت کا تذکرہ کیا تھا۔ 13 مئی 1951 کو دوپہر 12 بجے حسرت نے اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا اور باغ مولانا انوار قبرستان میں بعد نماز مغرب سپرد خاک ہوئے۔ شرح دیوان غالب، نکات سخن، مشاہدات زنداں، انتخاب سخن (گیارہ جلدیں) رسالہ تذکرۃ شعرا وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں، ان کے علاوہ رسالہ اردوئے معلیٰ (1903 سے 1910 تک اور 1925 سے 1929 تک) کی ادارت کی۔ روزنامہ 'مستقل' کانپور سے کئی برسوں تک شائع کیا اور لکھنو سے شائع ہونے والے روزنامہ ہمدم سے بھی جڑے رہے۔ مختلف مسائل اور معاملات پر ان کے خطبات بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ روزنامچے، مکاتیب بھی لکھتے رہے۔

حسرت موہانی کا ماہانہ رسالہ اردوئے معلیٰ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اسکا پہلا شمارہ جولائی 1903 میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت عبدالحلیم شرر کا دلگداز، عبدالقادر کا مخزن اور منشی دیا نارائن نگم کا زمانہ اہم رسائل تھے۔ ان کے رسالے اردوئے معلیٰ کو کئی بار ضبط بھی کیا گیا۔ اس میں سیاسی و سماجی مضامین، اشتہارات اور شعری تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ شعری تخلیقات کے لیے ایک باضابطہ سلسلہ حصہ نظم شائع ہوتا تھا۔ جس میں اہم شعرا کی نظمیں اور غزلیں وغیرہ شائع کی جاتی تھیں۔ اسلامی تاریخ اور قانونی معاملات پر مشتمل مضامین بھی اس اہم رسالے کی زینت بنتے تھے۔

اردوئے معلیٰ مطبع فیض عام علی گڑھ میں شائع ہوتا تھا۔ اردوئے معلیٰ میں شاعر یا ادیب کی سوانح، تاریخ اسلام، بجٹ ہند، نیشنل کانگریس، غیر ممالک کے حالات اس کے علاوہ حصہ نظم میں محشر، کوثر، عزیز، حفیظ، کیفی وغیرہ کی نظمیں و غزلیں تواتر سے شائع کی جاتی تھیں۔ رسالے میں غیر ملکی ادب کے شہ پارے بھی ترجمہ کے بعد شائع ہوتے تھے۔

بیسویں صدی کی شروعات میں حسرت موہانی کے رسالہ اردوئے معلیٰ نے مجلّاتی صحافت کو ایک نیا مقام اور نئی سمت عطا کی۔

غضب تھی عشق کے جذباتِ گوناگوں کی رنگینی   دل حسرت بھی اک نیرنگ ہے راز محبت کا

حسرت کی شاعری میں قدیم وجدید رنگ سخن کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ حسرت کی شاعری میں ندرت، تجربات کی متنوع اور متضاد کیفیات اور عشق کی پاکبازی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں تلمیحات وغیرہ کا استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔ عشق کی رنگینی کی مختلف کیفیات اور اس میں پوشیدہ راز کو طشت از بام کرنے کی حسرت ان کی شاعری میں موجود ہے۔

انھوں نے عشق ومحبت کے بنیادی خیالات و نازک احساسات کی بڑی خوشگوار تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے اپنی نثری تحریروں میں شاعری کی مختلف اقسام یعنی عارفانہ، عاشقانہ اور فاسقانہ، ماہرانہ، نافعانہ شاعری کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

حسرت کی غزلوں میں ایک ایسا والہانہ پن اور انفرادیت ہے جو انھیں دوسرے غزل گو شعرا میں مقبولیت عطا کرتی ہے۔ان کی شاعری کا موضوع حسن وعشق رہا ہے۔انہوں نے عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کی سچی تصویر کشی کی ہے:

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے　　وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد　　جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت　　اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

عاشقانہ شاعری میں حسرت نے جو ندرت اور انفرادیت پیش کی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی کی شاعری میں جو سرمستی ہے وہ حسرت کے یہاں نہیں لیکن ان کی شاعری میں ایک اعتدال ہے ایک توازن ہے ۔حسرت کی شاعری کا ایک واضح پس منظر ہے۔ حسرت کی شاعری میں محبت ایک عظیم جذبہ ہے جس میں پاکیزگی کی خوشبو ہے اور لغو خیالات کا دور دور تک بھی تصور نہیں ہے۔ان کا محبوب ان سے محبت بھی کرتا ہے اور بے اعتنائی بھی برتتا ہے۔روٹھتا ہے اور پھر مان بھی جاتا ہے۔ حسرت نے عشق کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے اور بالکل فطری شاعری کی ہے۔محبت کی مختلف کیفیات،عشق میں محبوب کے جذبات،محبوب کا حسن وغیرہ ان کی شاعری میں بڑے ہی اچھے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے محبوب سے خوب باتیں کرتے ہیں اور شکوہ شکایت بھی کھلے دل سے اور بڑی اپنائیت سے کرتے ہیں۔ اِس میں چھیڑ چھاڑ اور دل لگی بھی ہے لیکن احتیاط کا دامن وہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔عشقیہ جذبات کی رنگینی کو وہ الفاظ کے خوبصورت پیرائے میں ڈھال کر بے حد خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ان کا محبوب نہایت پاکباز ہے لیکن ان سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتا ہے۔

اس نازنین نے باوصف عصمت　　کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوق بھولا اپنی گستاخ دستی　　دل ساری شوخی حاضر جوابی

ان کا لہجہ عام اور برملا اظہار خیال کرنے کا ہے جس میں دوطرفہ ردعمل کا اظہار ہوتا ہے،خود کلامی کا نہیں۔ان کے اور ان کے محبوب کے درمیان ایک طرح کی مفاہمت ہے:

حسن بے پروا کو خود بیں وخود آرا کردیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کردیا
اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے　　اک ترے درد کو پہلو میں دبا رکھا ہے

حسرت کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''ایک نقادفن یا محقق کیسا ہی دقیقہ سنج اور نکتہ رس دماغ رکھتا ہو اگر اسکا کردار بلند نہیں تو جیسا فریمین نے لکھا ہے کچھ بھی نہیں ... حسرت نے اپنی طویل ادبی زندگی میں اپنا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا۔ اس کی جس قدر ستائش کی جائے کم ہے ... حسرت عہد حاضر کے بزرگ ترین غزل گویوں میں ہیں۔'' (قاضی عبدالودود،کلیات حسرت موہانی۔حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ،نارتھ ناظم آباد کراچی،پاکستان،ص85)

حسرت محبوب کا ذکر کرنے میں نفاست سے کام لیتے ہیں۔حسرت اپنے محبوب کے کردار کا مشاہدہ اور مطالعہ نہایت باریک بینی سے کرتے ہیں:

یاد بھی دل کو نہیں صبر وسکون کی صورت　　جب سے اس ساعد سیمیں کو کھلا دیکھا ہے
بزم اغیار میں ہر چند وبیگانہ رہے　　ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
آپ کے وعدے کی شب کھا کر فریب آرزو　　سیج کس کس شوق سے ہم نے سجائی آپ کی

حسرت کی شاعری میں جہاں ہمیں فحاشی، برہنگی اور محبت کا بے باک مظاہرہ نظر نہیں آتا وہیں ان کے کچھ اشعار میں اس طرح کی باتیں بھی مل جاتی ہیں۔

عبادت بریلوی نے اسی جانب اشارہ کیا ہے:

''جرأت کی معاملہ بندی۔انشا کی شوخی۔ غالب کی تعیش پرستی، داغ کی ہوسنا کی کے اثرات بھی ان کے تغزل میں کسی نہ کسی حد تک ضرور آئے ہیں۔'' (ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ کلیات حسرت موہانی۔حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، نارتھ ناظم آباد کراچی، پاکستان،ص87)

حسرت کی طبیعت نے عشق کے تصور کو ہمیشہ ایک پاکیزہ جذبہ ہی تصور کیا ہے۔ لیکن وہ محبوب کو رنگ وخوشبو میں بسانے کی کوشش کرتے ہیں:

بسی ہوئی ہے جن آنکھوں میں شوخیوں کی بہار　　ادائے شرم انھیں کیوں سکھائی جاتی ہے
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

حسرت کا محبوب باحیا ہے اس کی پلکیں جھکی رہتی ہیں لیکن حسرت کی خواہش ہے کہ اس کی پلکیں اٹھیں اور وہ انہیں نظر بھر کر دیکھے۔حسرت کی عشقیہ شاعری میں واردات قلب کی مختلف کیفیات واضح ہوتی ہیں۔ وہ عشق وحسن کی مختلف صورتحال کو اپنے اشعار میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں وہ ضرب المثل کا درجہ اختیار کرلیتے ہیں:

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہوکر مجبور　　دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے
میری محرومیوں کی حد نہ رہی　　تیرے احسان بے شمار ہوئے

فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

'' آج سے پچاس برس پہلے حسرت نے ایک نئی دھن میں غزل سرائی شروع کردی جس میں وہ کچھ پرانی دھنیں بھی ملی ہوئی تھیں جنھیں ہمارے کان بھول چکے تھے۔ اس طرح گویا اردو غزل کی ڈھائی سو برس کی تاریخ میں حسرت کا تغزل ایک نشاۃ ثانیہ رکھتی ہے۔'' (بحوالہ نیا دور ص 17، مئی 1990)

حسرت کی زبان سادہ ہے اسلوب بیان نہایت چست اور غنائیت سے بھرا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حسرت نے زبان لکھنؤ کی استعمال کی ہے اور طرز بیان دہلی کا اپنایا ہے لیکن وہ کہتے ہیں:

رکھتے ہیں عاشقانِ سخن　　لکھنوی سے نہ دہلوی سے غرض

سید امین اشرف حسرت کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسرت نے معاملات عشق کی سچی مصوری کی ہے۔ ان کی غزلوں اور اشعار کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اس میں ہماری زندگی کے ایک گوشے کی پرچھائیاں رقص کررہی ہیں۔غزل کی رگ وپے میں ہمارا خون دوڑ رہا ہے اور اس کے سینے میں ہمارا دل دھڑک رہا ہے۔'' (نخلستان صفحہ 97، اپریل جون 1985)

حسرت کی شاعری نے جہاں عشق ومحبت کے افسانے دیے وہیں ملک وملت کی ذہنی نشو ونما میں بھی اہم کردار ادا کیا۔حسرت نے ساری زندگی ایک مرد مجاہد کی طرح ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔اس بے باک سیاست داں کی زندگی کے کئی قیمتی سال قید وبند میں گزرے لیکن انھوں نے کبھی سچائی کا دامن نہیں چھوڑا۔اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ حسرت جس قدر عظیم مقام بحیثیت کلاسیکی شاعر یا بحیثیت غزل گو رکھتے ہیں اسی طرح حسرت ایک عظیم انسان بھی تھے۔

بقول باوا کرشن گوپال مغموم:

حال لکھنا ہے مجھے حسرت موہانی کا　　اس شہنشاہِ غزل، شاعر لاثانی کا
اِس کا انداز غزل سب سے نرالا دیکھا　　عشق سادہ بھی تھا، پاکیزہ بھی معصوم بھی تھا
حرم حسن کا اس کو غازی کہیے　　عشق کو اس کے بہر حال مجازی کہیے
اس کے شعروں میں پہ نہ تھا سایہ ہوس کاری کا　　وہ گنہ گار نہ تھا ذہن کی بیماری کا
محسن علم و ادب حسرت موہانی تھا　　بے نظیر اہلِ قلم، شاعر لاثانی تھا

(نیا دور جنوری مارچ، صفحہ 17، 1986)

◘

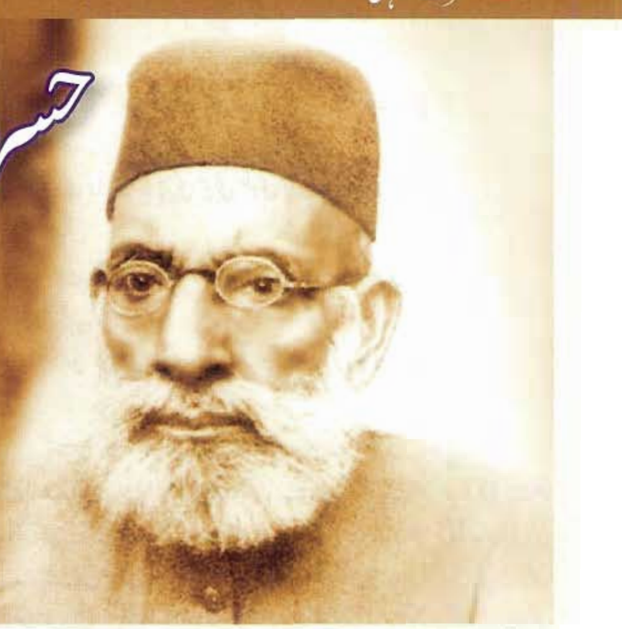

حسرت موہانی

حسرت اور چکی کی مشقت

مولانا حسرت موھانی تین مرتبہ جیل میں قید رھے۔ ان میں سب سے اھم پھلی قید تھی جس کا احوال انھوں نے 'مشاھدۂ زنداں' کے عنوان سے قلم بند کیا تھا۔ پیش ھیں مولانا کی اس خودنوشت کے چند اقتباس: (ادارہ)

صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہوا ہے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یک قلم عرصہ دراز کے لیے علیحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کر دی تھی کہ کاغذ قلم پنسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کو کسی طرح دسترس نہ ہوسکے۔ اس خاص سختی کے سبب چکی پیسنے کے دوران جتنے شعر خیال میں آتے تھے انھیں اکثر کئی کئی دن تک بکوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ ان غزلوں کے جمع ہونے اور بحفاظت جیل سے باہر پہنچ جانے کا قصہ اکتوبر 9 عیسوی کے پرچے میں درج ہو چکا ہے۔ چکی پیسنے والوں کی نگرانی ایک قیدی نمبردار کے سپرد ہوتی ہے۔

> صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ھے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ھوا ھے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یك قلم عرصہ دراز کے لیے علیحدہ کردینا کتنے بڑے جبر کی بات ھے معلوم ھوتا ھے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کردی تھی کہ کاغذ قلم پنسل کتاب یا اخبار تك اس شخص کو کسی طرح دسترس نہ ھوسکے۔ اس خاص سختی کے سبب چکی پیسنے کے دوران جتنے شعر خیال میں آتے تھے انھیں اکثر کئی کئی دن تك بکوشش تمام ذھن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا

راقم حروف چونکہ سال بھر کے قریب چکی خانہ میں رہا۔ اس لیے سیکڑوں قیدیوں اور متعدد نمبرداروں کے آنے اور تبدیل ہونے کا عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تندرست نئے قیدیوں کو عموماً پہلے چکی ہی دی جاتی ہے اس لیے نئے آنے والوں سے سب سے پہلے ملاقات کا موقع چکی خانے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ نومبر 8 عیسوی میں منجملہ دیگر نووارد قیدیوں میں ایک اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے منیجر مسٹر ریفیل کے بیٹے بھی تھے، جنھوں نے اپنے مقدمہ کا فیصلہ بذریعہ جوری کرانے سے انکار کر کے نادانستہ طور پر یوریشین ہونے کا حق کھو دیا تھا اور دیسی عیسائیوں کے زمرے میں بجبر شامل کر دیے گئے تھے ایک عرصہ کے بعد ایک انگریزی داں شخص سے مل کر نہایت خوشی ہوئی۔ زیادہ تر مسرت کا باعث یہ تھا کہ مسٹر ریفیل کچھ کچھ اخباری دنیا کے حالات سے بھی آگاہی رکھتے تھے، زمانۂ حوالات میں بھی ان کو 'پانیر' وغیرہ پڑھنے کو مل جایا کرتا تھا کیونکہ اس وقت تک ان کے ساتھ یوریشنیوں ہی کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا اور تو سب خبریں انھوں نے صحیح بتائیں۔ لیکن مسٹر تلک کی نسبت جو امید انھوں نے ظاہر کی تھی کہ وہ غالباً پریوی کونسل میں اپیل سے رہا ہو گئے ہوں گے بعد میں غلط ثابت ہوئی مسٹر تلک کی فرضی رہائی کا مژدہ سن کر راقم نے اپنے دلی مسرت کا اظہار ایک فی البدیہ غزل کے ذریعے سے کیا تھا جس کا مطلع اس وقت تک یاد ہے:

نسیم صبح گاہی یہ پیام جانفزا لائی
تلک کو بیگناہی ان کی لندن سے چھڑا لائی

سوامی شوانند نے بھی ایک ہندی چیز اس موقعے پر تصنیف کی تھی جس کا ایک ایک لفظ رنگ تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ خیر مسٹر ریفیل کو دو ہی چار روز چکی پیسنے کے بعد اس بلا سے نجات مل گئی اور وہ جیل پریس میں پروف ریڈری پر بھیج دیے گئے۔ ایک مسٹر ریفیل ہی پر کیا موقوف ہے تنے لوگ چکی خانے میں تھے، سب اپنے اپنے وقت پر یعنی کوئی ایک ہفتہ پندرہ روز کوئی ایک مہینہ اور کوئی حد درجہ تین مہینے رہ کر دوسری آسان مشقتوں پر چلے چلے گئے۔ حکام جیل کی خاص عنایت سے یہ فخر اس خاکسار ہی کو حاصل ہوا کہ تقریباً سارا زمانہ قید اسی ایک شغل میں گزارنا پڑا جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پیسنے والوں کا معائنہ خاص اس غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیستے کئی مہنے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان

کام پر بھیج دیے جائیں۔ راقم حروف کے زمانے میں تین چار بار ایسے معائنے ہوئے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا۔ ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لیے تبدیلی مشقت کی سفارش بھی کی اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی سے آگاہ بھی کیا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ نے توجہ نہ کی اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔ ہر روز صبح کو سب قیدی جانگیا کرتا تسلا کٹوری چکی خانے کے باہر پریڈ میں لگا کر صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ان سب کی گنتی لے کر دفعدار باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتا ہے کھانے کے وقت دروازہ پھر کھولا جاتا ہے۔ اس سے قبل اگر کسی کو رفع حاجت کے لیے دفعدار کو دروازہ کھولنے کی تکلیف دینا پڑے تو اس تکلیف ہی کا عوض اکثر ڈنڈوں اور سونٹوں کی شکل میں یقیناً ملتا ہے۔ کئی قیدیوں کو تو اس جرم میں اتنی سزا ملی کہ عرصے تک ان کے اعضا مجروح باقی رہے۔ قیدیوں کے مارنے پیٹنے کی قانوناً ضرور ممانعت ہے لیکن جب خود دار ڈر قواعد جیل کی پابندی نہیں کرتے تو ان کے ماتحت دفعداروں سے اس کی امید رکھنا عبث ہے ہمارے سامنے اسمٰعیل قیدی کو بے رحم وارڈر نے اس قدر مارا کہ اس کا تمام جسم زخمی ہو گیا اور پھر الٹی سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کر کے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوا دیں۔ قصور اس کا صرف اتنا تھا کہ ہاتھ میں ضرب آ جانے کے سبب سے اس نے چکی پیسنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی۔

جب کبھی گودام میں ضرورت سے زیادہ آٹا جمع ہو جاتا ہے تو دو ایک روز کے لیے چکی والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیے جاتے ہیں زیادہ تر انھیں کنگ مشین پر کربی کاٹنے یا بنولے صاف کرنے کی خدمت ملتی ہے۔ لوگ اس تبدیلی کو بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ اسی بہانے سے کم از کم اپنے احاطے سے باہر نکلنے اور دن بھر کھلے میدان میں رہنے کا موقع مل جاتا ہے لیکن راقم حروف اس عارضی لطف سے بھی محروم رہا کیونکہ جب کبھی ایسا موقع ہوتا تھا تو دارڈر مجھ کو باہر جانے والے گروہ سے الگ کر کے چکی خانے میں بند کر دیتا تھا اور قہر درویش بجان درویش۔ اس روز اکیلے ہی چکی پیسنا پڑتی تھی صرف ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ وارڈر کی عدم موجودگی میں بھی اور لوگوں کے ساتھ احاطے سے باہر گیا۔ بنولے صاف کرنے کی مشین ہمارے احاطے سے کسی قدر فاصلے پر ایک ایسی جگہ نصب تھی جہاں چاروں جانب درختوں اور جھاڑیوں کی موجودگی سے نواح دیہات کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ قیدیوں نے اس موقعے کی پوری قدر کی۔ یاں تک کہ قیدی نمبردار نے بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی تختی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ قیدیوں کے دو گروہ کر دیئے گئے تھے جو باری باری سے بیلوں کی طرح مشین کو گھماتے تھے ہر گروہ اپنے وقت فرصت کو کشتی لڑنے ہنسی مذاق یا راگ راگنی میں صرف کرتا تھا۔ ہمارے گروہ میں ضلع جھانسی کا ایک میراثی غوثو نام کا تھا۔ لوگوں کے اصرار سے اس نے اردو ہندی کی کئی چیزیں خوب گائیں۔ راقم حروف کی طبیعت کو چونکہ موسیقی سے ایک فطری اُنس ہے اس لے غوثو کی نغمہ سنجی نے دل پر قیامت کا اثر کیا۔ اس گانے کی تاثیر اس حسنِ اتفاق سے اور بھی زیادہ ہو گئی کہ ہندی چیز غوث پاک محبوب سبحانی حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں تھی جن کی غلامی پر اس فقیر کو ہزاروں ناز ہیں۔ طرفہ تر یہ کہ اس ٹھمری کے آخر میں تخلص راقم کے عزیز بزرگ مولوی سید فخر الحسین فطرت موہانی کا نکلا وہ ٹھمری یہ ہے:

سنسار تھا رو نام جپے بگداد کے مورد کا تھیا
تیرا — بغداد
نیہ کی آگ لگی تن ماں دن رین کی کہت دیا دیا
محبت — رات دن
کٹ جائے پیا چیری تیری سگری ہوں بپت کی میں گھیری
کہاں — مصیبت
گریب نواج اتار لو اب مورے سرے دکھ کی گاگریا
غریب نواز
مہراج دیا کی ایک نجر فطرت کا سر توری چوکھٹ پر
نظر
حسنین کا صد کا پار کرو منجدھارے موری نادریا

چکی خانے میں پسائی کا کام عموماً وقت مقررہ سے کچھ نہ کچھ پہلے ہی ختم ہو جایا کرتا تھا اسی لیے داروغہ کے آنے تک کا وقت باہم قیدیوں کی بات چیت یا کبھی آلہا اودل کی رزمیہ نظم کے سننے میں صرف ہوتا تھا۔ راقم نے چونکہ کبھی اس لاجواب ہندی ایپک کو غور سے نہ سنا تھا اس لیے اس کی خوبیوں سے نا آشنائے محض تھا لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ہندی زبان میں اس سے بہتر کوئی رزمیہ نظم اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس نظم کی خوبی اور عوام کی نظروں میں اس کی پسندیدگی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس وقت ہمارے صوبہ میں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جنھیں یہ افسانہ از بر یاد ہے۔ ایک نینی ہی کے سنٹرل جیل میں دس بارہ قیدی جن میں دو مسلمان تھے، اس داستان کے حافظ موجود تھے۔ ضلع کانپور کے ٹھاکر باسدیو سنگھ اور ضلع لکھنؤ کے پنڈت تلسی رام کی آلہا کو ہم لوگ روزانہ بڑے شوق اور انتہا درجے کی توجہ سے سنا کرتے تھے۔

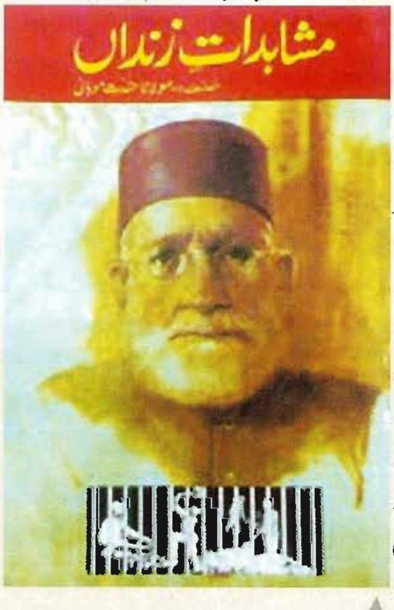

راقم حروف کے چکی خانے میں داخل ہونے کے وقت دو برقند از نگران کار مقرر تھے۔ ایک میر مظفر حسین صاحب فوق بجنوری اور دوسرا ضلع باندا کا بندا لہیر۔ جن میں سے میر صاحب کو تو دو ہی تین روز میں صرف میری وجہ سے جیل پریس کی نگرانی سپرد ہو گئی، بندا سے البتہ بہت روز تک سابقہ رہا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے نائب جیلر کا اشارہ پا کر بلا وجہ میری پیشی کرا دی تھی لیکن بعد میں اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ فی چکی دو دو قیدیوں کے حساب سے چکی خانہ میں جتنے قیدیوں کی ضرورت ہوتی ہے، برقنداز اُس تعداد سے ہمیشہ سے دو ایک آدمی زائد ضرور رکھتا ہے تا کہ اگر کوئی قیدی دفعتاً بیمار ہو جائے یا اور کوئی وجہ پیش آ جائے تو کام بند نہ رہے۔ ان زائد آدمیوں کی نسبت برقنداز کو اختیار حاصل رہتا ہے کہ ان سے کوئی کام نہ لے یا لے بھی تو محض برائے نام مثلاً کسی کمزور قیدی کی مدد کر دینا یا کسی دیر میں کام ختم کرنے والے کا آٹا چھنوا دینا وغیرہ اگر مخبری کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے زائد لوگوں کے زمرے میں داخل کر لینے سے غالباً بندا کو انکار نہ ہوتا لیکن نائب جیلر کے خوف سے اس غریب کو کبھی میرے ساتھ رعایت کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی ہی پیستے گزرا۔ بندا اس مصیبت میں میرے ساتھ ہمدردی ضرور کرتا تھا لیکن

مخبروں کی مخبری اور نائب جیلر کی بے رحمی کے خیال سے بیچارہ بالکل مجبور تھا۔ بندا کے بعد امروہے کے منشی ایزد بخش برقنداز ہوئے انھوں نے کچھ دنوں تک تو بندا ہی کی پیروی کی لیکن آخر کار اتنی رعایت کرنے لگے کہ جب کبھی موقع ہوتا تھا وہ مجھ سے کام نہ لیتے تھے۔ دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی ہفتوں میں ان کی یہ رعایت مجھ کو بہت غنیمت معلوم ہوئی کیونکہ ایسی سخت سردی میں بالکل برہنہ تن ہوکر چکی پیسنے کے لیے دن بھر کھڑے رہنا کارے دارد کا مضمون تھا۔

ایزد بخش کے بعد رسول ضلع مظفر پور کے منشی عبدالحق آئے۔ یہ صاحب حضرت فوق کی طرح شاعر تو نہ تھے تاہم کچھ نہ کچھ شوق شعر و شاعری سے ضرور رکھتے تھے۔ ایک روز وہ اپنے ہمارہ متفرق اشعار و غزلیات کا ایک مجموعہ بھی لائے جسے جیل پریس کے کسی خوش ذاق قیدی نے اپنے دل بہلانے کے لیے مرتب کیا تھا۔ اپنا کلام ختم کرچکنے کے بعد جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انھوں نے وہ بیاض مجھے بھی دکھلائی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد کتاب کی شکل دیکھ کر جتنی مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کا اندازہ کوئی آزاد شخص ہرگز نہیں لگا سکتا لیکن افسوس کہ اس واقعہ کی اطلاع کسی نامعقول نے نائب جیلر کو بھی کردی چنانچہ اس نے دفعتاً سب کئی برقندازوں کے ہمراہ آکر چکی خانے کا محاصرہ کرلیا اور فرداً فرداً ہر قیدی کو بالکل برہنہ کرا کرا کے تلاشی لی۔ مطلب تو اس کا مجھ پر الزام لگانا تھا مگر جب میرے پاس کچھ نہ نکلا تو سارا وبال غریب عبدالحق کے سر پڑا۔ انھوں نے بہت کچھ معذرت کی لیکن نائب جیلر کی فطری بے رحمی پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن سپرنٹنڈنٹ سے کہہ کر ان کی برقندازی توڑ دی اور معمولی قیدی بنا کر آگرہ کو چالان کردیا۔

جیل خانوں میں عام طور پر اتوار کے روز تعطیل کا دستور ہے لیکن الہ آباد سنٹرل جیل میں چکی پیسنے والے کے سوا باقی اور قیدیوں کو اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے لیکن حکام جیل کی قرض قیدیوں کو ہفتے میں ایک دن کی فرصت دینا گوارا نہیں کرتی۔ کیونکہ حکومت نے قیدخانوں کو اچھے خاصے کارخانوں کی صورت میں تبدیل کردیا ہے جن کا ایک روز کے لیے بھی بند رہنا جیل کی مالی امداد میں کمی واقع ہونے اور اس لیے آخر سال پر حکام جیل کی حسن کارگزاری میں نقص پیدا کردینے کا موجب ہوسکتا ہے۔ مہذب ممالک میں مجرمو ں کی اصلاح خصوصیت کے ساتھ مدنظر رہتی ہے لیکن ہندوستان میں وہاں زیادہ سے زیادہ کام لینے ان پر کم سے کم خرچ کرنے کے سوا اور کوئی اصول پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اتفاقی طور پر پیٹ میں درد پیدا ہوجانے کا بخار آجانے کا عذر کرکے اگر کوئی شخص کام کرنے سے عذر کرے تو شفاخانے بھیجے جانے کے بجائے یقیناً اسے اوّل تو وارڈن اور بعدازاں نائب جیلر کے ڈنڈوں کی سخت مار برداشت کرنا پڑے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ اتوار کو بھی عموماً تقریباً کل قیدی یا تو اپنے اپنے کارخانوں کو کام کے لیے بھیج دیے جاتے ہیں یا کوئی اور بیگاری کام انھیں دے دیا جاتا ہے۔ اتوار تو اتوار عید، بقرعید، محرم وغیرہ کو بھی تعطیل کا اور جیلوں میں دستور ہو تو ہو نینی میں مسلمانوں کے ان مذہبی تہواروں کا بھی مطلق نہیں لحاظ رکھا جاتا۔

چنانچہ بقرعید کو مسلمان عموماً مجبوراً نماز پڑھنے سے محروم رہے۔ صرف چند برقندازوں اور بعض مخصوص قیدیوں نے یکجا ہوکر نماز پڑھی۔ راقم حروف کو میر مظفر حسین صاحب نے خاص طور پر سفارش کرکے تھوڑی دیر کی چھٹی دلا دی تھی ورنہ میں بھی کچھ نہ کرسکتا۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایسی بے اعتنائی پر یہ مرحمت کہ بڑے دن کی تقریب میں قیدیوں کو چھٹی کے علاوہ فی کس آدھ آدھ پاؤ گڑ بھی تقسیم کیا گیا۔ یورپین اور یورشین قیدی یوں بھی جس آرام سے رہتے ہیں اس کا ذکر ہم کسی گزشتہ پرچے میں کرچکے ہیں۔ بڑے دن کو حکام جیل کی جانب سے ان سب کی دعوت کی جاتی ہے اور طرح طرح کی مٹھائیاں میوے اور سگریٹ تقسیم کیے جاتے ہیں۔ نماز پڑھانے کے لیے پادری برابر آیا کرتا ہے۔ مسلمان غریب اگر بجائے خود بھی چاہتے ہیں تو قواعد حیا و شریعت کے خلاف انھیں مجبوراً بحالت نیم برہنگی نماز ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر جانگیا میں صرف ایک یا دو بالشت کپڑا زیادہ لگایا جائے تو کافی ستر پوشی ہوسکتی ہے مگر یہ ہو تو کیوں کر ہو قیدیوں کی تو کوئی کچھ سنتا نہیں ہے۔ رہے آزاد مسلمان ان کو انگریزوں کی خوشامد اور اور مسلم لیگ کے ذریعہ سے خاص رعایتیں حاصل کرنے کی کوشش سے کب فرصت ملتی ہے اور کبھی ملے بھی تو بھلا حکومت کے مقرر کردہ قواعد پر اعتراض کرنے کا گناہ ان سے کیوں سرزد ہونے لگا۔

اس موقعے پر شاید ناظرین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ قیدی ان تمام ابتریوں کی شکایت افسران جیل سے کرکے انسداد کی فکر کیوں نہیں کرتے۔ اس کا افسانہ طول و طویل سے وارڈر یا نائب جیلر سے کسی قسم کی شکایت کرنا بالکل فضول ہے کیونکہ جو کچھ سختیاں جیل میں ہوتی ہیں وہ یا تو خود ان کے اشارے سے ہوتی ہیں یا کم از کم ان پر انھیں کچھ اعتراض نہیں ہوتا۔ رہا سپرنٹنڈنٹ جیل اس تک اوّل تو کسی کی رسائی نہیں ہوتی یا اگر کبھی پریڈ وغیرہ کے موقعے پر کچھ کہنے سننے کا موقع بھی ملتا ہے تو نائب جیلر کی غضب آلود نگاہ کے اثر سے 'غدر' کرنے والے کے ہوش و حواس ابتدا ہی میں غائب ہوجاتے ہیں اس پر بھی اگر کسی نے بھی مضبوط کرکے کچھ عرض کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر اس کا مطلب

1. جیل والوں کی بیدردی کا یہ افسانہ خالی از مبالغہ ہے۔ ثبوت کے لیے صوبجات متحدہ کی کونسل میں اردوئے معلیٰ کے 'مشاہداتِ زنداں' کی نسبت آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کا سوال اور حکومت کی جانب سے اس کا مہمل جواب ملاحظہ طلب ہے بابو صاحب نے دریافت کیا تھا کہ آیا گورنمنٹ کی نظر سے اردوئے معلیٰ کے یہ مضامین گزرے ہیں اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی۔ انسپکٹر جنرل صاحب نے بکمال غرور و بے پروائی جواب دیا کہ گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ان کے متعلق نہ کوئی تحقیقات کی گئی نہ آئندہ کی جائے گی۔ یہ جواب جن پرغرور الفاظ اور جس غضبناک لہجے میں دیا گیا ہے اس پر نظر کرکے ارباب انصاف خیال کرسکتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ ہی شکایتیں کرنل صاحب بہادر سے ایک قیدی کی حیثیت سے کرتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا۔ خوش قسمتی سے حسرت اس وقت آزاد اور ان کے قبضہ اقتدار سے باہر ہے۔ ورنہ قیدی پاکر آپ خدا جانے کیا غضب ڈھاتے۔ خیر آپ حاکم ہیں اور ہم لوگ محکوم جو چاہے کیجیے۔ لیکن اتنا خیال رہے کہ جبر و خودسری کے ساتھ غرور تمرد زوال کی یقینی علامتوں میں سے ہے۔

انگریزی میں نائب جیلر سے دریافت کرتے ہیں جو اس قیدی کی شکایت کو اپنی تشریحوں اور توجیہوں کے ساتھ اس شکل میں پیش کرتا ہے کہ اکثر اس غریب کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں مثلاً الہ آباد کے سجان نے غدر کیا کہ میرے ہاتھ کا گٹا اُترا ہوا ہے اس لیے مجھ کو آسان کام دیا جائے۔ نائب جیلر نے بحیثیت ترجمان اس بیان پر اپنی جانب سے اتنا اور بڑھا دیا کہ میرے خیال میں یہ شخص بہانہ کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چکی خانے سے اس کی مشقت تو تبدیل ہوئی نہیں البتہ ایک ماہ کے لیے بیڑیاں اس کے پیروں میں اور ڈال دی گئیں۔ چیری ضلع الہ آباد کے خلیل کی ایک انگلی کٹنگ مشین میں کسی طرح سے کٹ گئی اس کی نسبت بھی نائب جیلر نے یہ بات جڑ دی کہ اس نے کام سے جان بچانے کے لیے اپنا ہاتھ خود زخمی کر لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے میعادی بیڑیوں کے علاوہ تین مہینے کے لیے چکی ان کے نام لکھ دی گئی۔ بے چارے ایک ہاتھ سے چکی پیستے تھے اور نائب جیلر کی جان کو روتے تھے۔ طرفہ تر یہ کوئی شخص بطور خود اپنا حال سپرنٹنڈنٹ سے انگریزی میں نہیں عرض کر سکتا۔ کیونکہ انگریز سے انگریزی میں گفتگو کرنا گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے۔ میں نے ایک بار بحالت ناواقفیت نائب جیلر سے کچھ بات انگریزی میں کرنا چاہی تھی کہ ایک ہندوستانی وارڈر اس کے اشارے سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ ناچار خاموشی اختیار کی۔ شکایت کرنے والے کی پریشانیوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ غدر کرنے کے بعد نائب جیلر یا واڈر ہمیشہ کے لیے اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس کا نام شورہ پشتوں کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے۔ سال میں دوبارہ انسپکٹر جنرل صاحب بھی جیل خانوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ ان کی فریاد رسی اور انصاف پسندی کا افسانہ اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ جیل میں آپ کی آمد کا ہنگامہ قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے سے آپ کے ملاحظہ کے لیے قیدیوں کو 'جیل کی قواعد' سکھائی جاتی ہے۔ سلامی کی پریڈ نہانے کی پریڈ، بارک بندی پریڈ، کھانے کی پریڈ، پاخانے کی پریڈ، متعدد پریڈوں کی مشق ناواقف قیدیوں کو پاگل بنا دیتی ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد پھر مغرب تک اس قواعد کی مصیبت سے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ قواعد کے دوران میں اگر کبھی نائب جیلر صاحب تشریف لے آئے تو گویا ایک اور بلا نازل ہوئی۔ ہنٹر آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور بے رحمی آپ کے دل میں۔ ذرا بھی کسی سے کوئی غلطی ہوئی کہ آپ نے بلاتکلف ایک ہنٹر رسید کیا انسپکٹر جنرل کے آنے سے ایک روز قبل آپ وارڈوں کے ذریعے سے ہر بارک میں منادی کرا دیتے ہیں کہ جس کسی کو کچھ عذر کرنا ہو وہ پہلے ہم سے بیان کرے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نے انسپکٹر جنرل سے کسی قسم کی کوئی شکایت کی تو اس کے لیے اچھا نہ ہوگا، قیدی بھی عموماً جیل خانے کی راہ و رسم سے واقف ہونے کے بعد شکایت کر کے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت ہونے سے پرہیز کرتے ہیں اور اس طرح 'جنڈیل صاحب' فرض ادا کرنے کے طور پر بکمال تیزگامی سارے جیل کا چکر لگا جاتے ہیں اور کوئی قیدی چوں تک نہیں کرتا۔ دوسرے دن رجسٹر معائنہ میں آپ کو یہ عبارت لکھی ہوئی نظر آئے گی کہ 'سب قیدی خوش ہیں کسی کو کچھ شکایت نہیں۔ انتظام سب اچھا ہے۔'' لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص از راہ بیباکی نائب جیلر و سپرنٹنڈنٹ جیل کی خفگی سے بے پروا ہو کر کھانے کی خرابی وارڈر کی سختی اور حکام جیل کی بے رحمی کی داستان 'جنڈیل' سے کہہ بھی سنائے تو کیا ہو۔'' این خانہ تمام آفتاب است'' محکمہ جیل کے ایک ادنیٰ ملازم سے لے کر انسپکٹر جنرل تک سب کے سب بیرحمی اور بے پروائی کے یکساں رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل کو سے عدیم الفرصتی اوّل اوّل تو کسی فریادی کی فریاد کو بااطمینان سننے کی اجازت ہی نہیں دیتی لیکن اتفاق سے اگر آپ متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اس توجہ کا نتیجہ عموماً سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ عذر کرنے والا اُسی وقت کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے دن 'جنڈیل' صاحب تو چل دیتے ہیں لیکن اس غریب کی شامت آ جاتی ہے کیونکہ جنڈیل سے بلا اطلاع حکام عذر کرنے کے اس سے سخت باز پرس ہوتی ہے اور اس تمام جھگڑے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قیدی کسی دوسری جیل[1] کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاں جاتے ہی یقینی طور پر اس کا نام شہرہ پشتوں کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے انسپکٹر جنرل کے دورے کو زندانی اصطلاح میں جنڈیلی کہتے ہیں قیدیوں کو جنڈیلی سے زحمت اور پریشانی کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس سے بلائے ناگہانی کی طرح لرزاں و ترساں رہتے ہیں البتہ دوران معائنہ میں دو ایک روز کھانا نسبتاً ضرور اچھا ملتا ہے یعنی معمول کے خلاف روٹیوں کا آٹا مٹی اور چونے کی آمیزش سے پاک ہوتا ہے اور شام کو چولائی کے ساگ یا ڈنٹھلوں کے بجائے ترکاری کے بھی دو چار قتلوں کی صورت نظر آتی ہے

مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمہ میں سزا دہی کے سارے اختیار ختم کر دیے تھے یعنی دو سال قید سخت اور پانچ سو روپے جرمانہ زیادہ کا اگر انھیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے ہائی کورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا جس کے عوض میں چھ مہینے کی قید سخت کو ملا کر گویا فی الجملہ ڈیڑھ برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کریں چنانچہ ابتدائے قید سے لے کر دس ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زرِ جرمانہ ادا کرنا پڑا کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائیداد ورثتاً مجھ کو پہنچتی تھی وہ بھی مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی اور سرکاری نیلام جس بیدردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں لوگوں کے پیش نظر ہو چکا تھا کہ زرِ جرمانہ کے عوض میں اردوئے معلیٰ کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا۔ اہل حرفہ کے متعلق یہ قانون ہے کہ حکم نیلام سے ان کے پیشے کے اوزار مستثنیٰ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار نویسوں، ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اس درجہ سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے کہ ان کی نایاب اور قیمتی کتابیں ناقدر دانوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دی جاتی ہیں۔ □

ماخذ: مشاہدات زنداں: مولانا حسرت موہانی

ناشر: مولانا حسرت موہانی میموریل سوسائٹی، کراچی

حسرت موہانی

انتخاب کلام حسرت موہانی

شوقِ وصالِ یار کے قابل بنا دیا
دل کیا تھا عاشقی نے اُسے دل بنا دیا
دے دے کے مفت جان شہیدانِ عشق نے
اس نازنیں کو شاہدِ قاتل بنا دیا
شوقِ لقائے یار نے راہِ مراد میں
سختی کو رشکِ نرمیٔ منزل بنا دیا
دل کو جمالِ یار کے فیضانِ عشق نے
قندیلِ عرشِ حق کے مماثل بنا دیا
آخر فراغتِ غم دل نے ہوس کو بھی
کونین کے خیال سے غافل بنا دیا
لیلائے عشق دوست کی خاطر، بجائے دل
جب ہم چلے تو روح کو محمل بنا دیا
کیا چیز تھی وہ مرشدِ وہاب کی نگاہ
حسرت کو جس نے عارفِ کامل بنا دیا

اک جو لے دے کے ہمیں شیوۂ یاری آیا
وہ بھی کچھ کام نہ خدمت میں تمھاری آیا
ان کے آگے لبِ فریاد بھی گویا نہ ہوئے
چپ رہے ہم جو دمِ شکوہ گزاری آیا
آرزو حال جو اپنا انھیں لکھنے بیٹھی!
قلمِ شوق پے نامۂ نگاری آیا
واں سے ناکام پھرے ہم تو درِ یاس تلک
خونِ حرماں دلِ مجروح سے جاری آیا
دلِ پرشوق میں آئی کرمِ یار کی یاد!
کہ چمن میں قدمِ بادِ بہاری آیا
تیرے انکار سے فی الفور ہوا کام تمام
زخم ایسا سرِ امید پہ کاری آیا
اور تو کچھ بھی ہمیں عشق میں حاصل نہ ہوا
ہاں مگر اک ہنرِ سینہ فگاری آیا
گھر کے آئی جو گھٹا ہم نے یہ جانا حسرت
وقتِ شوریدگی و بادہ گساری آیا

کچھ میرے حالِ زار کی ان کو خبر نہیں
کیا ہو جو میں ہی جا کے سنادوں مگر نہیں
اک آفتاب حسن درخشاں ہے وہ جمال
دیکھے اُسے بغور یہ تابِ نظر نہیں
پہلو میں دل کو پوچھ رہی ہے نگاہِ یار
کیا جانے اب کوئی وہ کدھر ہے کدھر نہیں
کب تھے وہ میرے حال سے اس درجہ بے خبر
کیوں کر کہوں میں نالۂ دل میں اثر نہیں
ہم بے کسوں کو قتل جو کرتا ہے بے گناہ
کچھ اے عزیز تجھ کو خدا کا بھی ڈر نہیں
پرش ہے میرے حال کی یارب جو روزِ حشر
اتنا بھی اب یہ قصہ غم مختصر نہیں
ہو یار تک رسائی حسرت نہ کیوں محال
اس محفل سرور میں غم کا گزر نہیں

اُس بت کے پجاری ہیں مسلمان ہزاروں
بگڑے ہیں اسی کفر میں ایمان ہزاروں
دنیا ہے کہ ان کے رخ و گیسو پہ مٹی ہے
حیران ہزاروں ہیں پریشان ہزاروں
تنہائی میں بھی تیرے تصور کی بدولت
دل بستگیٔ غم کے ہیں سامان ہزاروں
اے شوق تری پستیٔ ہمت کا برا ہو
مشکل ہوئے جو کام تھے آسان ہزاروں
آنکھوں نے تجھے دیکھ لیا اب انھیں کیا غم
حالانکہ ابھی دل کو ہیں ارمان ہزاروں
چھانے ہیں ترے عشق میں آشفتہ سری نے
دنیائے مصیبت کے بیابان ہزاروں
اک بار تھا سر، گردنِ حسرت پہ رہیں گے
قاتل تری شمشیر کے احسان ہزاروں

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہوجایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہوجایئے
میرے عذر جرم پر مطلق نہ کیجیے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہوجایئے
خاطرِ محروم کو کردیجیے محوِ الم!
درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہوجایئے
راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو ازراہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کو فوراً جدا ہوجایئے
گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا دیکھیے
قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہوجایئے
میری تحریر ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہوجایئے
مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجے گالیاں!
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہوجایئے
ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہوجایئے
جی میں آتا ہے کہ اُس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہوجایئے
کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر!
مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہوجایئے
ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہوجایئے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اِس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہوجایئے
ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہوجایئے
چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے نہ بھولوں میں تجھے
تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہوجایئے
کشمکشہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہوجایئے

جو وہ نظر بسرِ لطف عام ہوجائے
عجب نہیں کہ ہمارا بھی کام ہوجائے
شرابِ شوق کی قیمت ہے نقدِ جانِ عزیز
اگر یہ باعثِ کیفِ دوام ہوجائے
رہینِ یاس رہیں اہلِ آرزو کب تک
کبھی تو آپ کا دربار عام ہوجائے
جو اور کچھ ہو تری دید کے سوا منظور
تو مجھ پہ خواہشِ جنت حرام ہوجائے
وہ دور ہی سے ہمیں دیکھ لیں یہی ہے بہت
مگر قبول ہمارا سلام ہوجائے
اگر وہ حسنِ دلآرا کبھی ہو جوہ فروش
فروغِ نور میں گم ظرفِ بام ہوجائے
سنا ہے برسرِ بخشش ہے آج پیرمغاں
ہمیں بھی کاش عطا کوئی جام ہوجائے
ترے کرم پہ موقوف کامرانیِ شوق
یہ ناتمام الٰہی تمام ہوجائے
ستم کے بعد کرم ہے جفا کے بعد عطا
ہمیں ہے بس جو یہی التزام ہوجائے
عطا ہو سوز وہ یارب جنوں حسرت کو
کہ جس سے پختہ یہ سودائے کام ہوجائے

یہ جو آویزہ تیرے کان میں ہے
جانِ خوبی مرے گمان میں ہے
وہ جو ہیں جانِ عشق و جانِ جمال
ہاں یہ مطلع انھیں کی شان میں ہے
اُس نے ہم سے سنی نہ شوق کی بات
ہنس کے پوچھا یہ کس زبان میں ہے
خود وہ آغازِ عشق میں بھی نہ تھا
لطف جو اس کی داستان میں ہے
شیب میں اب کہاں وہ لطفِ شباب
کچھ اگر ہے تو ان کے پان میں ہے
طرفہ حسرت بہ شوخیِ انشا
رنگِ جرات مرے بیان میں ہے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
بار بار اٹھنا اسی جانب نگہِ وقت کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہوجانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
جان کر سوتا تجھے، وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو ازراہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے
جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانا نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
آگیا وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رولانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے
میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے
شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور وہ مرا چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے
باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

ہولی

مو پہ رنگ نہ ڈار مراری
بنتی کرت ہوں تہاری
پنیا بھرت کاہ جائے نہ یہیں
شیام بھرے پچکاری
تھرتھر کانپت لاجن حسرت
دیکھت ہیں نر ناری

ٹھمری

کھاں چھائے رہے گردھاری
اورن مل سدھ بھول ہماری
رووت دھووت تلپھت بلکت
برہ کی رین گئی کٹ ساری
جیا جات برکھا رُت حسرت
دیکھ دیکھ بدریا کاری

ماخذ: کلیاتِ حسرت موہانی

ناشر: مولانا حسرت موہانی میموریل ہال ولائبریری ٹرسٹ، کر

فاروق ارگلی

غم دل اور غم جہاں کا شاعر

شمیم کرہانی

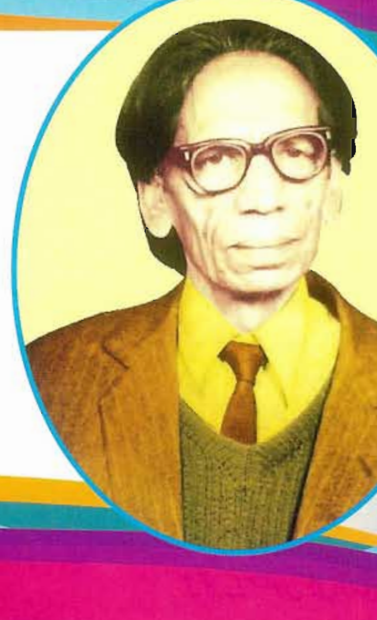

بیسویں صدی کے شعری اُفق پر حسرت، فانی، جگر، جوش، فراق، فیض، جذبی، مجاز، علی سردار جعفری، مجروح اور ان کے ہم عصروں کی جو کہکشاں روشن ہوئی اس میں ایک تابناک ستارہ ایسا بھی تھا جس کی ضوفشانیوں سے نہ صرف ایوانِ غزل جگمگایا بلکہ اس کی انقلابی نظموں اور ترانوں نے تحریکِ آزادی کی فضاؤں میں جوش اور بیداری کا ارتعاش پیدا کیا۔ اپنے عہد کے اس ممتاز شاعر کا نام ہے سیّد شمس الدین حیدر شمیم کرہانی، جو نو کلاسیکی غزل کی خوبصورت روایات کے امین و علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کی قومی اور وطنی شاعری کے نمائندہ شعرا میں نمایاں مقام و مرتبے کے حامل تھے۔ اسے محض اُردو زبان کا اتفاقی المیہ کہا جائے یا اس دور کے تاجرانہ، منافقانہ اور جانبدارانہ تنقیدی رویوں کی ستم ظریفی کہ اپنے عہد کے اس قادرالکلام شاعر کو تقریباً نظرانداز کرتے ہوئے وقت کا کارواں آگے بڑھتا جا رہا ہے اور اُردو ادب، فن و تہذیب کی یہ پُراثر آواز پیچھے چھوٹ گئی ہے۔

اُردو زبان و ادب سے مخلصانہ محبت کرنے والا ہر باشعور قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ شمیم کرہانی اپنی تخلیقی صلاحیت اور علمی و فنی ریاضت کے تناظر میں اپنے اُن معاصرین سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے، جنھیں قصرِ دوام میں جگہ دلانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، لیکن شمیم کرہانی کے باب میں ایسی کوئی اہم کوشش نظر نہیں آئی جس کے وہ سچے حقدار تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ بہت سے فنکار اپنی تخلیقی اور عملی زندگی میں ہی اپنی تشہیر و ترویج کے لیے خیرخواہوں کے دائرے اور گروپ بنا لیتے ہیں۔ یوں بھی لائق وابستگیاں فن اور فنکار کی شہرت اور عظمت کی پائیداری میں اہم کردار ادا کرتی آئی ہیں۔ شمیم کرہانی کے بارے میں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ انھیں یا تو زندگی کی مصروفیات نے اس کا موقع ہی نہیں دیا یا پھر ان کی قلندرانہ فطرت نے اس جانب توجہ ہی نہیں دی، تو بس یہی ہوا کہ ہم وقت کی اس تیز رفتاری میں شمیم کرہانی کو ایک طرح سے بھولتے جا رہے ہیں اور یہ بھولنا اُردو ادب کے لیے ایسا نقصان ہے جس کی تلافی آنے والے زمانے میں مشکل ہوگی۔ ہمارے ادب کا کوئی جانبدار مورخ اس سچ سے انکار و انحراف نہیں کرسکتا کہ شمیم کرہانی کے بغیر ان کے عہد کا ادبی منظرنامہ ادھورا ہے، اور یہ بھی کہ جس دن شمیم کرہانی کی شناخت اور بازیافت مکمل ہوگی، بہت سے دراز قد خاصے کوتاہ دکھائی دینے لگیں گے اور ان کی کہی ہوئی بات سچ ہوجائے گی کہ:

نمود و رفعت کے آسماں پر رہے گا تاروں میں جلوہ گستر
مرا مہِ ناتمام شہرت کہ بڑھ کے ماہِ تمام ہوگا
جہاں کے طوفانِ لن ترانی، تمام ترمحو و گنگ ہوں گے
خدائے سینائے شاعری سے کلیم دل ہم کلام ہوگا

راقم الحروف کی طرح دنیائے اُردو میں ابھی ایسے لاکھوں لوگ زندہ ہیں جنھوں نے بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی سحرانگیز آواز سنی ہے، وہ پرسوز ترنم جو سماعتوں میں رس گھولتا ہوا دلوں میں اُتر جاتا تھا، وہ روح پرور تغزل جس کا آہنگ اور نغمگی انھیں اپنے وقت کے تمام عظیم المرتبت غزل گو شعرا میں ممتاز کرتی تھی۔ جب شمیم کرہانی اسٹیج پر غزل سنا رہے ہوتے تھے اس وقت فضا میں رقص کرتا ہوا رومانی جادو سامعین کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ قبولیتِ عامہ ان کے قدموں میں نثار ہوتی تھی۔ غزل کی مستیوں، رنگینیوں اور رنگ و رعنائیوں کے آہنگ میں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات و احساسات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل و حقائق بیان کرنے کا منفرد انداز شمیم کرہانی کو ایک سچا اور کھرا شاعر ثابت کرتا ہے، لیکن شمیم کرہانی کی شخصیت شعری محافل اور مشاعروں میں اپنی بے پناہ مقبولیت تک ہی محدود نہیں تھی۔ ان کی شاعری ملک کی تحریکِ آزادی کے ہنگاموں میں پروان چڑھی تھی، ذہنی طور پر وہ ایک مجاہدِ آزادی اور سرفروش انقلابی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ولولہ انگیز نظموں اور ترانوں سے آزادی کے متوالوں میں جوش اور حوصلہ پیدا کرنے کا کام لیا۔ وہ پیشے سے معلم تھے، ایک لائق اور شفیق استاد کی حیثیت سے انھوں نے زندگی کا طویل ترین حصہ اپنے طلبہ اور شاگردوں کو زیورِ علم و آگہی سے آراستہ کرنے میں گزارا۔ شمیم کرہانی ایک صاحبِ نظر عالم اور دانشور بھی

تھے، انھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر تخلیق وتصنیف سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ ان کی 61 سالہ زندگی کے شب و روز گواہی دیتے ہیں کہ شمیم کرہانی ایک غیر معمولی اور ہمہ جہت انسان تھے۔

شمیم کرہانی 8 جون 1913 کو مقام پارہ ضلع غازی پور (یوپی) میں پیدا ہوئے، لیکن ان کا آبائی وطن قصبہ کرہاں، ضلع اعظم گڑھ ہے۔ ان کا خاندان معزز اہل علم سادات کا زمیندار گھرانہ تھا، اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت میر شمس الدین میر شمسیؒ چار سو سال پہلے بہت بڑے خدارسیدہ بزرگ گزرے ہیں جن کا آستانہ آج بھی مرجعِ خلائق ہے، انہی بزرگ کے نام پر ان کے والد سیّد محمد اختر نے ان کا نام سیّد شمس الدین رکھا، لیکن وہ اپنی عرفیت یا تخلص شمیم کرہانی کے نام سے مشہور عالم ہوئے۔ گھر میں لوگ پیار سے انھیں شمسو کہہ کر پکارتے تھے۔ ابتدائی تعلیم خاندان کے دستور کے مطابق گھر پر ہی حاصل کی۔ بعد میں وہ فیض آباد کے وثیقہ اسکول میں داخل کرائے گئے۔ فیض آباد میں ہی ان کے ذہن کو بالیدگی حاصل ہوئی۔ شمیم کرہانی کے بچپن کے ساتھی اور دُور کے عزیز نامور نقاد اور محقق سیّد علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

''فیض آباد کبھی اودھ کا دارالسلطنت رہ چکا تھا، نواب آصف الدولہ نے دارالامارہ لکھنؤ منتقل کردیا تب بھی بہو بیگم نے فیض آباد کا رکھ رکھاؤ قائم رکھا۔ یہ تو داستانِ پارینہ تھی، لیکن جب شمیم فیض آباد گئے اُس وقت بھی وہاں بڑی علمی وادبی چہل پہل تھی، وثیقہ عربی اسکول کے مدرسِ اعلیٰ مولوی شبیر حسن صاحب مجتہد جونپوری عربی کے جید عالم تھے، ان کے عربی کے قصائد کی دھوم میں نے لکھنؤ میں سنی تھی، حکیم پیارے صاحب، محمد مہدی حسن تسکین، علی محمد اعجاز، اظہر اور دوسرے شعرا و ادبا کی بدولت وہاں آئے دن ادبی مجلسیں برپا ہوتیں جو عام طلبائے وثیقہ اسکول کی طرح شمیم بھی پہلے سامع اور بعد میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے لگے۔ وثیقہ اسکول کی علمی فضا اور فیض آباد کے عام ادبی ماحول میں شمیم کے شعور پر مزید جلا ہوئی اور اس اجنبی شہر میں انھوں نے بہت جلد امتیاز حاصل کرلیا۔'' ('ہم قبیلہ'، ص 195)

معزز اور اہل علم اثنا عشری سادات گھرانوں میں مجالسِ عزا وغیرہ میں نوحہ ومرثیہ خوانی زندگی کا حصہ ہے، ایسے گھرانوں میں زیادہ تر اصحاب فطری طور پر شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں، شمیم کرہانی کو بھی یہی ماحول ملا، انھوں نے پہلا شعر صرف آٹھ سال کی عمر میں کہا تھا، جسے سن کر لوگوں کو یقین نہیں آیا تھا کہ ایسا شعر کوئی کمسن بچہ کہہ سکتا ہے:

نئ طرح کی کشاکش ہے آرزو کے لیے
نہیں ہے میرے لیے، اور ہاں عدو کے لیے

شمیم ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس میں ایک سے ایک بڑھ کر علمی شخصیت موجود تھی، ان کے والد اور بڑے بھائی خوش گو شاعر تھے، ماموں عظیم افسانہ نگار عباس حسینی تھے۔ اساتذہ اور اقربا میں بھی علمی وادبی ذوق کے لوگ تھے، شمیم بہت کم عمری میں ہی غزلیں، نظمیں اور سلام، نوحے اور مرثیے کہنے لگے۔ علامہ آرزو لکھنوی سے باقاعدہ تلمذ اختیار کیا، لیکن بہت جلد فارغ الاصلاح ہوگئے۔ تعلیم کے لیے وہ لکھنؤ بھیجے گئے، جہاں سے منشی اور مولوی کامل کے امتحانات پاس کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوتے گئے۔ 1936 میں وہ ڈی اے وی کالج اعظم گڑھ میں اُردو اور فارسی کے معلم کے طور پر ملازم ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد لکھنؤ چلے گئے اور روزنامہ 'قومی آواز' میں ملازمت کرلی۔ وہ تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ تھا۔ شمیم کرہانی گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے عظیم قومی لیڈروں کے افکار ونظریات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے قلم سے آزادی کے ترانے ڈھلنے لگے۔ کلام میں جوش ملیح آبادی جیسا زورِ بیان، نظمیہ اشعار میں روانی اور گہرے قومی اور وطنی جذبات کی شدت، بہت جلد ان کا شمار اُبھرتے ہوئے قومی شاعروں میں ہونے لگا۔ وہ کانگریس کے بڑے بڑے جلسوں میں بلائے جاتے اور اپنے انقلابی کلام اور پر

شمیم کرھانی کے منتخب اشعار

پی کر بھی طبیعت میں تلخی ہے گرانی ہے
اس دور کے شیشوں میں صہبا ہے کہ پانی ہے

جب گھر مرا جلتا تھا کچھ لوگ یہ کہتے تھے
کیا آگ سنہری ہے کیا آنچ سہانی ہے

یادِ ماضی ، غمِ امروز، امیدِ فردا
کتنے سائے مرے ہمراہ چلا کرتے ہیں

فضائے تیرہ، ہوا تند، ہمسفر نہ چراغ
ہم ایسی شب میں تلاشِ سحر میں نکلے ہیں

دیکھیں گے وہ کبھی نہ اُٹھا کر نگاہِ ناز
لیکن یہ شرط ہے کہ کوئی دیکھتا رہے

مجھے دیکھنا ہے اس کو جو تری گلی سے گزرے
بہ قبائے پارسائی، بہ لباسِ نیک نامی

جو ماورائے تصور نہیں کوئی صورت
تو بتکدے ہی تک اہلِ حرم گئے ہوں گے

ترا شوق ایک دُنیا، تری یاد ایک عالم
بس اب اور اس کے آگے مری کائنات کیا ہے

غمِ دُنیا، غمِ جاناں، غمِ منزل، غمِ راہ
کتنے غم زیست کے ہمراہ چلا کرتے ہیں

وہ قعرِ بحر کی باتیں سنا رہے ہیں مجھے
جو سطحِ بحر پہ دو چار ہاتھ مار آئے

مری نظر کی جوانی کبھی نہ جائے گی
مری نظر سے تمھارا شباب گزرا ہے

شمیم منزلِ طلب قدم کو آکے چوم لے
اگر قدم کو جوڑ کر تمام کارواں چلے

حرم کے اہلِ خودی ہوں کہ دیر کے خود بیں
سب اپنے اپنے پرستار پائے جاتے ہیں

ہر ایک جاں گداز غم کا ماحصل یہی رہا
کہ غم کے مشغلوں میں زندگی بہل کے رہ گئی

اِک کاروانِ زیست ہے اِک کاروانِ فکر
دُنیا کے ساتھ ساتھ تھے پھر بھی جدا تھے ہم

بڑھا کے ہاتھ اکیلے سنبھال لے پتوار
جب اختلاف نظر آئے ناخداؤں میں

سخن میں عالمِ معنی سہی شمیم مگر
حیاتِ نو کا تقاضا نہیں تو کچھ بھی نہیں

اثر آواز سے مجمعوں میں جوش اور غیر ملکی اقتدار سے ٹکرانے کا جذبہ و حوصلہ بھر دیتے تھے۔ انھوں نے 1942 کے ہندوستان چھوڑو تحریک میں شامل ہوکر زبردست گیت اور نظمیں لکھیں اور بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کے پسندیدہ شاعر بن گئے۔انھوں نے افسانے بھی لکھے جو پسند کیے گئے۔مگر افسانہ نگاری میں ان کا زیادہ دل نہیں لگا۔ان کی قومی شاعری کا پہلا مجموعہ ’روشن اندھیرا‘ اسی زمانہ میں عظیم رہنما رفیع احمد قدوائی نے اپنے صرفہ سے شائع کرایا تھا۔ 1948 میں گاندھی جی کی شہادت پر انھوں نے ’جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے‘ جیسی طویل اور پر اثر نظم کہی جسے سن کر وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے شمیم کرہانی کو دہلی بلالیا اور فرمائش کی کہ ملک وقوم کی تعمیر وترقی اور امن و آشتی کے لیے نظمیں لکھو۔ پنڈت جی کی خواہش کی تعمیل میں وہ دہلی آگئے۔ کسی نوجوان شاعر کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے ان کے گزارے کے لیے اپنی جیب خاص سے معقول وظیفہ مقرر کیا۔ پنڈت جی نے تحریری طور پر بھی ملک وقوم کے لیے شمیم کی شاعری کی بہت تعریف کی تھی۔ 1951 میں شمیم کرہانی دہلی کے اینگلوعربک اسکول میں اُردو فارسی کے معلم مقرر ہوئے اور اس کے بعد وہ دہلی کے ہی ہوکر رہ گئے۔ دہلی آنے سے پہلے اعظم گڑھ میں مشہور فلمساز، ہدایت کار شوکت حسین رضوی کے بھائی سیّد منور حسین سے شمیم کرہانی کی گہری دوستی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب ملک نیا نیا تقسیم ہوا تھا اور سیّد شوکت حسین رضوی لاہور منتقل ہوگئے تھے، شمیم کی شاعری سے متاثر ہوکر منور صاحب نے زور دے کر فلموں کے گیت لکھنے کے لیے شمیم کرہانی کو لاہور بھیج دیا۔ شوکت صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، انھوں نے کچھ خوبصورت گانے بھی لکھے لیکن وہاں ان کا دل نہ لگا اور ہندوستان واپس آگئے۔

شمیم کرہانی کا مطالعہ غضب کا تھا۔ اُردو اور فارسی ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی، وہ اینگلوعربک اسکول کے بہترین استاد ثابت ہوئے۔ 1957 میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ بھی کرلیا۔ ابتدا سے انگریزی زبان کی تعلیم نہ حاصل کرنے کی کمی ہمیشہ انھیں کھلتی رہتی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد وہ گریجویشن بھی کرنا چاہتے تھے لیکن اس وقت تک ان کی مصروفیات اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ یہ آرزو پوری نہ ہوسکی، لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت اور مطالعے کے شوق سے انھوں نے اپنی اس کمی کو بڑی حد تک دور کرلیا تھا اور انگریزی زبان پر بھی اچھی خاصی دسترس حاصل کرلی تھی۔ 1960 اور 1970 شمیم کرہانی کی شاعری کے عروج اور مقبولیت کا زمانہ تھا۔ ان کی شہرت مشاعروں، اخبارات و رسائل اور ریڈیو کے ذریعہ ساری دُنیا میں پھیل چکی تھی۔ برصغیر کے بڑے مشاعرے ان کی شرکت کے بغیر ادھورے سمجھے جاتے تھے۔ شمیم صاحب کی نگارشات میں آزادی سے پہلے ’روشن اندھیرا‘ 1942 میں، قومی ترانوں کا مجموعہ 1944 میں، ہندوستان چھوڑو تحریک کے لیے گیت اور نظموں کا مجموعہ 1946 میں، ’تعمیر نو‘ اور ’بڑھ چل رے نوجوان‘ کے عنوان سے قومی و وطنی نظموں کا مجموعہ 1948 میں شائع ہوئے۔ 1962 میں ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ’عکسِ گل‘ شائع ہوا۔ اسی چھٹی دہائی میں ’برق و باراں‘، 1972 میں ’حرفِ نیم شب‘ اور اُن کے مشہور طویل مسدس ’صبحِ فاراں‘ کی اشاعت 1974 میں ہوئی، جس

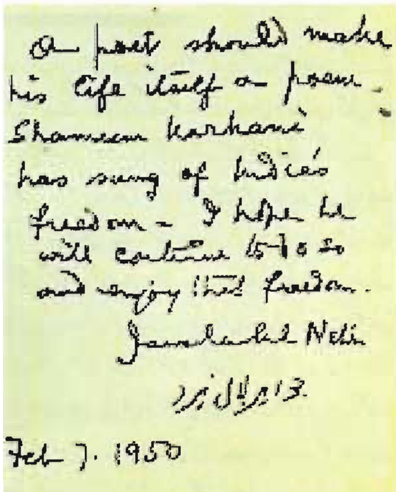
a poet should make his life itself a poem. Shameem Karhani has sung of India's freedom – I hope he will continue to do so and enjoy that freedom.
Jawaharlal Nehru
جواہرلال نہرو
Feb 7. 1950

شمیم کرہانی کی ڈائری میں پنڈت نہرو کی تحریر

میں مسلم قوم کے ماضی حال اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بڑے دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اسی سال سلام ونعت، مراثی اور قصائد کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ انھوں نے ’کلیدِ انشا‘ کے عنوان سے اُردو گرامر کی وقیع کتاب بھی تالیف کی ہے۔ جنگ آزادی کا رزمیہ بھی انھوں نے ’تلاشِ سحر‘ کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن اسے مکمل نہ کرسکے۔

شمیم کرہانی مسلک سے خوش عقیدہ اثنا عشری شیعہ تھے، لیکن وہ مسلکی تفریق وتعصب سے ہمیشہ دور رہے۔ مزاجاً وہ روشن خیال اور وسیع القلب انسان تھے۔ کسی کی دل آزاری کو وہ گناہِ عظیم تصور کرتے تھے۔ شیعہ سنی اور ہندو مسلم اتحاد کو وہ ملک کی تعمیر وترقی کی بنیاد مانتے تھے۔ اپنی شاعری کے ذریعے وہ اتحاد و یکجہتی کی ہمیشہ تلقین کرتے رہے۔

شمیم کرہانی نے اُردو شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ پابند نظموں کے وہ بادشاہ تھے لیکن انھوں نے آزاد نظم میں بھی اپنی ذہانت اور قادرالکلامی کے جوہر دکھائے۔ رباعیات میں بھی اپنی انفرادیت ظاہر کی ہے، لیکن غزل میں ان کا کمالِ شعری خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے فن وشخصیت پر خواجہ علی انجم نے اپنے تحقیقی مطالعے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، چند دیگر اسکالرز نے بھی سیر حاصل مقالات تحریر کیے ہیں، لیکن ابھی شمیم کرہانی کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم پوری ہونا باقی ہے۔ وہ آخر دم تک دہلی میں رہے اور دہلی کی علمی، ادبی، سماجی، سرگرمیوں میں اصل دلّی والوں کی طرح پیش پیش رہے لیکن وہ اپنے وطن کرہاں اور لکھنؤ کی یادوں کو ہمیشہ ذہن میں بسائے رہے:

شمیم دل نہیں لگتا دیارِ دلّی میں
غزالِ وادیِ کرہان یاد آتے ہیں

شمیم بیت گئے دن دیارِ دہلی میں
گئی نہ دل سے مگر یادِ لکھنؤ اب تک

نجی زندگی میں وہ انتہائی نرم مزاج اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ انھوں نے ایک باسلیقہ اور باوقار زندگی گزاری، بچوں کو اچھی تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا، ان کے صاحبزادے عابد اختر عابد کرہانی مشہور شاعر اور اُردو کے نامور صحافی ہیں۔

1975 میں جب وہ گرتی ہوئی صحت اور مشاعروں اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اینگلوعربک اسکول سے ریٹائر ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ 18 مارچ 1975 کو ایوانِ غالب میں منعقد ایک مشاعرے میں شریک تھے، وہیں بلڈ پریشر بڑھ جانے سے دماغ کی رگ پھٹ گئی، اسی وقت ارون اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں اگلے دن 19 مارچ 1975 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس مشاعرے میں پڑھنے کے لیے جو غزل وہ ساتھ لے گئے تھے وہ جیب سے برآمد ہوئی، اسے ان کی آخری غزل کہا جاتا ہے۔ غزل کے اس شعر میں ان کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

غمِ دل ترا غمِ دل سہی، اِسے کر تو نذرِ غمِ جہاں
وہ چراغ کوئی چراغ ہے جو چراغِ راہ گزر نہیں

■

Farooq Argali, 25, Ganesh Park, Rasheed Market, Delhi-110051

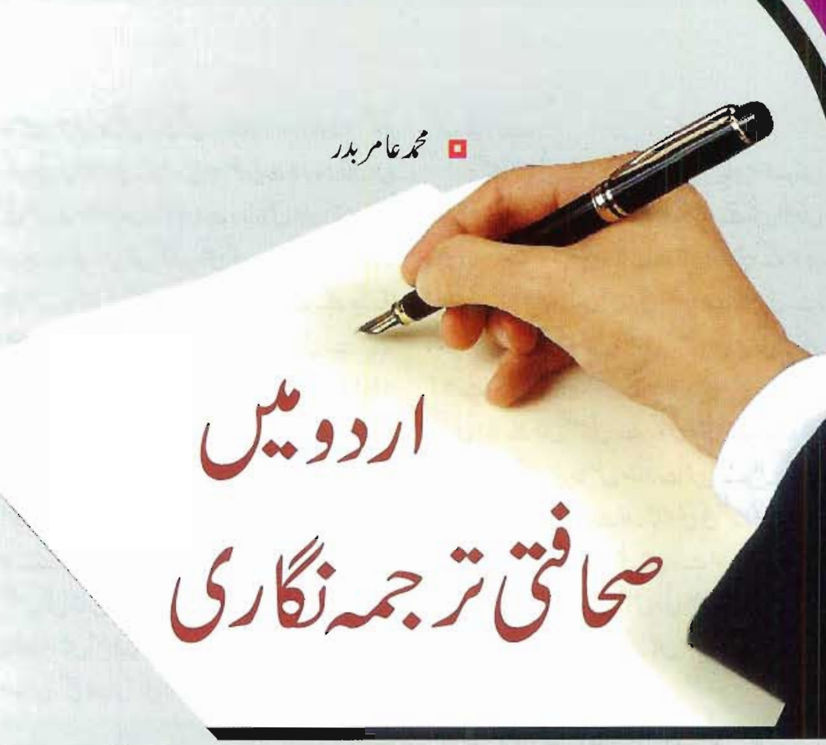

اردو میں صحافتی ترجمہ نگاری

محمد عامر بدر

ترجمہ نگاری ہی وہ فن ہے جس نے انسانوں کے تعلقات کو استوار کیا ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے، سمجھنے کا موقع دیا ہے۔ لوگوں کو قریب کیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے علم کے سمندر کے حدوں کو ختم کر دیا ہے اور اب کوئی بھی زبان جاننے والا دوسری زبان کے علمی خزانے تک پہنچ سکتا ہے۔

ترجمہ نگاری نے جہاں ایک طرف علم کے خزانوں کو عام کر دیا ہے وہیں سیاست میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ ہر ملک کو دوسرے ملک سے تعلقات بنانے ہیں اور ملک کی ترقی کرنی ہے اس کے لیے وہ یا تو کسی ایک عالمی زبان کا استعمال کرتے ہیں یا پھر ایک ترجمان کام کرتا ہے۔ آج ملک کی پارلیامنٹ میں جب کوئی کارروائی چل رہی ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ ترجمانی کا کام بھی تیزی سے چل رہا ہوتا ہے۔ چونکہ پارلیامنٹ میں ملک کے ہر ریاست سے نمائندگی کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی زبان الگ ہوتی ہے اور وہ کسی بھی بات کو اپنی مادری زبان میں زیادہ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں تو اس لیے چاہے کوئی ممبر پارلیامنٹ کسی بھی زبان میں بات کر رہا ہو اس کی بات فوراً ہی وہاں موجود ماہر زبان ترجمان ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کر کے جاری کرتے ہیں اور وہ بات Head phone کے ذریعے اسی وقت متعلقہ ممبر تک اس کی زبان میں پہنچتی ہے۔

سیاست کے علاوہ تجارت میں بھی ترجمہ کافی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وجہ یہ ہے کہ آج کی ہر چیز تجارت ہو گئی۔ سیاست بھی تجارت، صحافت بھی تجارت تعلیم بھی تجارت اور اس سے زیادہ اہم بات کہ عالمی گاؤں ہونے کی صورت سے تجارت کا علاقہ ساری دنیا میں پھیل گیا ہے۔ ایک معمولی سی مثال لیں کسی بھی شے کے ڈبے پر مختلف زبانوں میں ہدایات وغیرہ تحریر ہوتی ہیں یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ تجارت میں ترجمے کا رول اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ترجمہ نے بہت ساری چیزوں کو آسان کر دیا ہے۔ بلکہ اس نے خود زبان کو جنم دیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ظ انصاری لکھتے ہیں کہ ''اردو تو باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت، ورنہ جب تک کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔''

صحافت کے میدان میں بھی ترجمے کا ایک اہم مقام ہے کیونکہ صحافت میں معلومات اور خبروں کو ہر طرف سے جمع کر کے لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ صحافت کا سماجی اور انسانی زندگی میں اہم رول ہے لوگ اپنے آس پاس اور دور دراز کے علاقوں میں کیا ہو رہا ہے جاننا چاہتے ہیں۔ وہ دوسروں کے حالات، واقعات کو جاننے کے لیے تجسس میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ امریکی ایوان میں کیا پالیسی بنائی جا رہی ہے اور اس کا ان پر کیا اثر ہوگا دوسری طرف امریکہ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہو رہے چھوٹے چھوٹے واقعات کی بھی خبر رکھتا ہے اور اس کو اپنے ملک کے حق میں کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ ساری خبریں ترجمہ ہونے کے بعد ہی ایک دوسرے تک پہنچتی ہیں کیونکہ ہر جگہ کی زبان الگ ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ امریکی سائنس دانوں کے لیے ہندوستان کے کسی پسماندہ علاقے میں اگر کسی مرغے کے ذریعے غلطی سے انڈہ دینے کی خبر ملتی ہے تو وہ تحقیق کے لیے دوڑیں گے حالانکہ اس گاؤں کی زبان تیلگو، کنڑ، تمل وغیرہ ہو سکتی ہے لیکن ان تک یہ خبر انگریزی ترجمہ کے ذریعے ہی پہنچے گی۔ اس بات سے ترجمہ کی اہمیت وضرورت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ترجمہ نہ ہوتا تو ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی۔

ہندوستان میں صحافت کی شروعات سے ہی ترجمہ کا کام کیا جا رہا ہے چونکہ صحافت کی شروعات انگریزوں کے دور حکومت میں باضابطہ طور سے ہوئی اور پہلا اخبار جیمس اگسٹس ہیکی کے ذریعے شائع کیا گیا ہیکی گزٹ تھا۔

ہندوستان میں اردو کے علاوہ تمام علاقائی اور ریاستی زبان کی صحافت کا زیادہ تر انحصار ترجمے پر ہے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں زیادہ تر حکومتی خبریں انگریزی زبان میں ترسیل کی جاتی تھی۔ انگریزی خبر رساں اداروں اور اخباروں کا دبدبہ تھا بلکہ آزادی کے لمبے عرصے بعد تک یہی صورت حال بنی رہی۔ ہندوستانی علاقائی زبان کے اخباروں میں انگریزی خبر رساں اداروں سے حاصل خبروں کا ترجمہ شائع کرنا پڑتا تھا۔ چھٹی دہائی (1960) کے آخر تک خبر رساں ادارے کے ٹیلی پرنٹر انگریزی میں ہوا کرتے تھے۔ اس لیے نائب مدیروں جنھیں سب اڈیٹر کہتے ہیں کا کام انگریزی سے ترجمہ کرنا ہی ہوتا تھا۔ زیادہ تر پریس ریلیز انگریزی میں ہی ہوا کرتی تھی اور آج کی بھی یہی صورت حال ہے لیکن ساتویں دہائی (1970) کے شروع میں تھوڑی تبدیلی اس وقت ہوئی جب سماچار بھارتی اور ہندوستانی سماچار نے ہندی کے علاوہ دیگر ہندوستانی زبان میں بھی خبریں بھیجنا شروع کیا۔ ہندوستان سماچار کی شروعات 1948 میں ہوئی تھی جبکہ 1976 میں اسے UNI,PTI میں ملا دیا گیا تھا۔ ہندی کے ٹیلی پرنٹر اخباروں کے دفاتر میں لگائے گئے جب کہ اردو کی قسمت کے ستارے بہت بعد میں جگمگائے جب 1992 میں UNI یونائیٹڈ نیوز ایجنسی نے اردو میں خبریں فراہم کرنا شروع کیا۔

اردو اور دیگر زبان میں خبر رساں اداروں کی جانب سے خبریں فراہم کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اب ترجمے کا کام بند ہو گیا بلکہ پہلے کے مقابلے اس میں کہیں

زیادہ تیزی آئی ہے۔ ملک اور ریاست کے دارالحکومت میں رہنے والے صحافیوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک اچھے ترجمہ نگار بھی ہوں انھیں کم سے کم دو زبان آنی چاہیے اور اس میں ایک انگریزی ضروری ہے۔ ترجمے کا کام صرف پرنٹ میڈیا میں ہی نہیں بلکہ الیکٹرونک میڈیا میں بھی ضروری ہے وہاں پر بھی دیگر زبان کی خبروں کا ترجمہ کرکے پیش کیا جاتا ہے یا ترجمے سے سہارا لیا جاتا ہے ایک بہت اچھی مثال آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر نشر ہونے والی خبروں کو سنیں تو ہندی، اردو، انگریزی کی خبریں ایک دوسرے سے ترجمہ شدہ خبریں ہی ہوتی ہیں۔

اردو زبان میں صحافت کی شروعات 1822 میں جام جہاں نما سے ہوئی پھر دہلی سے مولوی محمد باقر کے ذریعے دہلی اردو اخبار 1837 میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد مختلف اخبارات صادق الاخبار، سیدالاخبار، سلطان اخبار، پیسہ اخبار، زمیندار اخبار اس وقت کے مشہور اردو اخبارات تھے۔ جس میں زیادہ تر ملک کی آزادی کے لیے بیداری کا کام کررہے تھے اس میں انگریزوں کی شدید مخالفت کی جاتی تھی۔

زیادہ تر خبریں ترجمہ کرکے شائع کی جاتی تھیں کچھ اخبارات ذولسانی یعنی اردو انگریزی، ہندی انگریزی میں بھی شائع ہونا شروع ہوئے ایسا اس لیے کہ جب اردو کا زور کم ہونے لگا تو لوگ ہندی کی طرف مائل ہونے لگے لیکن صحیح معنوں میں ہندی پڑھتے نہیں تھے بلکہ انھیں دیوناگری رسم الخط میں اردو ہی کہا جائے گا۔ پہلا ذولسان اخبار 'دارالعلوم' تھا جو کہ 1967 میں مرزا پور سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ ایک انگریزی اور اردو کا ذولسانی اخبار The urduguide کلکتہ سے نکالا گیا تھا جس میں ایک طرف انگریزی خبر اور دوسری جانب اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود اپنی کتاب 'اردو صحافت انیسویں صدی میں' ذولسانی اخبار اردو گائڈ کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ خبریں اختصار میں لکھی جاتی تھیں اور اگر خبر لکھتے وقت اخبار کا حوالہ دینا ہوتا تو لکھتے تھے کہ ''اسٹیس مین'' میں لکھا ہے'' یا پھر ڈیلی نیوز کے نامہ نگار لندن لکھتے ہیں'' اس بات سے یہ واضح ہوتا ہے خبریں انگریزی سے ترجمہ کی جاتی تھیں اور وہ بھی خبریں اخبار سے لی جاتی تھیں جو کہ کافی پرانی ہوجاتی تھیں۔

ڈاکٹر طاہر مسعود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''اردو گائیڈ کی خبریں بیش تر انگریزی اخبارات یا تار برقی سے ترجمہ کی ہوئی ہوتی تھیں علاوہ ازیں اس کے اپنے نامہ نگار بھی خبریں ارسال کرتے تھے۔ خبروں کے ترجمے میں بسا اوقات ایسے جملے جن کا ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا تھا یا اردو میں متبادل الفاظ نہیں ملتے تھے۔ انھیں گول کردیا جاتا تھا۔

(اردو صحافت انیسویں صدی میں صفحہ 926)

موجودہ دور میں صحافت کا رنگ روپ بالکل بدل چکا ہے پہلے وہ کسی مقصد کے تحت نکالے گئے تھے لیکن اب حالات بدل چکے ہیں صحافت پیشہ بن چکی ہے۔ اب اخبار نکالنے کے لیے زیادہ مشکلات نہیں ہیں بلکہ اخبارات شروع کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ بہت ساری خبر رساں ایجنسیاں اتنا مواد فراہم کردیتی ہیں کہ بآسانی 9-8 صفحے کا اخبار نکالا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں یو این آئی ایسی پہلی ایجنسی ہے جو کہ اردو میں ترجمہ شدہ خبریں اردو اخبارات کو فراہم کراتی ہے۔

> اردو اور دیگر زبان میں خبر رساں اداروں کی جانب سے خبریں فراہم کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اب ترجمے کا کام بند ہوگیا بلکہ پہلے کے مقابلے اس میں کہیں زیادہ تیزی آئی ہے۔ ملک اور ریاست کے دارالحکومت میں رہنے والے صحافیوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک اچھے ترجمہ نگار بھی ہوں انہیں کم سے کم دو زبان آنی چاہیے اور اس میں ایک انگریزی ضروری ہے۔ ترجمے کا کام صرف پرنٹ میڈیا میں ہی نہیں بلکہ الیکٹرونک میڈیا میں بھی ضروری ہے وہاں پر بھی دیگر زبان کی خبروں کا ترجمہ کرکے پیش کیا جاتا ہے یا ترجمے سے سہارا لیا جاتا ہے ایک بہت اچھی مثال آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر نشر ہونے والی خبروں کو سنیں تو ہندی، اردو، انگریزی کی خبریں ایک دوسرے سے ترجمہ شدہ خبریں ہی ہوتی ہیں۔

ابھی ملک کے طول و عرض میں اردو کے چھوٹے بڑے لگ بھگ 74 اخبارات یو این آئی سے خدمات حاصل کررہے ہیں۔ اس میں حیدرآباد سے 6، پٹنہ سے 8، دہلی سے 22، جموں کشمیر سے 5 رجسٹرڈ اخبار شامل ہیں۔

جو خبریں یو این آئی اردو کی جانب سے اردو اخبارات کو بھیجی جاتی ہیں وہ زیادہ تر انگریزی خبروں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو کہ اسٹاف ٹیم مل کر کرتی ہے ایسا کرنے سے چھوٹے چھوٹے اخبارات کو یہ فائدہ ہوا کہ انھیں ترجمہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ انھیں ساری خبریں ترجمہ کی ہوئی مل جاتی ہیں۔ یو این آئی اردو کی خبروں سے مدیروں کی یہ شکایت بھی ہے کہ وہ صحیح ترجمہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ جملے میں بھی کبھی ربط نہیں ہوتا ہے ترجمے پر ہندی کے اثرات ہوتے ہیں جو کہ جنوبی ہند کے اخبارات خاص کر حیدرآباد کے اخبارات کے لیے قابل قبول نہیں ہیں کیونکہ یہاں کی اردو میں دکنی اور عربی فارسی کے زیادہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ شمالی ہند کے اردو اخبارات میں ہندی سے متاثر اردو کا استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال ترجمہ کی صورتحال جو بھی ہو یو این آئی کی اس خدمت کی وجہ سے خاص کر چھوٹے اردو اخبارات جن کے پاس سرمایہ کی کمی ہے وہ فائدہ حاصل کررہے ہیں اخباروں کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے یو این آئی کی مدد کی وجہ سے انھیں یو این آئی اردو کی خدمات بآسانی حاصل ہوتی ہیں۔ اردو اخباروں کو یو این آئی کی جانب سے خبریں فراہم کرانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے 25 لاکھ روپے ادا کیے گئے ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ اردو اخباروں کی مالی حالت اچھی نہیں کہی جاسکتی ہے وہ بہت کم سرمائے کے ساتھ شروع ہوتے ہیں اور ان کا معیار بھی اونچا نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے نمائندے ہر جگہ نہیں بھیج سکتے ہیں کہ تاکہ انھیں اردو میں خبریں فراہم ہوسکیں یو این آئی اردو ایک راحت کا سامان ہے یو این آئی اردو کی خدمات کو کم نہیں سمجھا جاسکتا ہاں اس کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے کہ ترجمہ کیا ہوا مواد سلیس ہو اور اس پر دوبارہ محنت کرنے کی ضرورت نہ ہو۔

کتابیات و حوالاجات:

1. سہیل وحید، صحافتی زبان (اردو روزنامہ اخبارات کی روشنی میں) سن اشاعت 1996، اعلی پریس، دہلی۔
2. خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، سن اشاعت (سوم) 1996 مطبوعہ ثمر آفسٹ پرنٹر، نئی دہلی۔
3. ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی۔

Md. Amir Badar, 223, Scholar Boys Hostel, MANUU, Gachi Bowli, Hyderabad - 500032 (AP)

محمد ساجد ذکی فہمی

مولانا ظفر علی خاں اور اخبار 'ستارۂ صبح'

مولانا ظفر علی خاں ایک باکمال شاعر، بلند پایہ ادیب، شعلہ بیاں مقرر اور بے باک صحافی تھے۔ ان کی حیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ملک وملّت کی خدمت کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1903 میں رسالہ 'افسانہ' سے کیا۔ اس سے پہلے ان کے کئی مضامین مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن چکے تھے، جن میں لائف آف سرسید احمد خاں، خیابانِ فارس، اور جنگ روس وجاپان کافی اہم ہیں۔ رسالہ 'افسانہ' میں اپنے خیالات وجذبات کی مکمل عکاسی نہ کرپانے کی وجہ سے 1904 میں مولانا نے 'دکن ریویو' کے نام سے ایک اور علمی وادبی ماہنامے کا آغاز کیا، جس نے بہت جلد برعظیم کے نامور شعرا و ادبا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ اس کے لکھنے والوں میں نصیر حسین خیال، علامہ شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، مولوی عبدالحق، رضا علی وحشت وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن اس رسالے کی اشاعت کے بعد بھی ظفر علی خاں کے اندر تشنگی کا احساس باقی رہا۔ یہی وجہ تھی کہ علمی و ادبی دنیا میں وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد دسمبر 1909 میں انھوں نے 'زمیندار' کی ادارتی ذمے داری سنبھالی اور اس کے ذریعے قومی وملّی خدمات کے ساتھ تحریک آزادی کے حصول میں وہ نمایاں کردار ادا کیا جو صحافت کے باب میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی بے باک طبیعت ہی کی وجہ سے ان کے ساتھ ان کے رسائل و جرائد پر انگریزی حکومت کی نظرِ کرم ہمیشہ جمی رہی۔ مولانا کی گرفتاری اور ان کے رسائل کی ضبطی کی تفصیل 'تاریخ صحافت' میں افتخار کھوکھر نے یوں بیان کی ہے:

''مولانا ظفر علی خاں نے حق گوئی و بے باکی کے صلے میں بارہ سال سے زیادہ عرصہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ 'زمیندار' کی ضبطیوں اور اپنی گرفتاریوں کے نتیجے میں ڈیڑھ لاکھ روپے سے زائد جرمانہ ادا کیا۔ حکومت نے پندرہ دفعہ اخبار ضبط کیا۔ دو سو کے قریب نظمیں ضبط ہوئیں۔ کئی پریس بحق سرکار ضبط ہوئے لیکن دنیا کی کوئی طاقت انھیں حق گوئی سے باز نہ رکھ سکی۔ جلیانوالہ باغ میں گولی چلوا کر سینکڑوں انسانوں کو موت کی نیند سلانے والا گورنر پنجاب مائیکل اڈوائر، ضبطیوں، قرقیوں اور نظر بندیوں کے باوجود مولانا ظفر علی خاں کی آوازِ حق کو نہ دبا سکا۔ اس نے ایک رپورٹ میں لکھا کہ ''ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر ماں کے پیٹ سے بغاوت کا علم لے کر نکلے ہیں۔ انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے، کوئی عام منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت انگریزی حکومت کے نزدیک کس قدر معترض اور مشکوک تھی کہ جنرل ڈائر ہر منصوبے سے پہلے انھیں گرفتار کرنے کا حامی تھا۔ ان تفصیلات سے قطع نظر اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اخبار 'ستارۂ صبح' کی طرف رجوع کیا جائے۔

مولانا ظفر علی خاں نے کرم آباد سے 12 نومبر 1916 بمطابق 14 محرم الحرام 1335 کو ایک ہفتہ وار غیر سیاسی ادبی اخبار 'ستارۂ صبح' جاری کیا۔ اس کی سالانہ قیمت 6 روپے اور فی شمارہ 2 آنہ تھی۔ لیکن پہلے پرچے کی قیمت آٹھ آنے رکھی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس شمارے میں کل 52 صفحات تھے۔ جب کہ بعد کے شمارے 32 صفحات پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ اس کی مزید وضاحت 'ستارۂ صبح' کے پہلے شمارے سے بھی ہوتی ہے:

''ہمارا ارادہ نہ تھا کہ اس اخبار کی سالانہ قیمت زیادہ ہو۔ لیکن ہم کو مجبوراً چھ روپے (6 روپے) اس کی سالانہ قیمت رکھنی پڑی۔ جس کے متعدد بواعث ہیں:

1) پیش قرار مصارف برداشت کر کے ہم کو ایک نہایت وسیع وبرگزیدہ علمی اسٹاف انتخاب کرنا پڑا ہے۔
2) کاغذ وسامان طبع کی گرانی مانع ارزانی ہے۔
3) کرم آباد جیسے مقام سے ایک مؤقت اخبار کو ایڈٹ کرنا اور لاہور میں اس کو چھپوانا دوہرے مخارج کا موجب ہے بایں ہمہ امید ہے کہ خاطر خواہ اشاعت وسیع ہوتے ہی عنقریب قیمت اخبار میں کمی اور اس کے محاسن میں زیادتی ہوجائے گی۔
4) یہ اخبار بالفعل ہفتہ وار شائع ہوا کرے گا۔
5) اس کی ضخامت 32 صفحات کی ہوا کرے گی۔
6) یہ پرچہ بطور نمونہ کے شائع کیا جاتا ہے جس کے بعد چند دنوں تک وقفہ رہے گا۔ اور پھر مسلسل اشاعت ہونے لگے گی۔
7) اس نمونے کی قیمت 8 آنے (/8) ہے۔''[2]

جیسا کہ درج بالا سطور میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ اس اخبار کا پہلا شمارہ کرم آباد سے شائع ہوا تھا۔ لیکن اشاعتی پریشانیوں کے باعث اس کی دوسری اشاعت چند دنوں کے بعد لاہور سے ہوئی اور بند ہونے تک یہ مسلسل لاہور سے نکلتا رہا۔

ظفر علی خاں جانتے تھے کہ اس اخبار کی قیمت ہمعصر اخبارات سے زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ انگریزی

حکومت کی جانب سے یہ فرمان جاری کیا گیا تھا کہ اخبار 'ستارۂ صبح' میں اشتعال انگیز خبریں یا سیاسی مضامین کسی بھی صورت میں شائع نہیں کیے جائیں گے۔ قیمت اخبار میں اضافہ اور سیاسی مضامین کی عدم شمولیت کی وجہ سے مولانا کو اس کا گمان تھا کہ اس کی اشاعت میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو پائے گا۔ لہٰذا جہاں انھوں نے 'ستارۂ صبح' کی قیمت، ضخامت اور اشاعت وغیرہ کے متعلق خبریں شائع کیں وہیں عوام کو اس کی ضرورت اور اہمیت سے بھی آگاہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ مولانا نے ایک قدم آگے بڑھایا اور سکّے کے دونوں رخ پیش کرتے ہوئے کہا کہ :

''اگر آپ اس (یعنی ستارۂ صبح) کو مفید نہیں سمجھتے اور اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو پھر اس کو چاک کر ڈالیے اور ہم کو اطلاع دیجیے کہ ناحق یہ سلسلہ کیوں جاری رہے۔''[3]

ایک بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب 'کاروانِ صحافت' کے دوسرے ایڈیشن میں ظفر علی خاں کی نظر بندی اور 'ستارۂ صبح' کے اجرا کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

''مولانا ظفر علی خاں انگلستان میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز بلند کرنے کے بعد وطن کو لوٹے تو انھیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ سچ پوچھیے تو نظر بندی کا یہ دور علم و ادب کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا کیونکہ مولانا نے لیلائے سیاست سے کنارہ کش ہو کر لیلائے علم و ادب سے پیار کی پینگیں بڑھائیں۔ اسی پیار نے 'ستارۂ صبح' کو جنم دیا جو 1917 کے آغاز میں ایک غیر سیاسی ہفت روزہ کی حیثیت سے کرم آباد سے جاری ہوا۔''[4]

یہ بات تو درست ہے کہ انگلستان میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز اٹھانے کے بعد وطن میں مولانا کو نظر بندی کے دن گزارنے پڑے۔ لیکن جہاں تک 'ستارۂ صبح' کے اِجرا کا تعلق ہے تو اس معاملے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید سے سہو ہوا، کیوں کہ 'ستارۂ صبح' کا پہلا پرچہ 1917 میں نہیں بلکہ 12 نومبر 1916 کو کرم آباد سے شائع ہوا تھا۔ اس کی پہلی فائل جو 12 نومبر 1916 کو منظرِ عام پر آئی تھی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی 'ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری' میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں عنایت اللہ نسیم سوہدروی نے اپنی کتاب 'ظفر علی خاں اور ان کا عہد' میں 'ستارۂ صبح' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اخبار ابتدا میں سہ روزہ تھا لیکن جلد ہی روزنامے میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق یہ اخبار ابتدا سے سہ روزہ کے بجائے ہفتہ وار رہا۔ بلکہ اس کا پہلا شمارہ جو 12 نومبر 1916 کو منظرِ عام پر آیا وہ ایک لحاظ سے ماہوار تھا کیوں کہ اس مہینے اس کی کوئی دوسری اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ یکم دسمبر 1916 سے یہ اخبار ہر ہفتے پابندی سے شائع ہونے لگا۔ جہاں تک اس اخبار کے روزنامہ ہونے کا تعلق ہے تو اس نے یہ صورت ستمبر 1917 میں اختیار کی اور آخر تک روزنامے کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔

'ستارۂ صبح' اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد اخبار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت جلد علمی و ادبی حلقوں میں 'زمیندار' کی طرح تو نہیں لیکن پھر بھی اس نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی۔ اس کے سرورق میں سب سے اوپر یہ دعا 'رَبِّ زِدْنِي عِلْماً' اور اس کے نیچے فارسی کا یہ شعر درج ہوا کرتا تھا:

من آں ستارۂ صبحم کہ در محلِ طلوع
ہمیشہ پیش رَوِ آفتاب مے باشم[5]

> **یہ بات تو درست ہے کہ انگلستان میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز اٹھانے کے بعد وطن میں مولانا کو نظر بندی کے دن گزارنے پڑے۔ لیکن جہاں تک 'ستارۂ صبح' کے اِجرا کا تعلق ہے تو اس معاملے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید سے سہو ہوا، کیوں کہ 'ستارۂ صبح' کا پہلا پرچہ 1917 میں نہیں بلکہ 12نومبر 1916 کو کرم آباد سے شائع ہوا تھا۔**

اس کے علاوہ اس کے سرِورق پر کبھی کبھی نظمیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان نظموں کے ذریعے انسان کی عظمت و بڑائی، مسلمانوں کے ماضی و حال کا ذکر اور ہندوستان کی حالتِ زار وغیرہ کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ مولانا نے یکم جنوری 1917 کے شمارے میں 'ستارہ ہی نہیں جو صبح کا ستارہ نہ ہو' کے عنوان سے ایک نظم قلمبند کی تھی۔ جس میں صبح کے ستاروں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے جلال و جمال کی کیفیات کو بھی بڑے شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ 'ستارۂ صبح' میں شائع ہونے والی اس نظم کے ذریعے ظفر علی خاں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے تھے کہ یہ اخبار 'ستارۂ صبح' بھی صبح کے ستارے کے مانند پورے آب و تاب کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام تک پہنچانے اور اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے عمل پیرا ہے۔ درج ذیل میں 'ستارہ ہی نہیں جو صبح کا ستارہ نہ ہو' کے عنوان سے جو نظم شائع ہوئی تھی پیش کی جارہی ہے ملاحظہ فرمائیں:

بنا ہی دائرہ ہم نے لیا معارف کا
محال ہے کہ ہمارا کوئی ادارہ نہ ہو
کہاں سے لاؤں مضامین غیب کی سرخی
علی الصباح اگر چائے کا غرارہ نہ ہو
نہ کھل سکے گی زباں عندلیب شیدا کی
بہار کا اسے جس وقت تک اشارہ نہ ہو
بلند ہے تری ہمت تو باز بن کے دکھا
مگر کبھی بھی کلاغ طفیل خوارہ نہ ہو
مگاؤ پرچہ مگر چندہ ہضم کر جاؤ
یہ کار خیر ہے اس میں تو استخارہ نہ ہو
جمال ماہ بھی ہے اور جلال مہر بھی
ستارہ ہی نہیں جو صبح کا ستارہ نہ ہو
خدا ہو ساتھ تو طوفاں زدوں کو کیا ڈر ہے
نظر کے سامنے دریا کا گر کنارہ نہ ہو

'ستارۂ صبح' میں ان نظموں کے علاوہ جن موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے وہ بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ان مضامین میں کچھ عنوانات تو ایسے تھے جو تقریباً ہر شمارے میں شائع ہوتے تھے۔ مثلاً ترجمان القرآن، حدیث المائد، جواہر ریزے وغیرہ۔ اس کے علاوہ جو مضامین اس کی زینت بنے ان میں ہندوؤں کا وان پن، خدا کا ہندو تصور، ہندو فلسفہ، ہندوؤں کا نظام عدالت، اسلام یورپ کی نظر میں، تاریخ اسلام، اسلام اور اسراف، سنہرا گھونگا، علمائے عرب کی تحقیقات کا نمونہ، پرانے زمانے کی نئی شاعری، موتیوں کی لڑی، ذوق معرفت، امیر المؤمنین واثق باللہ عباسی، مقناطیس حیوانیہ، چالیس خزانے، مشرق اور مغرب کے کھٹمل وغیرہ۔ علاوہ ازیں اس میں تبصرہ، مطبوعات، مخطوطات اور اشتہارات وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔

ظفر علی خاں نے اس اخبار میں ہندو مذہب کے قوانین، ان کے رہن سہن، اردو سے ان کی دلچسپی وغیرہ کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ ہندوستان میں بسنے والا ہر شخص اور خاص کر مسلمان اس سے ناآشنا، نہ رہیں۔ جیسا کہ 'ستارۂ صبح' میں خود بھی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ:

''ہندو قوم، ہندو مذہب، ہندو تاریخ، ہندو روایات، ہندو فلسفہ غرض کہ ہندوؤں کے متعلق جتنی باتیں ہیں ان کی تنقیح و تنقید ہمارا خاص مطمحِ نظر ہے کہ دنیا کی اس قدیم ترین تاریخی قوم کے کسی پہلو سے بھی عوام اہل ہند کسی طرح ناآشنا نہ رہ جائیں۔''[6]

ایسا نہیں تھا کہ اس اخبار میں صرف ہندوؤں کے مذاہب یا ان سے تعلق رکھنے والے ہی مضامین شائع

ہوتے تھے۔ بلکہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اور بھی کئی طرح کے مضامین جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، شائع ہوتے تھے۔ دراصل مولانا نے اس اخبار کا اجرا ہی اس غرض سے کیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد اور اقوام ایک دوسرے کے متعلق اپنے ذہن کو صاف کرکے متحد ہوجائیں۔ اس اخبار کے مقاصد کا اظہار کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں اس طرح گویا ہیں:

''اس اخبار کے ذریعے ہندوستان کی ہر قوم و ہر جماعت کی خدمت ہماری پیش نہاد خاطر ہے۔ یہ ہندو مسلمانوں کا مشترک اخبار ہے۔ یہ عام فرزندان ہند کی علمی وراثت ہے۔ یہ ایک جانب کرشن کے فلسفہ بھیشم پتامہ کے خلاق ذہن کے قانون، بودھ کے تقویٰ، برہما قدمین کی برہم ودیا کی میراث ہے اور دوسری جانب اسلام اور اس کے انوار و معرفت کا آئینہ دار ہے،''7

'ستارۂ صبح' میں ایک اور بات جو ابھر کر سامنے آتی ہے وہ اس کی حقیقت پسندی اور غیر جانب داری ہے۔ چونکہ اس رسالے میں تاریخ کا بھی وافر حصہ موجود ہوتا تھا اور ان تاریخی واقعات کو دلائل و شواہد کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ان ہی واقعات میں سے ایک واقعہ محمود غزنوی کا ہے جس پر ان کے ہم عصر اخبارات نے بڑی ہنگامہ آرائی کی۔ چونکہ مولانا کی بات سماج میں پھیلے غلط روایت کے خلاف حقیقت پر مبنی تھی لہٰذا اس کو قبول کرنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ہم عصر اخبارات نے ان کو یہ دھمکی دی کہ ''مولوی صاحب محمود غزنوی کی ایسی وکالت سے دست بردار ہوجائیں'، حالانکہ ظفر علی خاں نے صرف اتنا کہا تھا کہ:

''محمود غزنوی کی نسبت جو یہ مشہور ہوگیا ہے کہ سومنات میں پہنچ کر اس نے باوجود برہمنوں کی منت و سماجت اور گریہ وزاری کے بت پر گرز مار کر اسے توڑا اور اس کے پیٹ میں سے لاکھوں روپے کے زر و جواہر نکال کر لے گیا، سراسر غلط ہے کیونکہ وہ بت مہادیو کے لنگ کی ٹھوس مورتی تھا۔ جو بیچ سے کھوکھلا نہ تھا۔''8

مولانا جانتے تھے کہ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے اور حقیقت کا بیان کرنا کسی کی وکالت یا حمایت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح کے حقائق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مورخوں کو ان کے فرائض یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

''تاریخ نگار کا فرض ہونا چاہیے کہ کسی واقعہ کو سپرد قلم کرتے وقت قومی پاسداری یا عصبیت کے جذبات سے اپنے قلم کو آلودہ نہ ہونے دے اور ہم خدا سے اسی کی توفیق چاہتے ہیں۔ یہ ہم سے کبھی نہ ہوگا کہ تھوڑی دیر کی واہ واہ کے لیے یا کسی ایک فریق کی رضا جوئی کی غرض سے تاریخی سچائی کا اخفا کریں اور 'نام نیک رفتگاں' کو جب کہ اغیار بھی اس نیک نامی پر صاد کرتے ہوں۔ بدنام کریں۔''9

'ستارۂ صبح' کی ورق گردانی کرنے کے بعد اس حقیقت کا انکشاف کلّی طور پر ہوجاتا ہے کہ اس اخبار میں تاریخ کا بھی وافر خزانہ موجود ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس میں جو واقعات پیش کیے جاتے تھے یا دلائل کے ساتھ جن چیزوں کی تفصیل بیان کی جاتی تھی، عام تاریخ کی کتابیں اس سے یکسر پاک تھیں۔

'ستارۂ صبح' کے مضامین سے قطع نظر اس کے اندازِ تحریر نے بہت ہی قلیل مدت میں علمی و ادبی حلقوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ظفر علی خاں کو زبان پر پوری طرح دسترس حاصل تھی جس کا استعمال انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس اخبار میں کیا۔ 'ستارۂ صبح' کی اشاعت سے پہلے ہی عالمی جنگ شروع ہوچکی تھی اور اس کی وجہ سے پوری دنیا پر خوف و ہراس کا ماحول طاری تھا۔ دوسری جانب 'ستارۂ صبح' میں سیاسی مضامین کا شائع ہونا ممنوع قرار دیا جاچکا تھا۔ چنانچہ حکومت کی اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جن عنوانات کا انتخاب کیا گیا اس کا ذکر درج بالا سطور میں پیش کیا جاچکا ہے۔ لیکن انگریزی حکومت، مولانا ظفر علی خاں اور ان کے اخبار پر اپنے الطاف و عنایات کی بارش کہاں کم کرنے والی تھی۔ لہٰذا اپنی نکتہ چینی کے ساتھ وہ اُن پر پوری طرح مسلّط رہی۔

بہر حال مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار 'ستارۂ صبح' کے ذریعے ملک و قوم کی جو خدمت انجام دی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے عہد میں ہندوستان فرقہ وارانہ تشدّد کا شکار تھا اور ان کے زمانے میں ہی کیا ابتدا سے ہی اس ملک میں اس قسم کے تنازعات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں اسے کچھ زیادہ تقویت ملی۔ ان ہی فرقہ وارانہ تصادمات کی وجہ سے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط افواہیں، ان کو بدنام کرنے کی سازش، مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال سے اسلام کو تشبیہ دینے کی کوشش کی جانے لگی۔ جس کے خلاف ظفر علی خاں نے 'ستارۂ صبح' میں کئی مضامین تحریر کیے اور اسلام کی حقیقی شکل کو واضح انداز میں پیش کرنے کی سعی کی۔ اس ضمن میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ دودھ تھوہر میں بھی ہوتا ہے اور عصارۂ بادام میں بھی لیکن ایک جاں ربا ہے دوسرا جاں پرور۔ اسلام کا اندازہ اگر کرنا ہو تو اس کی تعلیم سے کرو اور دیکھو کہ بنی نوع بشر کے حق میں یہ تعلیم باعث رحمت ہے یا موجب زحمت۔''10

درج بالا اقتباس کے مطالعہ سے جہاں ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کے اندازِ بیان کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے کہ اتنے آسان اور مختصر جملے میں جس خوبصورتی کے ساتھ اسلام اور اس کی حقیقت کو واضح کیا ہے وہ ان ہی کا خاصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 'زمیندار' کی طرح تو نہیں لیکن علمی و ادبی حلقوں میں اس رسالے کی کافی پذیرائی ہوئی۔ عنایت اللہ نسیم سوہدروی نے اپنی کتاب 'ظفر علی خاں اور اس کا عہد' میں اس کی مقبولیت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے:

''سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری نے 1952 میں بیرونِ دہلی دروازہ لاہور مولانا ظفر علی خاں کے رخساروں کو بوسہ دیتے ہوئے ان الفاظ میں کہا کہ'' ظفر علی خاں تیرے ستارۂ صبح نے میرے جگر میں آگ لگادی تھی۔''11

غرض کہ 'ستارۂ صبح' علمی اور ادبی کاوشوں کا ایک عجیب مرقع تھا۔ باوجود اس کے اس پر حکومت کی اس قدر پابندیاں عائد تھیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مولانا ظفر علی خاں نے فروری 1918 میں 'ستارۂ صبح' سے علیحدگی اختیار کرلی۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

حواشی:

1 تاریخ صحافت اردو، افتخار کھوکھر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009، ص98، **2** ستارۂ صبح، ظفر علی خاں، جلد1، نمبر1، 12 نومبر 1916، ص2,3، **3** ستارۂ صبح، ظفر علی خاں، جلد1، نمبر1، 12 نومبر 1916، ص2، **4** کاروانِ صحافت، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، انجمن ترقی اردو، پاکستان، دوسرا ایڈیشن 1989، ص118، **5** ستارۂ صبح، نمبر1، جلد1، 12 نومبر 1916، ص1، **6** صرف مسلمانوں کے ہی نہیں ہندوؤں کے بھی خیر خواہ، ستارۂ صبح، جلد1، نمبر2، یکم دسمبر 1916، ص2، **7** ستارۂ صبح، جلد1، نمبر1، 12 نومبر 1916، ص3، کرم آباد، **8** ستارۂ صبح، جلد1، نمبر 8-3 دسمبر 1916 ص3، **9** ایضاً **10**، ستارۂ صبح، 16 جنوری 1917، جلد1، نمبر1، ص2، **11** ظفر علی خاں اور ان کا عہد، عنایت اللہ نسیم سوہدروی، اسلامک پبلشنگ، لاہور، نومبر 1982، ص276

◘

Md. Sajid Zaki Fahmi, ,E-110/A, Hari Kothil Lane Abul Fazal Enclavel, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025, Mob.: 9990121625

محبّ الحسن

نظرثانی اور فیصلہ (نتیجہ)

کم ہی ہندوستانی حکمرانوں کو اس درجہ مطعون کرنے اور غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی جتنی کہ ٹیپو کو کی گئی ہے۔ 'اس کی شخصیت کو' تھامسن اور گیریٹ کے الفاظ میں ''ننگِ انسانیت عفریت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔'' اس سے پہلے بہت 1794 میں، مورن لکھا تھا کہ ٹیپو کے ''مہربانوں نے کئی برسوں سے ایسی اصطلاحوں کی جستجو میں ہماری زبان کے لغت کھنگال ڈالے ہیں جن سے وہ اس کی ذات اور اس کے کردار سے اپنے تنفر کا اظہار کرسکیں۔ سب وشتم کے خزانے خالی ہوچکے ہیں، تاہم اب بھی بہت سے اہلِ قلم اس پر ماتم کناں ہیں کہ وہ جس ذلت آمیز انداز میں اسے پیش کیے جانے کا مستحق سمجھتے ہیں اس کے کلی اظہار کے لیے انگریزی زبان کی وسعت ناکافی ہے۔'' ٹیپو کی شہادت کے بعد کرک پیٹرک اور ولکس نے ٹیپو کو رسوا کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی اور انگریز اور ہندوستانی دونوں مورخوں نے ان کے بیانات کو آنکھ بند کرکے قبول کرلیا۔

ٹیپو کو بدنام کیے جانے کے اسباب کا پتہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ ٹیپو کے ساتھ انگریزوں کے تعصب کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے اپنا زبردست حریف اور بدترین دشمن سمجھتے تھے، کیونکہ اس نے دوسرے ہندوستانی حکمرانوں کی طرح انگریزی کمپنی کا خراج گزار بننے سے انکار کردیا تھا۔ بہت سے مظالم جن کا اسے ملزم گردانا گیا ہے ان لوگوں کی اختراع تھے، جن میں اس کے خلاف تلخی و ناراضگی اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھوں انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا، یا یہ وہ لوگ تھے جنھیں اس نے قید کیا تھا، لیکن وہ اپنے کو اس سزا کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ٹیپو کو غلط رنگ میں پیش کیا جو اس کے خلاف کمپنی کی جارحانہ جنگوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے مضطرب تھے۔ اس کے کارناموں کو کم کرکے اور اس کے کردار کو سیاہ کرکے اس لیے بھی پیش کیا گیا تھا کہ میسور کے لوگ اسے بھول جائیں اور راجا کے حلقہ بگوش ہوکر نئی حکومت کو استحکام بخشیں۔

بایں ہمہ ٹیپو کے تمام معاصرین اور بعد کے مصنّفین نے اسے بدمعاش، ظالم اور ناکارہ نہیں سمجھا ہے۔ ایک فرانسیسی افسر کے بیان کے مطابق ''ٹیپو نے کاشتکاروں کو خوش حال بنایا اور ہندوستانی تاجروں کو تحفظ دیا۔'' انگریز بھی جب تک اپنے مصالح اور جذبات کی رو میں بہے نہیں تھے، اس وقت تک ٹیپو کے کردار اور اس کے انتظامِ سلطنت کے بارے میں ان کی بھی رائے اچھی تھی۔ حیدر علی کی وفات کی خبر سن کر مدراس کے گورنر میکارٹنی نے لکھا تھا کہ ''ممکن ہے کہ حیدر کے جواں سال اور جواں ہمت جانشین کو، ان نفرین خلائق عیوب اور مظالم کے بغیر جو اسے ورثے میں ملے ہیں، اس اقتدار کے حصول اور ان عزائم کی تکمیل میں کامیابی نصیب ہو، جو کمپنی کے سکون و عافیت کے حق میں مضر ہیں۔'' دو ماہ بعد اس نے پھر لکھا کہ ''ٹیپو صاحب کے مزاج اور رجحانِ طبع کے متعلق جو معلومات میں حاصل کرسکا ہوں، وہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ اپنے باپ حیدر علی کے مقابلے میں وہ زیادہ خداترس اور متمدن کردار کا مالک ہے۔'' ٹیپو کے کٹر دشمن ڈنڈاس نے لکھا تھا کہ حیدر کے بعد میسور کی سلطنت کا خاتمہ ہی ہوجاتا، اگر ''ٹیپو سلطان کو اپنے باپ کی اہلیت و طاقت کی میراث نہ ملی ہوتی۔'' فروری 1790 میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ہی ممبر کو ہندوستان سے ایک انگریز نے لکھا تھا کہ ''مشرق کے تمام فرماں رواؤں میں ٹیپو صرف ہمت و جرأت ہی میں فوقیت نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے کردار کے بہت سے پہلو اینچلز کی تصویر کے مقابلے میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔'' مور ڈائرم، میکنزی اور سرجان شور کو بھی اس کا اعتراف تھا کہ ٹیپو ایک رحم دل و شفیق آقا اور ایک لائق و ہردلعزیز حکمراں تھا، جس نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں اضافہ کیا۔ رینل نے بھی، جو سلطان سے انتہائی عناد رکھتا تھا، اعتراف کیا ہے کہ اس میں ''مالیات کی اور جنگ کی عظیم اہلیتیں تھیں۔ مل اگرچہ برطانوی تعصب سے یکسر دامن کش نہیں ہوسکا تھا، تاہم اس نے بھی لکھا ہے کہ ''داخلی حکمرانی میں بڑے سے بڑے مشرقی فرمانروا سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔'' اور اس کی قلمرو میں ''بہترین زراعت ہوتی تھی اور اس کی رعایا ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال تھی۔'' موجودہ دور میں ٹیپو کا زیادہ معروضی انداز میں مطالعہ کیے جانے کی وجہ سے، اسی نوع کے خیالات کا اظہار کیا جارہا ہے، تاہم آج بھی بعض مصنّفین ولکس اور کرک پیٹرک کے خیالات ہی کا اعادہ کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔

ٹیپو باوقار شکل وصورت کا مالک تھا۔ اس کا رنگ گندمی، ہاتھ پیر نازک اور چھوٹے، ناک عقابی، آنکھیں روشن اور چھوٹی اور گردن موٹی تھی۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی اور عمر میں اضافے کے ساتھ اس کی شاہانہ شخصیت کے وقار میں اور اضافہ ہوا تھا۔ اس نے داڑھی نہیں رکھی تھی، لیکن اپنے باپ کے برعکس بھویں، پلکیں اور موچھیں تھیں۔

اس کے لباس میں سادگی، مگر نفاست، ہوتی تھی اور اپنے درباریوں کو بھی سادگی اختیار کرنے کی ہدایت کرتا تھا۔ اس بنا پر اس نے عبا، قبا اور ڈھیلے ڈھالے پاجاموں کو ممنوع قرار دیا تھا۔ لیکن سفر میں وہ کوٹ پہنتا جس پر زری کا کام ہوتا اور شیر کی کھال کی طرح کی سخت دھاریاں کڑھی ہوتیں۔ دربار کے وقت وہ بیش قیمت لباس زیب تن کرتا لیکن دوسرے ہندوستانی حکمرانوں کے برعکس وہ جواہرات سے استعمال نہ کرتا۔ صرف دو وقت وہ سادہ کھانا کھاتا تھا دسترخوان پر اس کے خاص افسر اور دو یا تین بیٹھے ہوتے۔ کھانے کے دوران میں تاریخ، حدیث، فقہ اور سیرت کی کتابیں پڑھانے کا بھی وہ شائق تھا۔ اپنے درباریوں سے قصے اور لطیفے بھی وہ سنتا، لیکن فحش مذاق اسے پسند نہیں تھا۔ اس میں طاقت اور قوتِ عمل کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ روزانہ سولہ گھنٹے وہ تندہی سے کام کرتا، نظم و نسق کے ادنا گوشوں پر بھی اس کی نظر رہتی اور تفریحی مشاغل کے لیے بہت کم وقت بچتا۔ البتہ تفننِ طبع کے لیے کبھی کبھی رقص دیکھتا تھا۔

طلوعِ آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے وہ بستر سے اٹھ جاتا، غسل کرتا اور نماز فجر کے بعد تلاوتِ قرآن سے فارغ ہوکر ورزش کرتا تھا۔ پھر اپنے فوجی اور غیرفوجی افسروں کو باریاب کرنے کے لیے دربار ہال میں جاتا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں تسبیح، سر پر چھوٹی سی برہانپوری پگڑی، جسم پر قمیص اور سفید عبا ہوتی۔ قمیص میں تانبے اور

سونے کے بند ہوتے اور عبا میں ہیرے کے بٹن ٹنکے ہوتے۔ تنگ پاجامے کی جیب میں ولایتی گھڑی ہوتی۔ پیر میں چمڑے کے جوتے ہوتے جن میں مہمیز لگی ہوتی۔ پھر وہ جمعدار خانے کے معائنے کے لیے جاتا، جہاں جواہرات، ظروف، پھل اور دوسری اشیا رکھی جاتی تھیں۔ وہاں مختلف شعبوں کے داروغاؤں کو ہدایت دینے کے بعد وہ پھر دربار ہال میں واپس آتا۔ جہاں نجومیوں سے اپنے ستاروں کی کیفیت سنتا اور خط بنواتا۔ نو بجے اپنے دو تین بیٹوں اور چند افسروں کے ساتھ ناشتہ کرتا، جو اخروٹ، بادام، پھل اور دودھ پر مشتمل ہوتا۔ ناشتے کے دوران اپنی ماضی کی جنگوں کا اور مستقبل کے منصوبوں کا ذکر کرتا، اور اپنے سکریٹریوں کو اہم خطوط لکھواتا۔

ناشتے کے بعد ٹیپو لباسِ فاخرہ زیب تن کرتا۔ پگڑی سرخ یا ارغوانی یا زردی مائل ارغوانی سبز رنگ کی ہوتی جس میں سنہرے تار ہوتے، ہیرے کی کلغی ہوتی اور اس کے دونوں جانب پھندنے لٹکتے۔ جسم پر عمدہ سفید کپڑے کی چست صدری ہوتی، جس کی آستینوں پر چنّٹ ہوتی۔ صدری کمر پر تنگ ہوتی، لیکن سامنے کے دونوں پلے ڈھیلے ڈھالے ہوتے جنھیں سینے پر ہیرے کے ایک بٹن سے بند کیا جاتا تھا۔ کمر پر سنہرے حاشیہ کا ایک پٹکا ہوتا۔ داہنے ہاتھ کی ایک انگلی میں ہیرے کی یا لعل یا زرد کی جڑاؤ انگوٹھی ہوتی جو روزانہ اس کے سات ستاروں کی روش کے اعتبار سے بدلتی رہتی تھی۔

ٹیپو جب دربارِ عام میں داخل ہوتا تو دوعرض بیگی، میر تشریفات اور اعلا فوجی اور غیر فوجی افسر کورنش بجالانے کے لیے حاضر ہوتے۔ اس وقت داروغۂ ڈاک ایک تھیلا پیش کرتا جو خطوط اور عرضیوں سے بھرا ہوتا۔ تمام شعبوں کے سربراہ خبریں سلان کو سناتے۔ تختِ شاہی کے سامنے تمام شعبوں کے سربراہوں کے علاوہ اس کے فارسی کنڑ، تلگو اور مراٹھی سکریٹری بیٹھتے، جن سے وہ خطوط لکھواتا۔ اسی موقع پر مختلف شعبوں کے ماہانہ حسابات بھی وہ دیکھتا اور احکام جاری کرتا۔

تین بجے کے قریب سلطان دربار سے اٹھ کر خواب گاہ میں جاتا اور وہیں ظہر کی نماز ادا کرتا۔ اس کے بعد ڈھلائی کے اور دوسرے کارخانوں کا اور فوجوں کا معائنہ کرتا۔ قلعہ سرنگا پٹم میں اگر مرمت کا کام چل رہا ہوتا تو اس کو بھی دیکھتا۔ غروب آفتاب کے ایک گھنٹہ بعد، بازار سے ہوتا ہوا، محل کو واپس لوٹتا۔

محل پہنچنے کے بعد مختلف شعبوں کی کارگزاریاں اور دن بھر کی خبریں سنتا۔ پھر احکام جاری کرتا۔ خطوط لکھواتا اور درخواستوں کے جواب دیتا۔ رات کے اوقات وہ عموماً اپنے تین بڑے بیٹوں، چند خاص افسروں، قاضی اور اپنے خاص منشی، حبیب اللہ کے ساتھ گزارتا۔ یہ لوگ رات کے کھانے میں بھی شریک ہوتے۔ ٹیپو کی گفتگو بڑی دلچسپ، پرلطف اور نصیحت آموز ہوتی تھی۔ کھانے پر جو لوگ موجود ہوتے ان سے وہ علمی اور مذہبی موضوعات پر باتیں کرتا۔ اکثر بڑے بڑے مورخوں کے اقتباسات اور شعرا کا کلام بھی وہ پڑھ کر سناتا۔ کھانے کے بعد محفل برخاست کرکے کچھ دیر وہ تنہا چہل قدمی کرتا۔ پھر بستر پر لیٹ کر وہ مذہبی یا تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے سوجاتا۔

حیدر علی ٹیپو کی شادی ایک نوائطی، امام صاحب بخشی، کی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ٹیپو کی والدہ اور محل کی دوسری خواتین نے اس کی مخالفت کی۔ ان کی خواہش تھی کہ شاہزادے کی شادی رقیہ بانو سے کی جائے جو لالہ میاں کی بیٹی اور برہان الدین کی بہن تھی۔ بالآخر 1774 میں ٹیپو کی شادی دونوں کے ساتھ ایک ہی رات میں ہوئی۔ 1792 میں جب انگریزوں نے سرنگا پٹم میں ٹیپو کے مورچے پر دھاوا بولا تو اس کے دوسرے دن رقیہ بانو کا انتقال ہوگیا۔ تین سال بعد 1795 میں سید صاحب کی بیٹی خدیجہ زماں بیگم سے ٹیپو نے عقد کیا۔ 1797 میں ان کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا، لیکن چند ہی روز کے اندر بچہ اور زچہ دونوں کا انتقال ہوگیا۔

کرمانی نے ٹیپو کی کسی اور شادی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ آرتھر ولزلی کا بھی یہی کہنا ہے کہ سقوطِ سرنگا پٹم کے وقت ٹیپو کی ایک ہی بیوی تھی، جسے سلطان بیگم صاحب یا پادشاہ بیگم کہا جاتا تھا اور جو امام صاحب بخشی کی بیٹی اور غلام حسین خاں کی بہن تھی۔ غالم حسین خاں کو عام طور پر نواب پانڈیچری کہا جاتا تھا اور چند صاحب کی اولاد سمجھا جاتا تھا۔ ماریوٹ نے جو 1800 میں قلعہ سرنگا پٹم کا ذمہ دار افسر تھا، ٹیپو کی ایک اور بیوی کا ذکر کا ہے، جس کا نام بورانتی بیگم تھا اور جو دہلی کے ایک امیر میر محمد پند بیگ کی بیٹی اور سید محمد خاں کی نواسی تھی، جو کبھی کشمیر کے صوبیدار رہے تھے۔ ولزلی کا خیال تھا کہ ٹیپو کے بڑے بیٹے فتح حیدر خاں کی ماں روشنی بیگم مدخولہ تھی۔ لیکن خود شاہزادے کا دعوا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ کی خاص محل تھی۔

بہرکیف یہ بتانا دشوار ہے کہ ٹیپو کے حرم میں کتنی مدخولہ تھیں۔ کرمانی، میکنزی، ڈائرم، بیٹسن اور دوسرے معاصرین کی تاریخوں میں کسی بھی مدخولہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان لوگوں کے بیان کے مطابق سلطان بڑی محتاط اخلاقی زندگی بسر کرتا تھا لیکن آرتھر ولزلی اور میروٹ کا بیان ہے کہ ٹیپو کے محل میں 193 مدخولہ عورتیں اور ایک سو لونڈیاں تھیں۔ مگر ایک دوسری جگہ میروٹ نے کسی بھی مدخولہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اہلِ یورپ کو محل کی ہر عورت مدخولہ نظر آتی تھی۔ وہ لوگ اس بات کو محسوس ہی نہیں کرتے تھے کہ محل میں انائیں، باورچنیں، مغلانیاں، استانیاں، خادمائیں، صفائی کرنے والیاں اور دوسری عورتیں بھی ہوتی تھیں۔

ٹیپو نے بارہ بیٹے چھوڑے تھے۔ ان کے نام یہ تھے: فتح حیدر، معین الدین سلطان، عبدالخالق سلطان، معیز الدین سلطان، محمد سبحان سلطان، شکر اللہ سلطان، غلام احمد سلطان، غلام محمد سلطان، سرورالدین سلطان، محمد لیٰسین سلطان، جمیل الدین سلان اور منیرالدین سلطان۔ کرمانی کے بیان کے مطابق ٹیپو نے صرف ایک لڑکی چھوڑی تھی، جس کی حسین علی خاں سے شادی ہوئی تھی لیکن آرتھر ولزلی نے چار لڑکیوں کے اور میروٹ نے آٹھ کے نام لیے ہیں۔

ٹیپو فطرتاً نہایت شفیق تھا۔ اپنے بیٹوں کو اس نے معقول تعلیم و تربیت دی۔ اس کے دو یا تین بیٹے ہمیشہ اس کے ساتھ دسترخوان پر ہوتے تھے، جو کھانے کے دوران میں ہونے والے معلومات افزا مباحثوں کو سنا کرتے تھے۔ اپنے بچوں سے محبت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ 1792 میں کورگ سے وہ صرف اس خیال سے دستبردار ہوگیا اور جنگ نہیں چھیڑی کہ اس کے ان دو شاہزادوں کو گزند نہ پہنچنے پائے جو انگریزوں کے پاس یرغمال کے طور پر تھے۔ ٹیپو اپنے ضعیف العقل بھائی پر بھی مہربان رہتا تھا، اگرچہ حیدر علی کی وفات کے بعد لوگوں نے ٹیپو کو تخت و تاج سے محروم کرنے کے لیے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی ماں کا بھی بے حد احترام کرتا تھا اور ہمیشہ نہایت ادب سے اس کو مخاطب کرتا۔ باپ کی بھی وہ حد درجہ تعظیم کرتا تھا اور ریاستی پالیسی میں بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتا تھا۔

ٹیپو کے کردار کا یہ پہلو بھی قابلِ تعریف ہے کہ اپنے دوستوں سے بھی اسے گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ 1783 میں انگریزوں نے صلح کی یہ شرط رکھی کہ جو فرانسیسی جنگ میں اس کے حلیف تھے، انھیں ان کے حوالے کردے تو اس نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کردیا کہ ان کی حفاظت کا وہ وعدہ کرچکا ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح 1799 میں جب چاپیوس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سلطان اگر صلح کرنا چاہتا ہے تو ان فرانسیسیوں کو، جو اس کی ملازمت میں ہیں، انگریزوں

کے حوالے کردے، تو سلطان نے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی حالت میں بھی وہ دغا نہیں کرسکتا۔

اپنے افسروں کے ساتھ ٹیپو کا سلوک شفقت آمیز ہوتا تھا۔ وہ انھیں جو خطوط لکھتا تھا وہ بھی محبت آمیز ہوتے تھے۔ ان کی صحت کی بھی اسے فکر رہتی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو ان کے لیے وہ دوائیں بھی تجویز کرتا۔ اپنے افسروں میں اسے اپنے برادر نسبتی بہاء الدین پر سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ جو 1790 میں سرنگاپٹم کی جنگ میں کام آئے تھے۔ سید غفار، سید حامد اور محمد رضا پر بھی ٹیپو کو بے حد اعتماد تھا اور یہ لوگ بھی آخر وقت تک اس کے وفادار رہے۔ ان کے علاوہ پرنیا، بدرالزماں خاں اور میر صادق سے بھی وہ صلاح ومشورہ کیا کرتا تھا۔ صلح سرنگاپٹم تک یہ لوگ بھی سلطان کے وفادار رہے۔ لیکن اس کے بعد انگریزوں نے انھیں خرید لیا تھا۔ بہرکیف چند اعلا افسروں کے علاوہ اس کے تمام چھوٹے بڑے ملازمین اس کے وفادار رہے۔

ٹیپو اچھا شہسوار بھی تھا اور پالکی کی سواری سے اس کو نفرت تھی، جسے صرف عورتوں اور معذوروں کے استعمال کے لیے وہ موزوں سمجھا تا تھا۔ وہ مشاق نشانہ باز اور شکار میں تعاقب کرنے کا شوقی تھا۔ سدھائے ہوئے چیتوں سے وہ ہرن کا شکار کیا کرتا تھا۔ اس کام کے لیے سرنگاپٹم کے جنوب مغرب میں ایک میدان مخصوص تھا، جسے رمنا کہتے تھے۔۔ وہ ایک لائق جنرل اور جری سپاہی تھا۔ اس کا ثبوت وہ ان گنت جنگیں ہیں جو انگریزوں سے، نظام سے اور مرہٹوں سے اس نے لڑی تھیں۔ اس کی بہادری سے اس کے سپاہیوں میں خطرے کے وقت بے خوفی، عزم و اعتماد اور اور جوش و خروش پیدا ہوتا تھا۔ اسے اپنے فوجیوں کا بھی بے حد خیال رہتا تھا۔ اپنے کمانڈروں کو زخمیوں کی دیکھ بال کا اور طویل مارچ کے بعد سپاہیوں کے آرام کا خیال رکھنے کی وہ ہدایتیں بھی جاری کا کرتا تھا۔ جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کے عزیزوں کو 'انعام' کے نام سے وظائف دیے جاتے تھے۔ لیکن اگر وہ لوگ اپنا انتظام خود کرنے کے اہل ہوتے تو وظیفے کا سلسلہ منقطع کردیا جاتا تھا۔ مگر بعض وظائف نسلاً بعد نسل بھی جاری رہتے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر فوج میں ٹیپو حد درجہ ہر دل عزیز تھا۔ میسوی فوج کی اس کے ساتھ وفاداری کا ڈائرم نے بھی اعتراف کیا ہے۔

ولکس کا بھی یہی بیان ہے کہ فوج آخر وقت تک ٹیپو کی وفادار رہی۔ مور نے لکھا ہے کہ ٹیپو کے ساتھ فوج کی 'محبت اور وفاداری کی ایسی مثالیں ملتی ہیں، جس کی تعریف کیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے اور جس کی دوسری مثال بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ بلا کسی سے مقابلہ کیے ہوئے، کیونکہ مقابلہ کرنا مناسب نہ ہوگا، یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کون سی فوج، اتنے نامساعد حالات میں، ٹیپو کی فوج سے زیادہ جاں نثاری کا مظاہرہ کرسکتی تھی۔'' مور ہی مزید لکھتا ہے: ''جب ہم دیکھتے ہیں کہ دو سال تک شکستوں کا سامنا کرنے کے بعد بھی آخری وقت تک فوج اسی جوش و خروش سے لڑتی ہے جس جوش و خروش سے وہ ابتدا میں میدانِ جنگ میں اُتری تھی، تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اس عمل کی پشت پر احکام کی بے چون وچرا اطاعت سے زیادہ کوئی ارفع و اعلا جذبہ کارفرما تھا جو اس کمانڈر سے وفاداری اور دلی تعلق سے پیدا ہوسکتا ہے جو ان کے اندر ادائیگی فرض کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔''

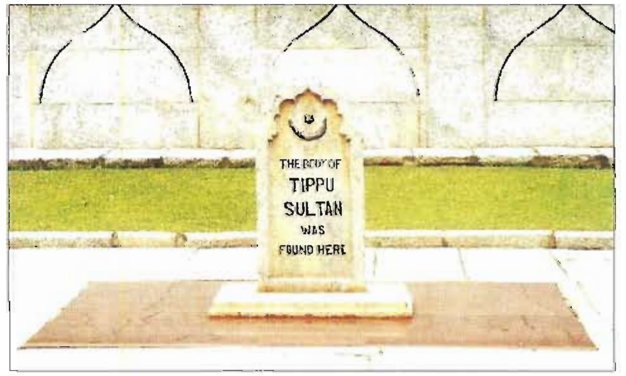

ٹیپو اپنے افسروں اور فوجیوں ہی میں نہیں بلکہ اپنی رعایا میں بھی بیحد مقبول تھا۔ میکنزی تیسری اینگلو میسور جنگ میں انگریزی فوج کے ساتھ تھا، اس نے لکھا ہے کہ ''فخر کرنے کے لیے ہمارے پاس ایسی بہت سی مثالیں نہیں ہیں جن میں اس کی رعایا کو اپنی کامیابیوں کا سبز باغ دکھا کر اس کی حکمرانی کا جوا تار پھینکنے اور عیسائی حکمرانوں کے کریمانہ اثرات کا حلقہ بگوش بنانے میں ہم کامیاب ہوسکے ہوں۔ اسی طرح مور نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے کہ ''یہ یقین کرنے کے اسباب ہمارے پاس موجود ہیں کہ اس کی رعایا بھی کسی اور حکمراں کی رعایا کی طرح خوش حال تھی۔ ہمیں کوئی ایسی مثال یاد نہیں آتی کہ ہم نے ان کی زبان سے شکایتیں یا بے اطمینانی کا زیر لب اظہار ہی سنا ہو۔ اگر اسباب موجود ہوتے تو اس کے اظہار کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ اس وقت ٹیپو کے دشمن برسر اقتدار تھے اور اس کے کردار کو داغ دار کرنے کا انعام مل سکتا تھا۔ مفتوحہ علاقوں کے باشندوں نے فاتحین کے احکام کو بظاہر قبول کرلیا، لیکن ایسا ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سابقہ حکومت کی جابرانہ محکومی سے انھیں نجات مل گئی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس جونہی انھیں موقع ملتا ہے اپنے نئے آقاؤں کی وہ مخبری کرتے ہیں اور بڑی خوشی سے سابقہ وفاداری کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔'' آج بھی میسور کے لوگ ٹیپو کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں اور یہ اس حالت میں ہے جب کہ پچھلے ڈیڑھ سو برسوں میں اس کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے۔

ٹیپو کے تمام معاصرین، خواہ دوست ہوں یا دشمن، اس بات پر متفق ہیں کہ وہ مغرور، خودنگر اور تحکم پسند تھا۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ وہ عیوب ہیں جو ایک ایسے شخص میں لازماً پیدا ہوجاتے ہیں جس نے شاہی خاندان میں جنم لیا ہو، جسے اپنی اہلیتوں کا احساس ہو، جو ایک وسیع اور خوش حال سلطنت کا مالک ہو اور جس کے پاس ہندوستان کی بہترین فوج ہو۔ با ایں ہمہ غرور اور تحکم پسندی کے باوجود وہ کریمانہ فطرت اور دلکش شخصیت کا مالک بھی تھا اور صرف اسی وقت اسے غصہ آتا، جب کہ اس کے اسباب موجود ہوتے۔ لیکن اس کی خارجی خوش طبعی کے پردے میں مصمم عزم و استقامت اور عظیم خود اعتمادی پوشیدہ تھی جو ناکامی، مصائب اور اہانت کے سامنے بھی متزلزل نہیں ہوتی تھی لیکن ان صفات کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں سنگدلی وسفاکی نہ تھی۔ انسانوں کو قتل کرنے، ایذا پہنچانے یا نزع کے عالم میں انھیں دیکھنے میں اسے کبھی بھی لطف نہیں آتا تھا۔ صرف ایسے لوگوں کو وہ سزا دیتا جو اس کے لیے یا اس کی ریاست کے لیے خطرناک ہوتے تھے۔ لیکن اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ حریفوں نے اگر اطاعت قبول کرلی اور وفاداری کا عہد و پیمان کرلیا تو اس نے انھیں معاف بھی کردیا۔ بسا اوقات اس کی یہ رحم دلی بے محل بھی ہوتی تھی۔ اس کی مثالیں میر صادق، پرنیا اور قمرالدین خاں ہیں، جو غداری کے مرتکب ہوئے تھے، تاہم اس نے انھیں معاف کرکے ان کے سابقہ عہدوں پر انھیں بحال رکھا۔ لیکن ان لوگوں کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا جو اس کی مخالفت کے مسلسل مرتکب ہوتے رہے تھے یا جنھوں نے بار بار غداری کا ارتکاب کیا تھا۔ ایسے لوگوں کو سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں سزاؤں کے جو طریقے رائج تھے وہ انتہائی

خوفناک تھے۔

ٹیپو کے کردار کا ایک اور پہلو اس کی بڑھی ہوئی حوصلہ مندی تھی۔ لیکن اس میں نئی فتوحات حاصل کرنے کا اتنا دخل نہیں تھا، بلکہ اپنی اس مملکت کو وہ برقرار رکھنا چاہتا تھا جو اسے اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ وہ اپنی سلطنت کو طاقت ور اور خوش حال بنانے کا خواہاں تھا، تا کہ اس کو نام ونمود حاصل ہو اور آنے والی نسلیں اسے یاد رکھیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مذہبِ امن کا پیرو تھا۔ اگر اسے موقع ملتا تو اپنی سلطنت کے حدود کو وسعت دینے میں بھی اسے کوئی تامل نہ ہوتا۔ لیکن جتنی جنگیں بھی اسے لڑنی پڑیں ان میں سے کوئی بھی خود اس کی برپا کی ہوئی نہیں تھی۔ یہ تمام لڑائیاں اسے اپنے دفاع میں لڑنی پڑی تھیں۔ فنِ جنگ سے زیادہ فنِ صلح سے اسے دلچسپی تھی۔ وہ ایک عظیم سپاہی تھا، لیکن وہ عظیم تر منتظم بھی تھا۔ انتظامی میدان میں جو کارنامے اس نے انجام دیے، ان ہی پر اس کی عظمت کا انحصار ہے۔

سِول اور فوجی انتظام کے لیے تخلیقی قوت کا، پیش قدمی کرنے کی اہلیت کا، سخت محنت کا اور جزئیات پر نظر رکھنے کی صفات کا جہاں تک تعلق ہے، ٹیپو کا شمار ہندوستان کے عظیم ترین فرمانرواؤں میں ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اس نے غلطیاں بھی کیں۔ مثلاً اس نے بار بار اپنی صوبائی سرحدوں میں ردوبدل کیا اور وہاں فوج کم کردی۔ بعض اوقات اس کے افسروں نے اس کے احکام کی پابندی نہیں کی۔ اس کے منصوبوں سے ہمدردی رکھنے والوں کی اور انھیں عملی جامہ پہنانے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔ بایں ہمہ ایک مضبوط حکومت کے قیام میں اور اپنی رعایا کی خوشحالی میں اضافہ کرنے میں اُسے کامیابی ہوئی۔ اس نے پند و نصائح سے، سزائیں دے کر اور ذاتی توجہ سے انتظامی خرابیاں دور کیں اور تغلب کا خاتمہ کیا۔ اس نے زراعت کو ترقی دی، تجارت کو فروغ دیا، سڑکیں بنوائیں، غیرقانونی معافیوں کو اور اکثر درمیانی زمینداروں کو ختم کیا۔ منرو اور ریڈر نے، جنھیں اُن اضلاع کا انتظام سونپا گیا تھا جو سابق میں سلطنت میسور کا حصہ تھے، اگر چہ ٹیپو کے انتظام کی شدید نکتہ چینی کی ہے، تاہم جگہ جگہ انھوں نے توصیفی انداز میں ٹیپو کی کارکردگی کا بھی اعتراف کیا ہے۔ ڈائرم نے 92-1790 کے زمانے کے بارے میں لکھا ہے کہ ٹیپو کی سلطنت آباد تھی اور زمین کی اہلیت کے مطابق پوری پوری زراعت ہوتی تھی۔ میدانِ جنگ کی فوج کے نظم کا اور اس کی وفاداری کا، آخری شکست کے وقت تک برقرار رہنا اس امر کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ فوج کے لیے جو قواعد وضوابط بنائے گئے تھے، وہ بہترین قسم کے تھے۔ اس کی حکومت اگر چہ سخت اور مطلق العنان تھی، تاہم وہ ایک مہذب اور لائق حکمراں کی مطلق العنانی تھی۔'' ایک دوسرے موقع پر ڈائرم ہی نے لکھا کہ ٹیپو کے ''دانشمندانہ اقدام کی وجہ سے اس کا علاقہ نظام کے علاقے کے مقابلے میں بہت ترقی یافتہ ہے، زراعت بھی خوب ہوتی ہے، رعایا خوش اور مطمئن معلوم ہوتی ہے، اس برعکس دوسروں کی رعایا پر ہر طرف سے ظلم ہوتا رہتا ہے۔''

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ تیسری اینگلو میسور جنگ میں ٹیپو کو جو شکست ہوئی اس نے اس کی سلطنت کو دائمی طور پر کمزور اور اس کے ملک کو تباہ کردیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ کی پیدا کردہ تباہ کاری اور بدنظمی پر اس نے بڑی سرعت سے اس طرح قابو حاصل کرلیا تھا کہ اس کی

حکومت جلد ہی مستحکم اور موثر بن گئی اور ملک خوش حال ہوگیا۔ سرجان شور نے تسلیم کیا تھا کہ ''اپنے تجربوں کی بنا پر ہمیں اس کی لیاقت کا علم ہے۔ اس کے مشیر وصلاح کار تو ہیں، لیکن کوئی وزیر نہیں ہے۔ وہ خود معائنہ کرتا ہے، انتظام کرتا ہے اور خود ہی اپنی حکومت کی ادنا تفصیلات پر بھی نظر رکھتا ہے.. اس کی قلمرو کے کاشتکار مطمئن ہیں، انھیں ان کی محنت کا صلہ ملتا ہے اور ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ انگریزوں نے 1799 میں جب میسور کو فتح کرلیا تو ملک کی یہ خوش حالی دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی۔ یہ رائے ان لوگوں کی تھی جن کی ''کھلی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ'' تھیں، اور یہ اس امر کی واضح علامت ہے کہ اس کا سبب ٹیپو کے ''داخلی قوت کا غیر معمولی منبع'' تھا، اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے مقابلہ کرلیا ''ان تین جنگوں کے نتائج کا، جو ایک یورپی طاقت سے اسے لڑنی پڑی تھیں اور اس کے بعد بھی اس کی سلطنت برقرار رہی۔''

ٹیپو میں ''جدت پسندی اور تجسس کا بھی مادہ تھا جو اکبر کی یاد دلاتا ہے۔ نئی تقویم، ناپ تول اور پیمائش کے نئے پیمانے اور نئے سکوں کی ایجاد میں بھی وہ اپنی تخلیقی اہلیت صرف کیا کرتا تھا۔'' یہ سچ ہے کہ اس کی لائی ہوئی بعض تبدیلیاں غیرضروری تھیں، لیکن اس کی جدتوں کا مقصد بڑی حد تک انتظامِ سلطنت کو اور اپنی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ اس نے مسلم قمری تقویم کو بعض انتظامی دشواریوں کی بنا پر منسوخ کرکے اس کی جگہ پر ایک نئی تقویم روشناس کی جو قمری شمسی حساب پر مبنی تھی۔ نئے سکے جو اس نے جاری کیے اس میں حسن اور نفاست تھی۔ اس نے قحبہ گری اور نشہ آور اشیا کا استعمال ممنوع قرار دیا، کیونکہ اپنی رعایا کے حق میں اس نے مضر سمجھا تھا۔ وہ پہلا مشرقی حکمراں تھا جس نے ملکی انتظام میں مغربی طور طریقوں سے کام لیا۔ مغربی علوم کو وہ مشتبہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا، بلکہ ان سے اپنے ملک کے دفاع کا اور معاشی حالت کو بہتر بنانے کا اس نے کام لیا تھا۔ فرانسیسیوں سے اور انگریزی جنگی قیدیوں اور مفرورین سے اپنی فوج کو تربیت دینے کا، اسلحہ خانے کو نظم کرنے کا اور ملک کی پیداوار اور صنعت وحرفت میں مغربی طریقے کو روشناس کرنے کا کام لایا۔ اپنے ملک کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے وہ میسوری مصنوعات ہی استعمال کرتا تھا اور اپنے افسروں کو بھی ان کے استعمال کی ہدایت کرتا تھا۔ ان تمام اقدامات کی پشت پر خود کفالت کی وہ پالیسی کارفرما تھی، جو آج کی ریاستیں اختیار کررہی ہیں۔ تجارت کی اہمیت کو محسوس کرکے اس نے اپنے ملک کے سب سے بڑے تاجر کا روپ اختیار کیا۔ ملک اور بیرونِ ملک میں اس نے تجارتی کوٹھیاں قائم کیں اور بہت سے ملکوں کے ساتھ تجارتی روابط پیدا کیے۔

■

ماخذ: 'تاریخ ٹیپو سلطان'، مصنف: محبّ الحسن، مترجم: حامد اللہ افسر، عتیق صدیقی، اشاعت بارِ سوم: 2010، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کامیابی میں تعلیم و تربیت کی اہمیت

سمیع الدین خاں 'شاداب'

تعلیم حاصل کرنا دراصل وہ عمل ہے جس کے تحت آپ ان چیزوں، اُن واقعات، اور ان حقائق سے واقف ہوتے ہیں جن سے آپ ناواقف ہیں۔ لیکن علم اُس وقت ایک بوجھ بن جاتا ہے جب وہ طالب علم میں مصنوعیت پیدا کردے اور اُس کا حقیقی روپ، اُس کی سادگی چھین لے۔ علم جب بھی آپ کو دوسروں سے افضل ہونے اور دوسروں سے الگ ہونے کا احساس کرائے اور آپ کو محسوس ہونے لگے کہ آپ بہت زیادہ عالم و فاضل ہیں تو یقیناً وہ علم آپ کے ذہن کے اُن دروازوں کو بند کرنا شروع کردے گا جن دروازوں سے وہ خود آپ کے ذہن میں داخل ہوا تھا اگر آپ خود کو اپنے گرد و پیش سے افضل و اعلیٰ سمجھنے لگے تو تکبر و غرور کے شکار ہو جائیں گے اور وہ علم آپ تک پہنچنا بند ہو جائے گا جو آپ کو آپ کے چاروں طرف کی جانکاری دے رہا تھا۔ اِس طرح کا علم آپ کے لیے ایک وبال اور بوجھ ثابت ہوگا۔ تعلیمی عمل کے لیے یہ لازمی ہے کہ حصولِ علم کے جو بھی وسائل آپ کے چاروں طرف موجود ہیں اُن سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ منفی سوچ (Negative thinking)، خوف و ہراس، شک و شبہات آپ کو دھیرے دھیرے ناکامی کی طرف لے جاتے ہیں، اِس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اشیا، حالات، واقعات اور حقائق کو اسی طرح تسلیم کریں جیسے وہ ہیں۔ آپ منفی حالات اور مصائب پر حتی الامکان قابو پانے کی کوشش کریں اور کسی بھی صورت میں خوف و ہراس کا شکار نہ بنیں۔ آپ بہر حال اُن تراکیب پر غور کریں جو کہ منفی سوچ پر قابو پانے کے لیے ازحد ضروری ہوں۔ آپ اپنے گرد و پیش کے تمام ممکن وسائل کو پوری طرح، حوصلہ مندی اور سلیقے سے استعمال کریں اس سے آپ کی خوداعتمادی بڑھے گی اور چیزوں کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بہتر سوجھ بوجھ آپ میں پیدا ہوگی۔

> کامیابی کے لیے ایک بہت ضروری چیز ھے بااصول و پابندِ نظم و ضبط ہونا۔ تعلیم کا اصل مقصد تو ھے آپ کو جانکاری دینا اور تربیت کا بنیادی مقصد ھے آپ کو باضابطہ بنانا اور آپ کے کام میں آپ کی مہارت بڑھانا اس لیے یہ بہت ضروری ھے کہ آپ خود کو تربیت یافتہ (Trained) کریں۔ ہم سب کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ھی رہتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ایک کے بعد ایک مصیبت کا سامنا سب کو کرنا ھی پڑتا ھے لیکن محکم یقین اور قوت ارادی کی مضبوطی سے ہم ان مصائب کا سامنا کرسکتے ہیں۔ مصائب کے وقت ہمارا تربیت یافتہ ذہن ہماری سب سے زیادہ رہنمائی کرتا ھے۔ اس لیے ہمارے ذہن کی تربیت ایک خاص طریقے سے ہونا چاہیے۔

کامیابی کے لیے مثبت سوچ (Positive thinking) بہت ضروری ہے اور مثبت سوچ کے پیچھے بہت سے پہلو ہیں مثلاً آپ کی صحت، آپ کی پیشہ ورانہ کارکردگی (Professional Performance)، آپ کا خاندان، آپ کے دوسروں کے ساتھ تعلقات، آپ کا تنقیدی نظریہ، آپ کی اشیا واقعات و حالات کے تجزیہ کرنے کی صلاحیت وغیرہ۔ اگر اس میں آپ ہر مورچے پر کھرے اترنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے لازمی ہے کہ آپ تمام پہلوؤں کی اہمیت سمجھیں اور ہر ایک کے لیے ایک الگ پلان، ایک لائحہ عمل تیار کریں۔ اِس کے لیے آپ کو حصولِ علم کے ساتھ ہی ساتھ اس سے جڑے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اگر آپ صحیح پلاننگ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو آپ یقیناً اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہوں گے۔ آپ جو بھی کوشش کریں وہ کوشش اس طرح کی ہونی چاہیے جس سے آپ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ اگر آپ میں علم کے ساتھ ساتھ مضبوط قوت ارادی، اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مستقل مزاجی سے محنت کرنے کی صلاحیت، دوراندیشی، حالات سے مقابلہ کرنے کی قوت، جستجو اور مثبت سوچ موجود ہے تو یقیناً آپ کی یہ باتیں اور کوششیں آپ میں سمجھداری بڑھائیں گی اور آپ اپنا مقصد ضرور حاصل کریں گے۔

کامیابی کے لیے ایک بہت ضروری چیز ہے بااصول و پابندِ نظم وضبط ہونا۔ تعلیم کا اصل مقصد تو ہے آپ کو جانکاری دینا اور تربیت کا بنیادی مقصد ہے آپ کو باضابطہ بنانا اور آپ کے کام میں آپ کی مہارت بڑھانا اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ آپ خود کو تربیت یافتہ (Trained) کریں۔ ہم سب کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ایک کے بعد ایک مصیبت کا سامنا سب کو کرنا ہی پڑتا ہے لیکن محکم یقین اور قوت ارادی کی مضبوطی سے ہم ان مصائب کا سامنا کرسکتے ہیں۔ مصائب کے وقت ہمارا تربیت یافتہ ذہن ہماری سب سے زیادہ رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ہمارے ذہن کی تربیت ایک خاص طریقے سے ہونا چاہیے۔

ہم میں سے ہر ایک کو قدرت نے کم سے کم ایک خوبی سے ضرور نوازا ہے۔ یہ خوبی ہی دراصل ہماری شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ نمایاں رول ادا کرتی ہے اور یہی خوبی تازندگی ہمارا تشخص برقرار رکھتی ہے بس ضرورت ہے اس خوبی کو پہچاننے کی اور اس کو ترقی دینے کی۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ بہت سی سمتوں پر ایک ساتھ سفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی بہت سے کاموں پر ایک ساتھ اپنے تجربات کرتے ہیں جب کہ ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی سمت میں سفر کرنا ممکن ہے۔ جو لوگ بہ یک وقت بہت سے کاموں کو اپنے لیے چن لیتے ہیں وہ بالآخر اپنے لیے بہت سی مصیبتوں کے دروازے کھول لیتے ہیں اور ہر طرف سے مصائب کے انبار سے گھر جاتے ہیں اگر ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو ہم کو اپنی شخصیت کی اُسی خوبی کو بروئے کار لانا چاہیے جو قدرت نے ہم کو بخشی ہے۔

مصائب سے گھر جانے پر سب سے پہلے آپ کو خود سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ ''آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟'' اس سوال کا جواب دیتے وقت مثبت رویے کو اپنانا بہت ضروری ہے اور اِس سے بھی زیادہ ضروری ہے دوراندیشی۔ آپ مستقبل کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جتنا زیادہ ٹھوس فیصلہ کرتے ہیں وہ آپ کی کامیابی کے لیے اتنا ہی زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے اور فائدہ مند بھی۔ یہ یاد رکھیں کہ دوسروں سے کیے گئے صلاح مشورے میں ان کے ذاتی نظریات، ذاتی تجربات، اور ان کا اپنا ماحول شامل رہتا ہے دوسروں سے خصوصاً اپنے بہی خواہوں سے مشورہ لینا بہت ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری ہے آپ میں اُن مشوروں کے تجزیہ کرنے کی صلاحیت اور بہرحال آپ کو وہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے جو آپ کے لیے فائدہ مند ہو اس لیے خود سے جواب طلبی بہت ضروری ہے۔

آپ محسوس کریں، اور آپ کو اس بات کا احساس بھی ہوگا کہ آپ کے پاس قدرت کی دی ہوئی بہت سی طاقتیں موجود ہیں۔ صرف ضرورت اِس بات کی ہے کہ آپ اُن طاقتوں کو پہچانیں، تسلیم کریں اور جگائیں۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ آپ کا اٹھایا ہوا ایک صحیح قدم، ایک صحیح فیصلہ آپ کو منزل تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ آپ کو اپنے ایک ایک قدم، ایک ایک فیصلے کی اہمیت کو ماننا پڑے گا۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ اپنا پورا دھیان ہمیشہ اپنے مقصد کی جانب ہی مرکوز کردیں اور اپنے آپ سے بار بار یہ پوچھتے رہیں کہ ''آخر وہ کون سا راستہ ہے جو آپ کو منزل تک پہنچائے گا اور وہ کون سی راہ ہے جو آپ کو آپ کی منزل سے دور لے جائے گی؟'' بار بار یہ بھی پوچھیں کہ ''آپ کو آخر کار محدود وسائل کے ساتھ کیسے کام کرنا ہے؟'' اگر حالات ناسازگار ہیں تو اپنے کام کی منصوبہ بندی اِس طریقے سے کریں جو آپ کو مستقل بہتری کی جانب لے جانے والی ہو۔ یہ عمل دھیمی رفتار کا بھی ہوسکتا ہے اس سے نہ گھبرائیں بلکہ اپنے کام کو زیادہ توانائی اور بہتر طریقے سے کام میں دلچسپی لیتے ہوئے مسلسل کرتے رہیں۔ اِن حالات میں نتائج بھی توقع سے زیادہ بہتر آتے ہیں۔ ہاں، اگر یہ عمل ایسا ہو جس میں آپ کو دلچسپی ہی نہ ہو اور اس سے آپ میں تھکاوٹ پیدا ہو رہی ہو تو اِن حالات میں کام کو درمیان میں ہی عارضی طور پر روک کر اپنے لائحہ عمل پر غور ضرور کریں اور اگر ضرورت ہو تو اس میں ایسی تبدیلی بھی کریں جس سے آپ کی دلچسپی میں اضافہ ہو۔

ہمیشہ اس بات کا دھیان رکھیں کہ آپ کے اردگرد زیادہ ایسا نہیں ہے جو آپ کے ساتھ بدل جائے بلکہ زیادتی تو اُن حالات، اُن چیزوں اور اُن افراد کی ہے جو کہ آپ کے مطابق نہیں بدلیں گے اس لیے آپ کو بہتر طریقے سے حالات، اشیا اور افراد کو اپنے لیے کارگر بنانے کے لیے اُن کے ساتھ تال میل (Adjust) کرنا ہے۔ ہم کو حالات کے مطابق اُن کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی منصوبہ، کوئی تدبیر نہ تو ہمیشہ کے لیے بن سکتی ہے اور نہ ہمیشہ اور ہر حال میں کارگر ہوسکتی ہے۔

اِس طرح تعلیم آپ کو اُس دنیا کی جانکاری دیتی ہے جہاں آپ رہتے ہیں اور اُس طریقہ کار، اُس میکانزم کو بتاتی ہے جس کے تحت یہ دنیا اور اس کے مختلف شعبے کام کرتے ہیں۔ تعلیم آپ کو اردگرد کے ماحول سے واقف کراتی ہے اور ذہن کے اُن دریچوں کو کھولتی ہے جو آپ کے ذہن میں پورے جہان کی روشنی داخل کرتے ہیں اور یہ روشنی آپ میں اِس احساس کو جگاتی ہے کہ آپ بھی اِسی دنیا کا ایک نہایت کارآمد حصہ ہیں۔

اور تربیت اس دنیا میں زندہ رہنے اور کامیابی حاصل کرنے کا لائحہ عمل تیار کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ تربیت آپ کو نظم وضبط کا پابند بناتی ہے اور آپ میں کام کرنے کی مہارت پیدا کرتی ہے، آپ کی ذہنی تربیت کرکے آپ کو مصائب اور ناسازگار حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت دیتی ہے اور اُن خوبیوں کو پہچاننے میں مدد کرتی ہے جن کے باعث آپ کا تشخص برقرار رہتا ہے۔ تربیت ہی آپ کو صحیح فیصلہ کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور منزل تک جانے کی راہ تعین کرتی ہے آپ کو دنیا میں بہتر طور سے رہنے کے لیے اور یہاں ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے ماحول کے مطابق ڈھلنے (Adjust) کی صلاحیت دیتی ہے۔

صحیح تعلیم و تربیت سے آپ کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور شخصیت کے مضبوط اور کامیاب پہلوؤں کا ارتقا (Development) ہوتا ہے اور پھر کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے۔

□

Dr. Samiuddin Khan 'Shadab', Masjid Zuhooruddin, Goojartola, Rampur - 244901 (UP)

عبدالناصر فاروقی

لیموں کی افادیت واہمیت

لیموں کی افادیت صرف اس حد تک ہی نہیں ہے کہ اس کو روزمرہ کی غذاؤں میں مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ گھریلو علاج کے طور پر چھوٹی موٹی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے بھی یہ نہایت مفید اور شفا بخش ثابت ہوا ہے۔ لیموں جسے ہندی میں نیبو، بڑا نیبو یا پہاڑی نیبو اور انگریزی میں لیمن (Lemon) کہتے ہیں، ایک مشہور آسانی سے ملنے والا پھل ہے۔ اس کا نباتی نام Citrus lemon ہے۔ لیموں بیضوی شکل کا اور ہلکے زرد رنگ کا پھل ہے جس پر موٹا اور کھردرا پوست پایا جاتا ہے۔ پکنے پر اس میں بے رونق اور زرد رنگ کا گودا پیدا ہوجاتا ہے اور رس میں عرق بن جاتا ہے۔ قلیل مقدار میں تخم بھی پائے جاتے ہیں۔ بہترین لیموں وہ مانا گیا ہے جس کا چھلکا پتلا، اس رقیق اور ذائقہ ترش ہو۔ اس کو کاغذی لیموں بھی کہتے ہیں۔ لیموں کا رس دوسرے درجہ میں سرد خشک ہے۔ بعض اطباء اسے سرد بتاتے ہیں اور بیج گرم خشک ہیں۔ کاغذی لیموں کو استعمال کرنے سے پہلے اگر سینک لیا جائے تو اس کے رس میں بہت حد تک اضافہ ہوجاتا ہے۔

لیموں ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں بکثرت پایا جاتا ہے جنوب و مشرقی ایشیا میں زمانہ قدیم سے ہی اس کی کھیتی کی جارہی ہے۔ یہ پھل 12 ویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں یورپ پہنچا اور اب امریکہ، اسپین، پرتگال، فرانس، ویسٹ انڈیز اور نیو ساؤتھ ویلس میں اسے بکثرت اگایا جاتا ہے۔

لیموں کی دو قسم کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔ Limonine اور Limonene یہ دونوں مرکبات تقسیم خلیہ کے عمل کو روکتے ہیں جس سے کینسر سے بچاؤ ہوجاتا ہے۔ Limonine چھلکے کے سب سے بیرونی حصہ میں پایا جاتا ہے جو زردی مائل ہوتا ہے۔ لیموں کا عرق نکالتے وقت ناواقفیت کی بنا پر اکثر لوگ اسے ضائع کردیتے ہیں۔ یہ کیمیائی مادہ جگر میں موجود انزائم کی مقدار کو بڑھا کر کینسر پیدا کرنے والے زہریلے مادوں کو ختم کردیتے ہیں۔ چھاتی کے سرطان میں معاون ہارمون ایسٹراڈیول بھی اس کے اثر سے ختم ہوجاتا ہے۔

100 گرام لیموں میں مندرجہ ذیل اشیا پائی جاتی ہیں:

1	پروٹین	1.0%
2	چکنائی	0.9%
3	معدنیات	0.3%
4	کاربوہائیڈریٹ	11.1%
5	ریشے	1.7%
6	کیلسیم	7 ملی گرام
7	فاسفورس	10 ملی گرام
8	فولاد	2.3 ملی گرام
9	وٹامن سی	39 ملی گرام
10	وٹامن بی کمپلکس	قلیل مقدار میں

ایک بڑے لیموں میں تقریباً 45 ملی گرام وٹامن سی پایا جاتا ہے۔ سردی، زکام کو دور کرنے اور جلے کٹے زخموں کے اندمال میں وٹامن سی بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ وٹامن سی، Free radicals کے مضر اثرات کو کم کردیتا ہے، جس سے کینسر اور امراض جگر سے نجات مل جاتی ہے۔ جب جسمانی خلیات غذائی حراروں کو جلاتے ہیں تب یہ Free radicals جسم میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فضائی آلودگی، تمباکو کا دھنواں، تابکاری شعاعیں اور سورج کی روشنی وغیرہ سے بھی یہ وجود میں آجاتے ہیں۔ وٹامن سی جسم کے مدافعانہ نظام کو قوی کرکے Free radicals کے اثرات کو کم کردیتا ہے۔ لیموں میں ایک طاقتور مانع تکسیر (antioxidant) بھی پایا جاتا ہے جو کینسر کے خلاف بہت موثر ثابت ہوا ہے۔

لیموں کے اس کو ہی زیادہ تر مختلف قسم کے امراض میں ان کا استعمال بہت مفید ثابت ہوا ہے ان کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

(1) قبض اور بدن میں درد: 10 چمچی نیم گرم پانی میں 2 چمچہ عرق لیموں ملا کر ہر روز استعمال کرنے سے قبض اور بدن کے درد سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔

(2) موٹاپا: موٹے لوگ اپنی صحت کی طرف سے بہت فکرمند رہتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر لیموں کے رس کو پانی میں ملا کر روز پیتے رہیں تو بہت جلد وہ اس حالت سے نجات پاسکتے ہیں۔ عرق لیموں اور شہد کو ہم وزن مقدار میں روزانہ صبح کو پابندی سے استعمال کرنے سے جسم کی چربی کم ہوکر وزن معتدل ہوجاتا ہے۔

(3) منہ کے چھالے اور زخم: بعض لوگوں خاص طور سے بچوں کو منہ آنے کی شکایت ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے کھانا کھانے اور بولنے میں دشواری لاحق ہوجاتی ہے۔ اگر تازہ لیموں کے رس میں گرم پانی ملا کر غرغرے کرائے جائیں تو یہ مرض دور ہوجاتا ہے۔

(4) سردی زکام سے راحت: نزلہ و زکام میں عرق لیموں کو جوش دے کر اس میں شہد کا رس ملا کر پینے سے بہت جلد آرام ہوجاتا ہے۔

(5) معدہ کی خرابیاں: لہسن کے جوے کو 250 ملی لیٹر گرم پانی میں ابالیں۔ جب لہسن اچھی طرح پک جائے تو اس میں ایک چمچہ عرق لیموں اور بقدر ضرورت نمک ملالیں اس آمیزہ کو کچھ دیر تک ٹھنڈا کرنے کے بعد استعمال کریں۔

(6) جریان الدن: پھیپھڑے، معدہ، آنتوں، رحم، گردوں اور دوسرے اندرونی اعضا سے ہونے والے جریان الدم کو روکنے کے لیے عرق لیموں کو پانی کے ساتھ

دن میں کئی مرتبہ استعمال کریں۔

(7) ایڑی اور تلووں سے آنچ نکلنا: پیر کی ایڑی اور تلووں پر اگر لیموں کا ٹکڑا ملا جائے تو پیروں کے مسامات سے زہریلے مادہ نکل جاتے ہیں جس سے ایڑی اور تلووں کے درد اور بے چینی میں آرام ہو جاتا ہے۔

(8) قئے اور متلی: اس حالت میں لیموں کے دو ٹکڑے کر کے اس پر شکر لگا کر چوسنے سے یا اس پر پسی ہوئی کالی مرچ لگا کر آگ پر گرم کر کے چوسنے سے متلی اور قئے میں فائدہ پہنچتا ہے۔

(9) بدہضمی اور ضعف معدہ: بدہضمی کے علاج کے لیے دن میں چار پانچ مرتبہ ایک ایک لیموں کا رس پانی میں ملا کر پیتے رہنے سے فائدہ ملتا ہے۔ بدہضمی کو دور کرنے کے لیے لیموں کو ہلکی آنچ پر پکا کر پلپلا کر کے کھانے سے آدھا گھنٹہ قبل استعمال کرنے سے بھی کافی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سے ضعف معدہ کی شکایت بھی جاتی رہتی ہے۔

(10) گلے کا ورم اور سوزش: اگر عرق لیموں میں شہد کا رس ملا کر پیا جائے تو گلے کے ورم میں فائدہ ملتا ہے اور اس وجہ سے نگلنے میں جو پریشانی ہوتی ہے وہ بھی دور ہو جاتی ہے۔

(11) مسوڑھے کا زخم اور مواد: جن لوگوں کے مسوڑھے پھول گئے ہوں اور ان میں زخم بن گیا ہو، مواد کا اخراج ہوتا ہو اور منہ سے بدبو آتی ہو ان لوگوں کو لیموں کا رس گرم کر کے اس سے کلی کرنا چاہیے اور رات کو سونے سے قبل لیموں کو تھوڑا سا کاٹ کر مسوڑھوں پر آہستہ آہستہ ملنے سے چند دنوں میں ہی فائدہ نظر آنے لگتا ہے۔ چونکہ اس میں وٹامن سی پایا جاتا ہے اس لیے مسوڑھوں کے امراض، پائیریا، دانت کی سڑن وغیرہ میں بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

(12) ضیق النفس اور کھانسی: دمہ اور کھانسی کے مریض اگر روز رات کو سونے سے قبل اور بعد غذا لیموں کا رس پی لیا کریں تو اس سے ان کے امراض میں کافی کمی آسکتی ہے اور دمہ کا دورہ جلد نہیں پڑتا۔

(13) بخار کی شدت: ایک لیموں کو کاٹ کر اس پر تھوڑی سی سیاہ مرچ چھڑک کر آگ پر گرم کریں اور مریض کو چوسنے کے لیے دیں تو اس سے بخار کی تیزی میں کمی آجاتی ہے۔

(14) ہیضہ: ہیضہ کی وبا کے زمانہ میں لیموں کے چھلکے اور انار ترش کا پانی کافور کے ساتھ استعمال کرنے سے ہیضہ کے جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں۔

(15) امراض جگر: لیموں چونکہ معتدل صفرا بھی ہے اس لیے موسم گرما میں جب کہ صفراوی امراض زیادہ لاحق ہوتے ہیں تو ان سے جگر کے افعال میں بھی خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک گلاس میٹھے دودھ میں آدھے لیموں کا عرق چھینٹ کر پینے سے صفراوی عوارضات دور ہو جاتے ہیں۔ اور جگر کا فعل درست ہو جاتا ہے۔

ایک بڑے لیموں میں تقریباً 45 ملی گرام وٹامن سی پایا جاتا ھے۔ سردی، زکام کو دور کرنے اور جلے کٹے زخموں کے اندمال میں وٹامن سی بہت معاون ثابت ہوتا ھے۔ وٹامن سی، Free radicals کے مضر اثرات کو کم کر دیتا ھے، جس سے کینسر اور امراض جگر سے نجات مل جاتی ھے۔جب جسمانی خلیات غذائی حراروں کو جلاتے ھیں تب یہ Free radicals جسم میں پیدا ھوجاتے ھیں۔ اس کے علاوہ فضائی آلودگی، تمباکو کا دھنواں، تابکاری شعاعیں اور سورج کی روشنی وغیرہ سے بھی یہ وجود میں آجاتے ھیں۔ وٹامن سی جسم کے مدافعانہ نظام کو قوی کرکے Free radicals کے اثرات کو کم کردیتا ھے۔

(16) وجع المفاصل: جوڑوں کے درد میں لیموں کا عرق 3 سے 5 تولہ تک 4-4 گھنٹے کے وقفہ سے پلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کی ترشی اس مرض میں مضر نہیں ہے۔

(17) آشوب چشم: کاغذی لیموں کا رس چاکسو کے ہمراہ جست کے برتن میں ڈال کر محلول صورت میں استعمال کرنے سے آشوب چشم کو فائدہ پہنچتا ہے۔

(18) سر کا درد: لیموں کے 2 ٹکڑوں کو آگ پر سینک کر ماتھے اور کنپٹیوں پر مالش کرنے سے سر کا درد دور ہو جاتا ہے۔

(19) اختلاج قلب: اختلاج قلب کے مریضوں کے لیے باقاعدگی سے عرق لیموں کا استعمال مفید بتایا گیا ہے۔

(20) امراض جلد: بہق سیاہ، داد اور جھائیں پر لیموں کاٹ کر ملنے سے وہ بہت جلد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پھوڑے پھنسیوں اور پتی کے اچھلنے میں بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے متواتر استعمال سے مہاسے اور جھائیوں کے نشانات مٹ جاتے ہیں۔ انگل پیڑا میں لیموں کو خوب گرم کر کے اس کے دو حصے کر کے ایک حصہ ماؤف انگلی پر رکھ کر باندھنے سے مواد پک کر آسانی سے بہہ جاتا ہے۔ اگر ہاتھوں کا چمڑا پھٹ جائے تو عرق لیموں کی مالش کر کے اس پر موم لگائیں تو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ بالوں کے گرنے کی حالت میں عرق لیموں کو روغن سرسوں یا روغن بید انجیر کے ساتھ ملا لیں اور روزانہ رات کو بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔ اس سے سر کی بھوسی دور ہو جاتی ہے۔

(21) زخم: لیموں ایک بہترین دافع تعفن بھی ہے۔ اس لیے اگر کھیل کود میں گھٹنے یا ہاتھ پیروں پر چوٹ لگ جائے تو اس پر عرق لیموں لگا دینے سے وہ جلدی ٹھیک ہو جاتے ہیں اور ان پر جراثیم کا حملہ نہیں ہو پاتا۔

(22) بھڑ، تتیا کا کاٹنا: بھڑ، تتیا، مکھی اور بچھو کے کاٹے پر نوشادر یا نمک کو عرق لیموں میں حل کر کے لگانے سے درد اور سوزش میں فوراً آرام ہو جاتا ہے۔

(23) قرن یا ٹینٹ (Corn): لیموں کا ایک تازہ ٹکڑا لے کر اسے درد ناک پر رات میں باندھ دیا جائے اور پوری رات بندھا رہنے دیا جائے تو اس میں بہت حد تک آرام مل جاتا ہے۔

مذکورہ بالا فوائد کے علاوہ لیموں میں اور بھی بہت سے فوائد ہیں جن کے بارے میں ہم معلومات حاصل کر کے بہت سی بیماریوں کو دور کر سکتے ہیں۔

Dr. Abdul Nasir, Azad Apartment, RZ-2541/28, Tughlaqabad Ext. New Delhi - 110019

خواتین کے حقوق کا تجزیاتی مطالعہ

جانثار معین

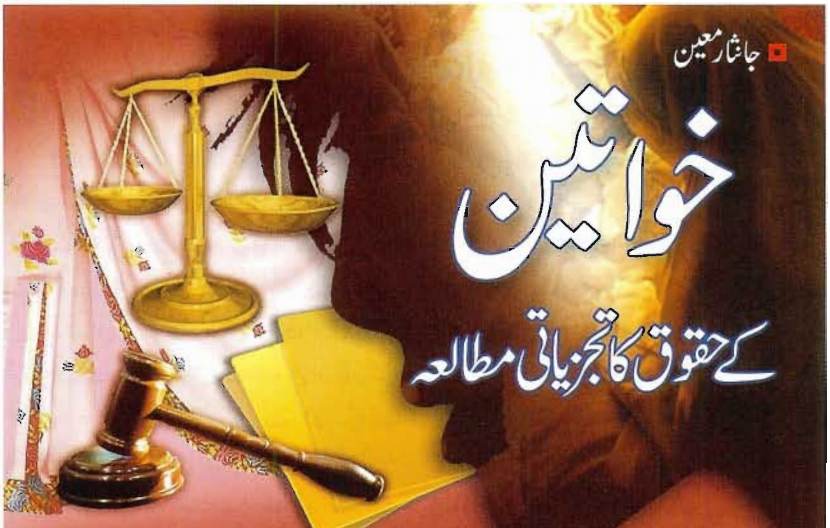

حقوق، حق کی جمع ہے 'حق' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی امر ثابت کے ہیں دوسرے معنوں میں حق فطرت کے عین مطابق ہو اور جس کا انکار ناممکن ہو۔ جب کوئی حق ثابت ہو تو اس کے لیے 'حق الامر' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ حق کے لغوی معنیٰ سچ، لائق، واجب، درست، بجا، جائز اور انصاف وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاحی معنیٰ مطابقت اور موافقت کے لیے ہے۔ یہ اسم ہے اور مذکر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ انسانی حقوق جبر و استحصال کی ضد ہے اور انسانوں کی ترقی و تعمیر کا ذریعہ بھی ہے۔ انسانی حق یا اس کے حقوق سے مراد ایسے ہیں جو انسان کو بحیثیت بنی نوعِ آدم ملے ہیں جن میں خاص کر انسان کو ازل سے طبعی موت تک جینے کا حق ہے۔ حقوق کی ابتدا سٹوئیک فلسفہ سے ہوئی اور ابتدائی حقوق انسانی قوانین اور فطری قانون سے ہوئی جو تمام حد بندیوں سے آزاد ہے اس ضمن میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948 کو انسانی حقوق کے لیے عالمی منشور کا اعلان کیا جو 30 دفعات پر مشتمل ہیں اور جسے ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی نے اپنی تصنیف میں یوں رقم کیا ہے:

1. تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار و حقوق کے معاملہ میں مساوی الحیثیت ہیں۔
2. ہر فرد نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی یا دوسرے نظریات، قومی و سماجی حیثیت املاک، پیدائش یا کسی اور حیثیت اور کسی بھی قسم کے امتیاز کے بغیر اس منشور میں صراحت کردہ تمام حقوق اور آزادیوں کا مستحق ہوگا۔
3. ہر فرد کو زندہ رہنے، آزاد رہنے اور اپنی جان کی حفاظت کرنے کا حق حاصل ہے۔
4. کسی بھی شخص کو نہ غلام بنایا جائے گا اور نہ محکوم رکھا جائے گا۔ غلامی اور غلاموں کی تجارت کی ہر شکل ممنوع ہوگی۔
5. کسی بھی شخص کو تشدد، ظلم وستم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جا سکے گا۔
6. ہر فرد کو قانون کی نظر میں بحیثیت فرد ایک تسلیم شدہ حیثیت حاصل ہوگی۔
7. قانون کی نگاہ میں سب کی حیثیت مساوی ہوگی اور انھیں کسی امتیاز کے بغیر یکساں قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔
8. ہر فرد کو آئین یا قانون کے ذریعہ ملنے والے بنیادی حقوق کے منافی قوانین کے خلاف با اختیار قومی ٹربونل کے ذریعہ موثر چارہ جوئی کا حق حاصل ہوگا۔
9. کسی شخص کو بلا جواز گرفتاری، نظر بندی یا جلاوطنی کی سزا نہیں دی جا سکے گی۔
10. ہر شخص کو اپنے بنیادی حقوق و فرائض کے تعین یا اپنے خلاف عاید کردہ الزامات سے برأت کے لیے آزاد و خود مختار اور غیر جانبدار ٹربونل میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا یکساں حق حاصل ہوگا۔
11. (1) کسی تعزیزی جرم کی صورت میں ہر فرد کو اس وقت تک بے قصور سمجھے جانے کا حق ہوگا جب تک ایسی کھلی عدالت میں اسے قانون کے مطابق مجرم ثابت نہ کر دیا جائے جہاں اسے اپنی صفائی کی تمام ضمانتیں فراہم کی گئی ہوں۔

(2) کسی فرد کو کسی ایسے ارادی یا غیر ارادی فعل کی بنا پر قابل تعزیر جرم کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا جو فی الواقع قومی یا بین الاقوامی قانون کے تحت تعزیر نہ ہو۔

12. کسی فرد کی خلوت، گھریلو زندگی، خاندانی امور اور خط و کتابت میں مداخلت نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے گا۔
13. ہر فرد کو بیرون ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہوگا۔
14. (1) ہر فرد کو ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے دوسرے ممالک میں پناہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔

(2) غیر سیاسی جرائم یا اقوام متحدہ کے اصول و مقاصد کے منافی اعمال کے سلسلہ میں مقدمات سے بچنے کے لیے یہ قابل استعمال نہیں ہوگا۔

15. (1) ہر فرد کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

(2) کسی فرد کو بلا جواز اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ شہریت کی تبدیلی کا حق سلب کیا جائے گا۔

16. (1) ہر بالغ مرد اور عورت کو بلا امتیاز نسل، شہریت یا عقیدہ شادی کرنے اور گھر بسانے کا حق حاصل ہوگا۔

(2) شادی زبان و شوہر کی آزادانہ مرضی و منظوری سے ہوگی۔

(3) خاندان، معاشرہ کا بنیادی اور فطری یونٹ ہے جو ریاست اور معاشرہ کی طرف سے مکمل تحفظ کا مستحق ہے۔

17. (1) ہر فرد کو تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہوگا۔

(2) کسی کو بلا جواز اس کی ملکیت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

18. ہر فرد کو فکر و خیال، ضمیر اور عقیدے کی آزادی حاصل ہوگی اور اس حق میں تبدیلی عقیدہ، اظہار عقیدہ، تبلیغ عقیدہ اور عبادت کا حق بھی شامل ہے۔
19. ہر فرد کو آزادی اظہار خیال کا حق حاصل ہے اور اس میں مداخلت کے بغیر کوئی بھی رائے رکھنے، کسی بھی ذریعہ سے اور سرحدوں کا لحاظ کیے بغیر خیالات و معلومات حاصل کرنے اور پہنچانے کا حق بھی شامل ہے۔
20. (1) ہر فرد کو پر امن اجتماع و تنظیم کا حق حاصل ہے۔

(2) کسی کو کسی خاص تنظیم سے وابستہ ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

21. (1) ہر فرد کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا منتخب نمائندوں کے ذریعہ شرکت کا حق ہے۔

(2) ہر فرد کو اپنے ملک کی سرکاری ملازمت کے حصول کا مساوی حق حاصل ہے۔

(3) حکومت کے اختیار کی اصل بنیاد عوام کی خواہش و مرضی ہوگی جس کا اظہار انتخابات کے ذریعہ آزادانہ رائے شماری اور خفیہ رائے دہی کی صورت میں ہوگا۔

22. ہر فرد کو اپنی باوقار زندگی اور تعمیر شخصیت کے لیے سماجی تحفظ کا حق ہوگا اور وہ قومی مسائی بین الاقوامی

تعاون کے ذریعہ اور ہر ریاست کے وسائل کے مطابق معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا مستحق ہوگا۔

23. (1) ہر فرد کو کام کرنے، اپنی پسند کا پیشہ منتخب کرنے، بہتر اور منصفانہ شرائط کا حاصل کرنے اور بیروزگاری سے تحفظ پانے کا حق ہوگا۔

(2) ہر فرد کو بلا امتیاز یکساں کام کی یکساں اجرت ملے گی۔

(3) ہر فرد کو بہتر اور منصفانہ معاوضہ حاصل کرنے کا حق ہے جو اس کی ذات اور اس کے خاندان کے لیے باعزت زندگی بسر کرنے کی ضمانت فراہم کر سکے اور ضروری ہو تو اس کے سماجی تحفظ کے لیے کچھ دوسرے ذرائع بھی مہیا کیے جائیں۔

(4) ہر فرد کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ٹریڈ یونین بنانے اور ان میں شامل ہونے کا حق حاصل ہوگا۔

24. ہر فرد کو راحت و آرام، تفریح، اوقات کار کے معقول تعین اور تنخواہ کے ساتھ چھٹیوں کا حق ہوگا۔

25. ہر فرد کو اپنی اور اپنے اہل خاندان کی صحت و خوشحالی کے لیے معقول معیار زندگی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے جس میں خوراک، لباس رہائش، طبی امداد ضروری سروس، بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے اور اسی نوعیت کے دوسرے حالات میں تحفظ بھی شامل ہے۔

26. (1) ہر فرد کو حصول تعلیم کا حق حاصل ہے۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی مکمل اور انسانی حقوق و آزادیوں کے احترام کو مستحکم بنانا ہوگا۔

(3) والدین کو اپنے بچوں کے لیے نوعیت تعلیم کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔

27. (1) ہر فرد کو معاشرہ کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے علوم و فنون سے لطف اندوز ہونے اور سائنسی ترقی کے ثمرات سے متمتع ہونے کا حق ہے۔

(2) ہر فرد کو اپنی سائنسی، ادبی یا فنی تخلیقات کے اخلاقی و مادی ثمرات کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔

28. ہر فرد پر ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی ماحول میں زندگی بسر کرنے کا مستحق ہے، جس میں منشور کے ان حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور ہونے کی ضمانت ہو۔

29. (1) ہر فرد پر اس معاشرے کی طرف سے ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ جس میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور مکمل نشو و نما ممکن ہے۔

30. اس منشور کے کسی بھی حصے کی ایسی تعبیر نہیں کی جائے گی جس کا مقصد کسی بھی ریاست، گروپ یا فرد کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے کا حق دلانا ہو جس کے ذریعہ وہ ان متعین حقوق اور آزادیوں ہی کا صفایا کر دے۔

(عصری اور اسلامی تصور امن ایک تقابلی مطالعہ: ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، قرآن و سنت اکیڈمی، نئی دہلی، 25، 2002، ص: 81,80,79,78)

ان دفعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد و خواتین دونوں کے حقوق مساوی ہیں۔ لیکن خواتین کو حقوق نہیں کے برابر مل رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ پست ہے۔ سوائے سوئیڈن، کینیڈا، ناروے، امریکہ اور فن لینڈ وغیرہ کے۔ ان کی اوسط عمر، تعلیمی قابلیت اور آمدنی کی شرح سب سے زیادہ ہے اس کے علاوہ کسی اور ملک میں خواتین کو مساوی حقوق حاصل نہیں ہے۔ اسی لیے اب ہندوستان میں سب سے زیادہ زیر بحث موضوع خواتین کو بذریعہ تعلیم با اختیار بنانا، قدامت پرست نقصاندہ روایت سے نبرد آزما ہونے کی قوت پیدا کرنا اور فرسودہ روایت کے خلاف مرد کے شانہ بہ شانہ خود اعتمادی کے ساتھ گھر کی ذمہ داریاں بہ حسن و خوبی نبھانا اور پرآشوب حالات ہو یا گھریلو ذمہ داریاں ہر وقت وہ اپنی مدد خود کر سکے اگر ماں بنے تو آنے والی نسلوں کی بہترین پرورش کر سکے تا کہ کئی خاندان فیضیاب ہو اور سماج و ملک کی ترقی میں بھی شعوری طور پر مشکلات کے موقعوں پر استقامت کے ساتھ حالات و دشواریوں کا مقابلہ کر سکے۔ مثلاً خاندانی معاملات، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی ان تمام شعبوں میں با اعتماد فرد کی حیثیت سے مثبت سوچ رکھ سکے اس کے علاوہ بہترین شریک حیات، ذہنی و جسمانی صحت کے درمیان توازن برقرار رکھ سکے بہ نسبت ناخواندہ خواتین کے۔ غیر تعلیم یافتہ خواتین اکثر و بیشتر حقوق سے محروم ہوتی ہے جس کے مضر اثرات بچپن کی شادیاں، دلہنوں کو زندہ جلانا، زنا بالجبر اور ستی جیسی مذموم رسوم وغیرہ۔ جب کہ مابعد جدید ہندستان میں خواتین کی آبادی تقریباً 48 فیصد ہے لیکن صرف 35 فیصد کا بنیادی تعلیم میں داخلہ ہوتا ہے جو پریشان کن دشواریوں کا سبب بنتا ہے۔ تعلیم نسواں سے متعلق مردم شماری کمشنر آف انڈیا سی چندرا مولی کے مطابق:

''سات سال اور اس سے زائد عمر کے درمیان خواندگی 74 فیصد درج کی گئی ہے ملک میں خواندگی کی شرح سال 2001 میں 64.83 فیصد تھی۔ ایک دہائی بعد ملک کی تعلیمی شرح میں 9.21 فیصد کا ریکارڈ اضافہ کیا گیا۔ سال 2011 میں مردوں کی خواندگی کی شرح 82.14 اور خواتین کی 65.46 ریکارڈ کی گئی جب کہ یہ فیصد 2001 میں بالترتیب 52.67 اور 53.67 فیصد تھا۔ ان اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواتین میں ناخواندگی کا 35 فیصد ہے جو باعث تشویش ہے۔ یوں تو ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک لڑکیاں تعلیمی سفر جاری رکھتی ہیں لیکن جہاں اعلیٰ تعلیم کا معاملہ ہے اس میدان میں لڑکیاں مزید پیچھے ہیں۔ پیشہ ورانہ کورسس اور ٹیکنیکل کورسس میں لڑکیوں کا تناسب لڑکوں کے مقابلہ میں بے حد کم ریکارڈ کیا گیا ہے۔ جامعات اور اس سے ملحقہ کالجوں میں لڑکیوں کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سماجی علوم کے علاوہ دیگر شعبہ جات میں لڑکیوں کا تناسب انتہائی کم ہے فی الوقت ہندوستان میں 227 جامعات کام کر رہی ہیں، جن میں 20 مرکزی یونیورسٹیاں، 109 ڈیمڈ یونیورسٹیاں اور 11 اوپن یونیورسٹیاں دیگر ریاستی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ ان جامعات میں پیشہ ورانہ کورسس اور دیگر تکنیکی کورسس میں لڑکیوں کی نمائندگی مایوس کن ہے۔

(Access on26thJan2012at2pm www.urdutahzeeb.net)

خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے 4 سے 15 دسمبر 1995 کو بیجنگ (چین) میں چوتھی بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں 189 ممالک خواتین کی سیاسی، سماجی، تعلیمی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے لیے پانچ سالہ منصوبہ پیش کیا۔ جسے سو ملکوں نے ایک ایجنڈا متفق رائے کے ساتھ قومی سطح پر۔ 1979 میں اقوام متحدہ خواتین حقوق کے لیے ایک بل پیش کیا، جسے پندرہ ملکوں نے منظور کیا۔ جس سے خواتین کو نہ صرف مساوات کا درجہ حاصل ہوا بلکہ وہ اپنی مرضی کے حکمراں کا انتخاب بھی ووٹ کے ذریعہ حاصل کر سکتی ہیں۔ ایچ سی لیڈر لکھتے ہیں:

''ووٹ کا حق حاصل کرنے کے لیے خواتین کو صدیوں انتظار کرنا پڑا۔ سب سے پہلے نیوزی لینڈ نے 1893 میں خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا۔ اس صدی میں صرف چوبیس خواتین ملکوں کی سربراہ کی حیثیت سے منتخب ہوئی ہیں۔ بین الاقوامی اسمبلیوں میں کل 10.5 فیصد نشستیں خواتین نے حاصل کی ہیں۔

1995 کے آغاز میں سوئیڈن نے دنیا کی پہلی ایسی کابینہ بنائی جس میں عورتوں اور مردوں کی تعداد برابر رکھی گئی۔

اقوام متحدہ میں 185 ممالک کے سفیروں میں سات خواتین شامل ہیں۔

دنیا بھر کی کابینہ میں خواتین وزرا کی تعداد گذشتہ دس سالوں میں دگنی ہوگئی ہے جو کہ 1987 میں 4-2 سے 1996 میں 8-6 ہوگئی ہے۔''

(HC Chaklader. Social Life in Ancient India, Faisalabad-1, 1987.pp88)

نیوزی لینڈ بین الاقوامی خواتین کو ووٹ کا حق دے کر حقوق انسانی کے لیے مشعل راہ بن گیا ہے۔ اس ملک کی پہلی کاوش سے خواتین کو ووٹ کا حق ملا جس سے وہ سیاسی، سماجی، تعلیمی، مذہبی اور اقتصادی زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی ممتاز حیثیت حاصل کر لی جن کی مثال اندرا گاندھی، سروجنی نائیڈو، مدر ٹریسا، جھانسی کی رانی، چاند بی بی اور رضیہ سلطانہ وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ آج تمام شعبوں میں خواتین نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ مرد سے کم نہیں۔ ان عظیم خواتین کی وجہ سے دیگر خواتین کو بھی اپنے وجود کا احساس ہوا اور یہ نصف حصہ خواتین کا مردوں کی زیادتی کی وجہ سے ان کے مساوی حقوق نہ صرف چھین لیے گئے ہیں بلکہ ان کے وجود کو بھی ختم کیا جا رہا ہے۔ آج پوری دنیا میں کم و بیش مادر جنین میں لڑکیوں کا قتل کیا جا رہا ہے تو کہیں ان کی تعلیم چھینی جا رہی ہے۔ ان منفی پہلوؤں سے لڑکیاں پیدائش سے موت تک ہر جگہ ناانصافی کی زد میں ہے اور ڈر و خوف ان کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے، کہیں باپ کی شکل میں حاکم ہے تو کہیں بھائی بنکر ماسٹر رولر کا کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ ہر وقت عورت بیوی، بیٹی، ساس، بہو، بہن، معشوقہ، طوائف چاہے کتنے ہی روپ میں خدمات انجام دے۔ اس کی تمام خوبیوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے جس کی وجہ وہ سماج میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور مرد اس پر ہمیشہ مسلط رہا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر ایک بلین ناخواندہ بالغان ہیں جن میں دو تہائی حصہ خواتین کا ہے۔ 130 ملین بچے جو کہ اسکول جانے سے محروم ہیں۔ ان میں دو تہائی تعداد لڑکیوں کی ہے۔ اگر ہم پچھلے بیس سالوں میں پرائمری اور سیکنڈری تعلیمی اداروں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ان ترقی پذیر ممالک میں ان کی شرح 38 فیصد سے بڑھ کر 78 فیصد ہو گئی ہے۔ عالم کاری کے موجودہ دور میں خواتین کی ملازمت اور تجارت غیر معمولی وسعت اختیار کر لی ہے۔ اسی لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں 1814 میں پہلی فیکٹری قائم کی گئی تھی جس میں 1859 تک فیکٹریوں میں 24 فیصد مزدور خواتین کا حصہ ہو گیا تھا، 2000 کے اعداد و شمار کے مطابق یہاں 16 سال سے زیادہ عمر کی خواتین 60 فیصد کام کر رہی ہیں جو آج امریکہ کی قوت کا 74 فیصد حصہ ہے۔ 1990 میں سوئیڈن کی محنت کش خواتین کا تناسب 55 فیصد تھا، غالباً یہی صورتِ حال دوسرے مغربی ممالک کی ہے۔

معاشی میدان میں خواتین چاہے کسی بھی حیثیت سے کام کر رہی ہوں، مگر بیش تر خواتین کو ایک ہی نوعیت کے کام کا معاوضہ مردوں کے مقابلے میں تین چوتھائی کم ملتا ہے، بہت سے ممالک میں تقریباً 71 فیصد سے زیادہ اور دنیا بھر میں 46-7 فیصد سے زائد پیشہ ور خواتین موجود ہیں۔

ترقی پذیر ممالک میں کل زرعی اجناس کی پیداوار میں خواتین کا تقریباً 55 فیصد حصہ ہوتا ہے۔

1993 میں اندازے کے مطابق خواتین کے گھریلو کام جو کہ وہ بغیر معاوضہ کے کرتی ہیں۔ مجموعی پیداوار کا تقریباً 10 سے 35 فیصد تھا، جس کا معاوضہ 11 کھرب ڈالر بنتا ہے۔

اقوام متحدہ عہدوں پر تقریباً 35-1 فیصد خواتین فائز ہیں جس میں سیکرٹریٹ بھی شامل ہے صرف 9.17 فیصد خواتین اہم انتظامی عہدوں پر فائز ہیں۔

2000 میں صنعتی ممالک میں مردوں کی طرح خواتین ورکرز کی زیادہ تعداد بھی سامنے آئی ہے لیکن معاوضہ ان کو مردوں سے کم ہی ملتا ہے۔

مستورات کی اس بدنصیبی سے ان کی آبادی پر بھی جانی مالی نقصانات ہر دن سرزد ہو رہے ہیں۔ جو آج ان کی آبادی مردوں کے مقابلے میں کم ہے، جب کہ تقریباً تمام ممالک میں مردوں سے زیادہ عمر پاتی ہیں۔ سو مردوں پر تقریباً 98.6 فیصد خواتین موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کسی ملک میں صورت حال مختلف بھی ہے اور عورتوں کی تعداد زیادہ بھی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں گزشتہ 20 سالوں میں بغیر شادی کے ولادت میں 50 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اب ہر چار میں سے ایک ایک گھر کی سربراہی میں اضافہ ہوا ہے۔ 1992 کے بعد خواتین کی اوسط عمر میں اضافہ ہوا ہے۔ 2025 میں ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر کی خواتین کی تعداد مشرق بعید، جنوب مشرقی ایشیا، لاطینی امریکہ، شمالی افریقہ اور سربیا میں دوگنی ہو جائے گی۔ اس وقت خواتین کی صحت کی صورت حال برائے ایچ آر سی سی:

''دنیا بھر میں خواتین کو صحت کے مسائل کا سامنا ہے۔ خواتین کی بیش تر تعداد ایچ آئی وی کا شکار ہو رہی ہے۔ کل مریضوں میں خواتین تقریباً 42 فیصد شامل ہیں۔ جب کہ 2000 میں ان کی تعداد پندرہ ملین ہونے کی توقع ہے۔ اندازے کے مطابق تقریباً 7 ہزار خواتین 20 ملین حمل ضائع کروانے کے کیس میں مر جاتی ہیں۔ حمل یا زچگی کے دوران ہر سال تقریباً 1585000 اور ہر روز 1400 خواتین مر جاتی ہیں۔ افریقہ میں یہ تناسب 13 میں سے ایک خاتون، جب کہ اس کے مقابلے میں امریکہ میں 3300 میں ایک ہے۔ دنیا بھر میں 43 فیصد صحتمند خواتین اور 51 فیصد حاملہ خواتین آئرن کی وجہ سے انیمیا کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

(پاکستان میں انسانی حقوق کی صورت حال 2005 پاکستانی کمیشن برائے انسانی حقوق، ایچ آر سی سی، ص 215)

بین الاقوامی سطح پر خواتین کی صحت کسی ملک میں پریشان کن ہے تو کہیں بہت اچھی اس کی اہم وجہ جسمانی تشدد ہے۔ ان پر تشدد ہمیشہ سے ہی بنا رہا وہ اپنے حقوق کے لیے مجبوراً دفتروں میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتی ہیں تو کبھی غیر مردوں کی پرائیویٹ سیکریٹری بنتی ہیں تو کبھی تجارت چمکانے کی لیے سیلس گرل کے کردار میں خدمت انجام دیتی ہیں اس کے علاوہ اپنے ایک ایک عضو کو سرِ بازار رسوا کیا تا کہ گاہکوں کو دعوتِ نظارہ دے سکے نہ جانے اور کتنے ہی روپ میں وہ اپنے حقوق کے خاطر اپنی حیثیت و عزت کو نیلام کرتی رہی ان سب کا نتیجہ مرد مسلط سماج ہے کیوں کہ اسے ہمیشہ دوسرے درجہ تک ہی محدود رکھا گیا جب کہ زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ بلکہ کئی جگہوں پر وہ مردوں سے آگے اپنے خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اس کے باوجود ہر روز میڈیا کے ذریعہ خواتین پر تشدد کی رپورٹس اور خبریں پڑھنے، سننے اور دیکھنے میں زیادہ تر خواتین سے متعلق ہی آتی ہیں ''دنیا کی ہر تیسری اور جنوبی ایشیا کی ہر دوسری عورت آج تشدد کا شکار ہے۔ امریکہ میں ہر چھ منٹ کے بعد ایک عورت زیادتی کا نشانہ بنتی ہے۔ پاکستان میں ہر سال ایک ہزار عورتیں غیرت کے نام پر قتل کی جاتیں ہیں۔ ہندوستان میں ہر چھ گھنٹے کے بعد ایک شادی شدہ عورت کو زندہ جلایا جاتا ہے اور ہر روز سات ہزار بچیاں پیدائش سے پہلے مار دیے جاتیں ہیں۔ یورپ میں چودہ سال سے چوالیس سال تک کی خواتین کا اپاہج پن یا وفات کی وجہ گھریلو تشدد ہے۔ جنوبی ایشیا میں ساٹھ فیصد سے زیادہ عورتیں گھریلوں تشدد کا شکار ہیں اور اسی خطے سے سالانہ ڈیڑھ لاکھ لڑکیاں اسمگلنگ کی جاتی ہیں۔ دنیا میں سالانہ پانچ سال سے پندرہ سال تک کی بیس لاکھ بچیوں کو جنسی کاروبار کے لیے اسمگلنگ کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں ہر دو گھنٹے کے بعد ایک زنا بالجبر کا واقعہ ہوتا ہے پاکستان میں چھپن لاکھ سے زیادہ خواتین جبری مشقت پر مجبور ہیں اور 80 فیصد کسی نہ کسی طرح گھریلوں تشدد کا شکار ہیں جبکہ یہ آبادی کا 52 فیصد حصہ ہیں۔ دنیا کی 80 فیصد سے زیادہ خواتین کسی نہ کسی گھریلوں تشدد کا

شکار ہیں ایک عالمی رپورٹ کے مطابق ہر سال 6 لاکھ افراد اغوا ہور ہیں ہیں جن میں 80 فیصد عورتیں اور بچیاں ہیں جن کو عالمی منڈی میں کسی دوسری جنس کی طرح خرید و فروخت کیا جاتا ہے۔ ان انسانوں کی تجارت سے آج ہر سال 12 بلین ڈالر سے زیادہ کا منافع کمایا جاتا ہے۔ سالانہ پانچ لاکھ عورتیں حمل اور زچگی کے دوران مر جاتی ہیں۔'' جنس کی بنیاد پر ہونے والے ظلم و زیادتی ہر دن اضافہ ہو رہے ہیں۔

حقیقی مساوات کا تعلق سماجی حقوق سے ہے۔ جس میں مردوں کی برابری، سیاسی معاشی اور سماجی حقوق کسی تضاد و شرائط کے بغیر مکمل حاصل ہوں جس کی ضمانت ریاست اور معاشرہ دے۔ ان موجودہ حالات میں خواتین کو حقوق کے لیبل پر سوائے جعل سازی اور دھوکہ کچھ نہیں ملتا کیونکہ اکثر و بیشتر خواتین کو سب سے زیادہ گھریلو زندگی میں عدم تحفظ کا شکار بنا دیا جاتا ہے مثلاً شوہر، خسر، ساس، دیور، اور نندیں ذمہ دار ہوتی ہیں۔ غیر شادی شدہ مستورات پر تشدد کے ذمہ داران کے والدین یا بہن بھائی ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی وجوہات میں زیادہ تر جائیداد، وراثت ہے، تنازعات، جبری شادی، غربت، غلط فہمی، ہونے والے خاوند کا احساسِ محرومی اور بے جا شک وغیرہ ہیں تمام مسائل میں جنوبی ایشیائی ممالک دیگر ملکوں کے مقابلے میں بہت زیادہ متاثر ہے۔ گھریلو تشدد کی شرح زیادہ تر غریب ناخواندہ افراد کی ہے جو اپنے حقوق سے بے بہرہ اور معاشی طور پر اپنے شوہروں پر انحصار کرتی ہوں، اس کے علاوہ اونچے طبقات میں بھی اندازے کے مطابق پانچ خواتین میں سے ایک گھریلو تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔ اس کی مختصر وجوہات بدمزہ کھانا پکانے سے بدچلنی جیسے سنگین الزامات شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ صحت ڈبلیو ایچ کے مطابق ''دنیا بھر میں ہر 6 میں سے ایک خاتون کو اپنے خاوند یا اپنے قریبی رشتہ دار مرد ساتھی کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور ہر 18 سیکنڈ میں ایک خاتون تشدد کا شکار ہوتی ہے۔'' اقوام متحدہ کے مطابق 125 ملکوں میں گھریلو تشدد کے خلاف سزاؤں کے لیے خصوصی قوانین موجود ہیں اور 139 ممالک میں خواتین اور مردوں کے درمیان برابری کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود خواتین مسلسل تشدد کا نشانہ بن رہی ہیں 10 میں سے 6 خواتین کو کم از کم ایک بار جسمانی یا جنسی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے خلاف تشدد کے خاتمے کے لیے 2008 میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون نے ایک مہم شروع کی تھی جس میں تمام ممالک پر زور دیا گیا تھا کہ وہ 2015 تک خواتین کے خلاف جنسی تشدد کے خاتمے کے لیے سخت تر قوانین تیار کریں اور ان کا اطلاق یقینی بنائیں۔

خواتین کسی بھی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ہمیں ترقی یافتہ معاشرہ بنانے کے لیے خواتین کو مساوی حقوق دینا، تشدد و استحصال کی روایات کو دفن کرنا اور مروجہ رجحانات کو یکسر بدل کر مثبت تبدیلی پیدا کرنا ہوگا کیوں کہ بدنصیبی سے قبائلی ہو یا جاگیردارانہ طبقے دونوں جگہ خواتین کے ساتھ

حقیقی مساوات کا تعلق سماجی حقوق سے ھے۔ جس میں مردوں کی برابری، سیاسی معاشی اور سماجی حقوق کسی تضاد و شرائط کے بغیر مکمل حاصل ھوں جس کی ضمانت ریاست اور معاشرہ دے۔ ان موجودہ حالات میں خواتین کو حقوق کے لیبل پر سوائے جعل سازی اوردھوکہ کچھ نھیں ملتا کیونکہ اکثر و بیشتر خواتین کو سب سے زیادہ گھر یلو زندگی میں عدم تحفظ کا شکار بنا دیا جاتا ھے مثلاً شوھر، خسر، ساس، دیور، اور نندیں ذمہ دار ھوتی ھیں۔ غیرشادی شدہ مستورات پر تش دد کے ذمہ دار ان کے والدین یا بھن بھائی ھوتے ھیں۔ ان واقعات کی وجوھات میں زیادہ تر جائیداد، وراثت ھے، تنازعات، جبری شادی، غربت، غلط فھمی، ھونے والے خاوند کا احساسِ محرومی اور بے جا شك وغیرہ ھیں تمام مسائل میں جنوبی ایشیائی ممالك دیگر ملکوں کے مقابلے میں بھت زیادہ متاثر ھے۔ گھریلو تشدد کی شرح زیادہ تر غریب ناخواندہ افرادکی ھے جو اپنے حقوق سے بے بھراور معاشی طور پر اپنے شوھروں پر انحصار کرتی ھوں

جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا ہے بلکہ متعصبانہ سماجی رویے اور استحصال بھی کیے جاتے ہیں۔ خاص کر نی اور غیرت کے نام پر قتل کئے جاتے ہیں جس کی شرح ہر سال ہزاروں میں تبدیل ہو رہی ہے۔ آج ترقی پذیر معاشروں میں صدیوں سے نسائی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ امر بڑا افسوس ناک ہے جو کسی بھی ملک کی بربادی کے لیے کافی ہے۔ لیکن ان حالات کے باوجود یورپی مستورات نے طویل جدوجہد کے بعد مساوی حقوق اور اپنی قدر منوالی ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ نسائی حقوق دینے سے قاصر ہے جس کے مضر اثرات ہیں خواتین کو زندہ درگور کرنا، جسمانی، روحانی، جذباتی، نفسیاتی اذیت، عصمت دری، جنسی بلیک میلنگ، چھیڑ چھاڑ ہوس کا نشانہ بنانا، نسائی تذلیل، دشمنیاں مٹانے کے لیے زبردستی شادیاں کرنا، جائیداد کے حصے سے محروم کرنا، زندہ جلانا اور اشتہار بازی کے لیے استعمال کر کے ان کی عزت و عفت کا جنازہ نکالنا۔ ان بھیانک جرائم کو مرد سماج تشویش اور تکلیف کے بجائے ہنسی مذاق اور تفریحی تذکرے کا موضوع بناتے ہیں یہاں تک کہ میڈیا بھی محض تفریحی پیش کش کا ہی ذریعہ بناتا ہے جب کہ خواتین کو آوازوں، فقروں اور اشاروں کنایوں سے بھی اذیت دینے کی سزا انڈین پینل کوڈ میں ہے۔ لیکن یہ قوانین ابھی پوری طرح سختی سے نافذ نہیں ہو رہے ہیں جبکہ خواتین کو مذاہب میں اعلیٰ مقام ہے مثلاً ویدگرنتھ میں دیوی کا درجہ حاصل تھا، منواسمرتی میں کہا گیا ہے: ''جس گھر میں عورت کی پوجا ہوتی ہے، وہاں بھگوان نواس کرتے ہیں اور جن گھروں میں عورتوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے، وہاں اصلاح کی ہر کوشش بے کار ہو جاتی ہے۔ (منواسمرتی 3-65)

بائبل کے مطابق عصمت دری کی سزا موت ہے۔ (ایکسوڈس 2014 ڈیوٹرونومی 22:22)۔ یہودیوں کے مذہبی صحیفہ میں عصمت دری یا زنا کے مجرم کو برسرعام سنگسار کر کے ہلاک کر دینے کی سزا ہے۔ (جیوش مشنہ، 11-7,1)

قرآن پاک میں زانیوں اور عصمت دری کے مجرموں کو سرعام سو کوڑے مارنے کی سزا مقرر کی ہے اس کے علاوہ برطانوی قانون میں بھی پہلے عصمت دری کے مجرم کو خصی کر دیا جاتا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے 1258 میں اس فعل کے لیے موت کی سزا مقرر کی تھی کیونکہ خواتین محض ایک جنسی وجود نہیں ہے بلکہ وہ ایک مکمل شخصیت کی مالک ہے وہ جذبات اور احساسات بھی رکھتی ہیں۔ سماج میں اس کے متعدد رول ہیں۔ وہ نسلوں کو پالنے، پوسنے اور تربیت کرنے کے اہم ترین فریضہ کی حامل ہے۔ مرد سماج اس کی ممتا، شفقت، رحم دلی، مہربان فطرت، ایثار اور اس کی محبت کا مرہون منت ہے۔ اپنی مکمل شخصیت اور خدمات کے اعتبار سے عورت انتہائی عظمت و احترام کی حقدار ہے۔

■

Jannisar Moin, Maulana Azad National, Urdu University, Hyderabad - (A.P)

مصنف: بھنور لال بھرمر
مترجم: ڈاکٹر محمد ہادی رہبر

راجستھانی کہانی

باتیں

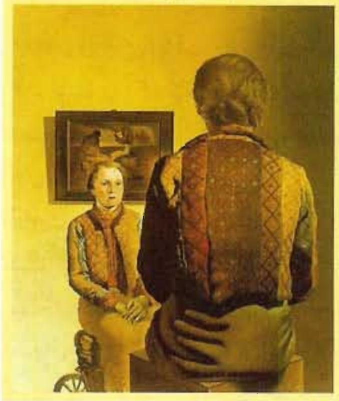

میں ناول پڑھنے میں مگن تھا۔ چاروں طرف اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک کتے بھونکنے لگے، کوئی انجان شخص گلی میں آیا ہوگا، میں نے سوچا، شرما صاحب کا کوئی ملنے والا آیا ہوگا یا پھر بدھڑا دارو پی کر لوٹا ہوگا۔ میں پھر سے مطالعے میں مشغول ہوگیا۔

اتنے میں میرے ہی دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا اٹھی۔ کانوں میں جھنجھناتی ہوئی کنڈی کی آواز مجھے کھلنے لگی۔ ناول اتنا دلچسپ تھا کہ میں نے کنڈی کی آواز کو نظر انداز کر دیا۔ کنڈی اور زور زور سے بجنے لگی۔ میں نے سوچا اب تو اٹھنا ہی پڑے گا، یہ سوچتے ہوئے میں نے ناوقت آنے والے کو دل ہی دل میں ایک بھدی سی گالی دی، غصہ جو آ گیا تھا۔ غصے کو ضبط کرتے ہوئے ناول کو پھینکتا ہوا بے دلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سوچا دروازہ کھول ہی دوں۔ کہیں اسے کتے کاٹ نہ کھائیں۔ اوپری منزل پر بنے ہوئے کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ پپو کی ماں جاگ اٹھی۔ اس نے مجھے رکنے کو کہا، 'آپ پڑھتے رہیں، دروازہ میں کھول دیتی ہوں۔' میں نے سوچا اتنی رات گئے کون آیا ہوگا؟ میں ناول اٹھا کر دوبارہ پڑھنے لگا، جس کے بمشکل پندرہ سولہ صفحے رہ گئے تھے۔ 'سنتے ہو.....دیکھو تو کون آئے ہیں!' پپو کی ماں کی آواز سنائی پڑی۔ جواب دینے سے پہلے ہی میرا منھ کڑواہٹ سے بھر گیا۔ سوچا کہ اس کا ہی کوئی سگا سمبندھی آیا ہوگا، تبھی تو اتنی خوش دلی سے آواز دے رہی ہے۔ کمبخت رات کو بھی چین کی نیند سونے نہیں دیتے۔ اگر بہن ہی سے ملنا تھا تو دن میں کیوں نہیں آجاتے! اب کون سا پردیش سے آیا ہے۔ پر ان کو تو دن بھر کی کمائی سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ہاں آؤ، بہن سے ملنے ضرور آؤ، لیکن آنے کا وقت بھی تو دیکھنا چاہیے! اب ایسی بھی کیا آفت آن پڑی کہ آدھی رات میں آنا پڑا۔ بہن کو بلانے آیا ہوگا۔ ابھی کہے گا کہ ماں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی یا پتا جی کے پیر میں چوٹ آ گئی، فوراً بلایا ہے، جیسے کہ یہ ڈاکٹر ہی ہو۔

'سنا نہیں آپ نے؟ آپ کے جیجا جی آئے ہیں...'

پپو کی ماں نے اونچی آواز میں ایک بار پھر کہا۔ میں نے سوچا کون سے جیجا جی آئے ہیں اور بھلا اس وقت کیوں آئے ہیں! میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے خیر مقدم کے لیے آنگن میں آ گیا۔ انھیں دیکھ کر مجھے جھلاہٹ ہوئی حالانکہ میں نے تپاک سے ہاتھ ملا کر پوچھا، آج کافی دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے؟ کل میں آپ کے آنے کا سوچ ہی رہا تھا اور آج دیدار ہو گئے۔ آیئے کمرے میں چلیں۔'

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انھوں نے کہا، 'بس، یوں ہی آپ کی یاد آ گئی، ملنے چلا آیا۔ آپ تو صرف کہتے ہی ہیں، کبھی آتے تو ہیں نہیں۔ کل پرسوں تک گھر تشریف لے آئیں۔'

'آؤں گا ضرور آؤں گا! کیوں نہیں! اور تو سب خیریت ہے؟' کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے پوچھا اور ان کو غور سے دیکھنے لگا۔

ہاں، سب ٹھیک ٹھاک ہے...' چارپائی پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے کہا۔ میں ان کے لیے نیچے سے ٹھنڈے پانی کا لوٹا بھر لایا۔ ان کے پانی پی لینے کے بعد لوٹے کو واپس تھامتے ہوئے میں نے پوچھا، 'آج کیسے آنا ہوا!'

'بس یوں ہی آ گیا۔ ملنے کی خواہش ہوئی...' ان کی بات سن کر میں خاموش ہو گیا۔ آگے کیا بات کروں؟ تھوڑی دیر تک انھیں دیکھتا رہا۔ سوچا شاید یہی کچھ پوچھیں! لیکن وہ تو مجھ ہی کو دیکھتے ہوئے خاموشی سے بیٹھے رہے۔ شاید وہ ہماری طرف سے کسی اور سوال کے انتظار میں تھے۔

میں اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ کیا بات کروں؟ تھوڑی دیر یہی سوچتا رہا۔ کبھی پنکھے کو گھورتا تو کبھی ریڈیو کی طرف دیکھتا۔ ہم دونوں اسی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر جھانکنے کے بعد میں نے آواز لگائی، 'سنتی ہو، جلدی سے دو کپ چائے بنالاؤ۔'

'یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں نے تو اسی وقت ہی پتیلی چڑھا دی...' اس نے جواب دیا۔

' اور کیا حال ہے...؟' میں نے بات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

بس! سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ گاڑی چل رہی ہے...' انھوں نے کہا۔ مجھے امید تھی کہ وہ بھی کچھ پوچھیں گے، لیکن جواب دینے کے بعد وہ بے فکر ہو گئے تھے۔ ہم دونوں ہی خاموش۔ بڑی مشکل سے تو میں نے بات شروع کی تھی، ان کو خاموش دیکھ کر میں چھت کو گھورنے لگا۔ اچانک میرا دھیان ریڈیو کی طرف گیا۔ آگے پیچھے ریڈیو اسٹیشن کی سوئی کو گھمایا آدھی رات کو ریڈیو اسٹیشن کہاں سے بجتا، میرے چہرے پر گھبراہٹ سی نمودار ہوئی، پھر بھی ان کا منھ نہیں کھلا۔

میں نے 'درشن دو گھنشیام' کی دھن منھ سے نکالی ہی تھی کہ وہ چونک کر بولے، 'ایں؟' میں نے کہا 'بس یوں ہی، کچھ نہیں۔'

پھر میں نے کمرے میں رکھی ہوئی تمام چیزوں پر نظر ڈالی، لیکن کہیں بھی کوئی نیا پن نظر نہیں آیا۔ میں نے چادر کو بھی ٹھیک کر لیا تھا۔ ہاتھوں پیروں کی انگلیوں کو بھی دو دو بار چٹخا چکا تھا۔ انگڑائی لیتے ہوئے دو چار جماہیاں بھی لے لیں تھیں، لیکن ان کی طرف سے تو بات شروع ہی نہیں ہوئی۔ اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔

میں سوچنے لگا یہ میرے سگے جیجا جی ہیں، کیا انھیں یہی وقت ملا تھا آنے کو۔ ہاں ان کا کیا قصور؟ دن میں مزدوری کرنے جو چلے جاتے ہیں۔ پانچویں درجہ تک پڑھنے کے بعد جلدی ہی کام پر لگ گئے تھے۔ آج کل سات آٹھ روپے روزانہ کما لیتے ہیں۔ میں انھیں پورا مان سمان دیتا ہوں۔ ویسے ہماری برادری میں جمائی کا سسرال میں زیادہ جانے کا رواج نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے ان سے دو چار بار کہا تھا کہ یہ گھر آپ کا ہی ہے۔ جب بھی دل چاہے تشریف آسکتی ہے باتیں کیا کریں گے۔ اس کے بعد یہ کئی مرتبہ آئے ہوں گے، لیکن ہماری بات کبھی نہیں ہوسکی۔ یہ میرے ہم عمر ہیں، لیکن کام میں ہم دونوں کے فرق ہے! یہ پیشے سے راجگیر ہیں اور میں ٹیچر۔ وہ میرے کام سے ناوقف ہیں اور میں ان کے کام سے۔ کچھ تو آپسی رشتہ اور کچھ تکلف درمیان میں حائل تھا۔

ویسے تو میں دنیا بھر کی باتیں کر لیتا ہوں۔ اسکول میں اساتذہ اور طلبہ کے مابین گھنٹوں لکچر جھاڑ سکتا ہوں۔

دوستوں کی محفلوں میں گپیں ہانکنے لگوں تو لاکھ بلانے پر بھی نہیں اٹھتا۔ لیکن یہاں تو بولتی ہی بند تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں کے درمیاں کوئی بڑی کھائی حائل ہو۔ مجھے تو بات کرنے کے لیے کوئی جملہ ہی نہیں سوجھ رہا ہے۔ یہ جب بھی آئے ہیں، ہمارا وقت اسی طرح گزرا ہے، بالکل خاموش۔

انھیں بھی تو کچھ نہ کچھ بولنا چاہیے۔ میں اکیلا ان سے کیا کیا پوچھتا رہوں؟ آخر میں نے ایک سوال اور اچھالا، 'آج کل کام دھندا کہاں، کیا چل رہا ہے؟'

'یہیں رامپوریوں کی حویلی کے پاس ایک مکان بن رہا ہے، وہیں کام کرتا ہوں۔'

'محنتانہ کتنا کچھ مل جاتا ہے۔'

'آٹھ روپے روز کی مزدوری ہے ان دنوں۔'

ہم دونوں پھر چپ ہو گئے۔ میں ادھر ادھر تاک جھانک کرنے لگا۔ چارپائی کے نیچے چوہا کترکتر کرنے لگا تھا، اسے بھگایا۔ پھر چادر کی سلوٹوں کو درست کیا۔ پنکھے کو تھوڑا تیز کیا تاکہ کمرے کا سناٹا کچھ تو ٹوٹے۔ میں اس خاموشی سے عاجز آ گیا تھا۔

'آج تو بہت گرمی ہے ...' میری بات کو سن کر وہ صرف ہوں ... کر کے رہ گئے۔

میں نے ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا، آخر یہ اتنی رات گئے کیوں آئے ہیں؟ ایسا کون سا کام آ پڑا! روپے پیسے کی ضرورت ہو سکتی ہے اور یہ شرم کی وجہ سے مانگنے کی ہمت نہیں کر پا رہے ہیں۔ پھر میں سوچنے لگا کہ انھوں نے روپیہ مانگ ہی لیا تو میں کیا کروں گا؟ میرے پاس تو نقدی کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ پہلی بار مانگیں گے، اس لیے منع تو نہیں کر پاؤں گا۔ لیکن مجبوری ہے۔ خود کا خرچ ہی بڑی مشکلوں سے جیسے تیسے چل رہا ہے۔ تعلیم یافتہ معاشرے میں اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے، خرچ تو ہوتا ہی ہے۔ اگر انھوں نے مانگ ہی لیا تو پھر کہیں سے بھی کوشش کر کے انھیں تو دوں گا ہی، لیکن یہ تو اپنے آپ میں پہیلی ہیں۔ کچھ نا کچھ کام تو ضرور ہوگا، تبھی تو اس وقت آئے ہیں۔

ایک بار اور رات ہی میں آئے تھے۔ اس مرتبہ بھی ایسے ہی مونی بابا کی شکل بنائے بیٹھے رہے۔ چائے پینے کے بعد جب واپس جانے لگے تو سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے دھیرے سے بولے تھے، 'آپ کو ایک تکلیف دے رہا ہوں! ایک ایک روپے والی گڈی لا دیں۔ ضرورت ہے۔'

میں نے دوسرے ہی دن بینک سے ایک نئی گڈی لاکر دے دی۔ وہ بہت خوش ہوئے، جیسے میں نے ان پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔ دیکھیں، آج کیا کام بتاتے ہیں۔

'چائے لیجیے۔' پپو کی ماں کی آواز سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔ پیتے پیتے ہم دونوں کی نظریں اچانک دوچار ہوئیں، لیکن منہ نہیں کھلا۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں ان کو ہی دیکھتے ہوئے اس انتظار میں تھا، کہ دیکھیں اب کچھ کہتے ہیں۔ انھوں نے تیزی کے ساتھ چائے ختم کی اور آہستہ سے کپ اور پلیٹ نیچے زمیں پر رکھ دیے۔ آہستہ سے کھنکھارتے ہوئے سنبھل کر بیٹھ گئے، مجھے لگا کہ اب وہ ضرور کچھ کہیں گے۔ لیکن وہ تو کچھ بھی نہیں بولے۔ میں بھی چائے پی چکا تھا۔ پیالی زمین پر رکھتے ہوئے میں نے اپنائیت سے بھرے لہجے میں پوچھا، 'اور کیا حال چال ہے جی؟'

وہ کچھ بولے نہیں۔ میں دل ہی دل میں ان کا موازنہ ایسے لوگوں سے کرنے لگا، جو بہت دیر تک کھڑے رہیں گے، لیکن کوئی خاص بات نہیں کر پاتے۔ ملتے ہی پوچھیں گے ضرور ... 'کیا حال چال ہے؟'

'ٹھیک ہے۔'

'اور سنائیے ...!'

'کیا سناؤں، گاڑی چل رہی ہے آپ کی دعا سے۔'

'اور؟'

'تمھیں سناؤ!'

'اچھا چلیں دوست۔ پھر ملیں گے۔'

پندرہ بیس منٹ کی ملاقات میں صرف اتنی سی باتیں ہوتی ہیں۔ یہی بات میرے اور جیجا جی کے ساتھ ہوئی۔

اب میرے صبر کا پیمانہ بھر چکا تھا۔ کیا معلوم، جیجا جی کچھ کہیں گے بھی یا نہیں۔ آخر کار مجھے ہی پھر پوچھنا پڑا، 'اور سنائیے ....!'

'کیا سنائیں .... سب ٹھیک ہے۔'

'میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے!'

'نہیں، نہیں۔ کچھ نہیں۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگے، 'اچھا اب چلوں گا۔'

میں نے تکلفا کہا، 'رکیں اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو پونے بارہ ہی بجے ہیں!'

'بس، اب چلوں گا۔ بہت دیر ہوگئی۔ آپ کو بھی تکلیف دی!'

'نہیں جی، اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ آپ ہی کا گھر ہے۔ جب بھی دل چاہے ضرور تشریف لائیں۔ کبھی کبھی تو دیدار کرا دیا کریں۔'

'ٹھہریے، کھانا تیار کرا دیتا ہوں۔ کھانا کھا کر جائیں۔'

'ابھی تو چلوں۔ پھر کبھی آؤں گا۔'

'اچھا جیسی آپ کی مرضی....'

'ہاں، اب نہیں رک سکتا....' اتنا کہہ کر وہ سچ مچ روانہ ہو گئے۔ میں انھیں گلی کے کنارے تک پہنچانے آیا۔ سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے بولے، 'اچھا، چلوں۔'

'میں جانے کے لیے کیسے کہہ سکتا ہوں؟'

'اچھا، رام رام۔'

'رام رام۔ پھر کبھی آئیں ...' کہہ کر میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا، چلو، اب تو پیچھا چھوٹا۔ کمرے جا کر ناول ہاتھ میں لیا، حالانکہ وقت زیادہ ہو گیا تھا، اس لیے بتی بجھا دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ پپو کی ماں کی آواز سنائی پڑی، 'سو گئے کیا!'

'ہوں! نیند آ رہی ہے،' کہہ کر میں نے کروٹ بدل لی۔

'کیا باتیں ہوئی جیجا جی سے؟'

'کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔'

'پھر بھی، کیا کہہ رہے تھے؟'

'بس، ایسے ہی آئے تھے۔ کچھ نہیں کہا۔'

'ایسے کیسے؟ کچھ تو کہا ہی ہوگا!'

'ارے، کچھ نہیں۔ وہ تو صرف ملنے کے لیے ہی آئے تھے۔'

'لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ گھنٹے بھر تک گپیں ماریں، پھر بھی کہتے ہو کچھ بھی بات نہیں ہوئی۔ اب بتاؤ بھی تو جانیں!'

'تمھاری قسم! انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔' اس کی ہر بات میں قسمیں کھانیں کی عادت ہے، آج میں نے بھی اسے خاموش رکھنے کے لیے اسی کا ہتھیار اسی پر آزمایا۔

'لیکن کچھ تو کہا ہی ہوگا! بھانجی کی سگائی کی بات کر رہے تھے۔'

'نہیں ایسی بات نہیں ہے۔'

'بس آپ تو کچھ بتاتے ہی نہیں۔ آج کل بہت سی باتیں مجھ سے بھی چھپانے لگے ہو۔ میں تو آپ کو ساری باتیں بتا دیتی ہوں۔' ایسا کہہ کر وہ ناراضگی سی ظاہر کرنے لگی۔

میں نے ذرا سی تیز آواز میں کہا، 'کہہ دیا نہ، انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا.... تم یقین تو کرو!'

یہ سن کر اس نے اس وقت تو کروٹ بھلے ہی بدل لی، لیکن آج تک اس کے اندر یہ تجسس باقی ہے کہ ہم دونوں میں اس رات کیا باتیں ہوئیں تھیں!

□

Mohammad Hadi Rahbar, 265, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 110067

سماجی میڈیا: تیزی سے ابھرنے والی جمہوری طاقت

تنزیل اطہر

انسان نے ہر زمانے میں اپنی بات کہنے اور اپنے احساسات و جذبات لوگوں تک پہنچانے کے لیے الگ الگ طریقے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ قدیم زمانے میں جب لوگ تہذیب کی روشنی سے دور زبان و بیان سے ناواقف تھے تب بھی وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ البتہ طریقہ مختلف تھا۔ پرانے زمانے میں انسان اپنی بات چیخ، چلا کر کہتا تھا یا پھر رقص و موسیقی کے ذریعے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وقت بدلا، لوگوں کے کمیونیکیشن کے طریقے بھی بدلے۔ چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد لوگ لکھ کر لوگوں تک اطلاعات و معلومات پہنچانے لگے۔ لیکن انیسویں صدی میں برقی نظام مواصلات کی ایجاد نے کمیونیکیشن کے طریقے کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا۔ پہلے ریڈیو پھر ٹی وی اور اب انٹرنیٹ نے پوری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ لوگ اب گھر بیٹھے انگلی کی ایک جنبش سے پوری دنیا کی خبر معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن انسان کی خوب سے خوب تر کرنے کی خواہش اب بھی پوری نہیں ہوئی۔ اپنوں سے ملنے، ان سے باتیں کرنے دوستوں سے بھی اپنی بات شیئر کرنے کے لیے اس نے انٹرنیٹ کی دنیا میں ایک ایسا جال بنا جسے ہم سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کہتے ہیں۔

کیا ہے سماجی میڈیا

سوشل میڈیا سے مراد دراصل فیس بک، ٹویٹر، لنکڈ ان، گوگل پلس، مائی اسپیس اور یوٹیوب جیسے تمام دیگر ویب سائٹس ہیں جن سے دنیا بھر میں کروڑوں لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ ان ویب سائٹوں کے ذریعے لوگ اپنی باتیں ایک دوسرے سے شیئر (share) کرتے ہیں، مستقبل کے منصوبے بناتے ہیں۔ تیز، آسان اور مفت سروس ہونے کی وجہ سے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس عوام میں کافی مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں نہ تو زمان و مکاں کی کوئی پابندی ہے اور نہ سنسر شپ کا ڈر، بس جو دل میں آئے لکھتے اور کہتے جائیے۔ بات کہنے کی پوری آزادی یعنی Sharing & Linking سوشل میڈیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ پوری دنیا میں ظلم، استحصال کے خلاف اور جمہوریت کی چاہت رکھنے والے لوگ سوشل نیٹ ورکنگ کے ذریعے اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ سماج کے بڑے حلقے پر اثر انداز ہونے والے سوشل میڈیا کی شروعات آخر کب اور کیسے ہوئی، آیئے جانتے ہیں۔

سماجی میڈیا کی تاریخ

تکنیکی دنیا میں سوشل میڈیا کی شروعات 70 کی دہائی میں ہوئی۔ اس دور میں کمپیوٹر سے دلچسپی رکھنے والے Christensen Ward اور Randy Suess نے کمپیوٹر پر ایک ایسا bulletin board system بنایا جس کے ذریعے وہ اپنے دوستوں سے اطلاعات و معلومات شیئر کر سکیں۔ اس کے بعد 1993 میں ورلڈ وائڈ ویب www کی ایجاد سے سوشل میڈیا کو جیسے پنکھ لگ گئے ہوں۔ نوے کے آخری عشرے میں Geocities اور Blogger نے سوشل نیٹ ورکنگ کو اور مضبوطی دی۔ اس کے بعد MySpace، Orkut، Facebook, Twitter, Google+ جیسے بڑے سوشل میڈیا وجود میں آئے۔ اب یہ ویب سائٹس لوگوں کی زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔

اہم سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس

ورلڈ وائڈ ویب پر یوں تو سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کی تعداد ہزاروں میں ہے، لیکن یہاں کچھ بڑے سائٹس کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

فیس بک (Face Book): فیس بک انٹرنیٹ پر سب سے بڑی اور پاپولر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے۔ اس کی شروعات 2004 میں ہارورڈ میں پڑھنے والے طالب علم 'مارک زوکر برگ' نے کی تھی۔ انھوں نے یہ ویب سائٹ کالج میں اپنے دوستوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے بنائی تھی۔ لیکن کچھ ہی مہینوں میں یہ پورے یورپ میں پہچان بنانے لگا۔ اگست 2009 میں اس کا نام بدل کر دی فیس بک سے فیس بک کر دیا گیا۔ فی الحال فیس بک کے صارفین کی تعداد ایک بلین ہے اور سوشل میڈیا مارکٹ کے 55 فیصد حصے پر اس کا قبضہ ہے۔

ٹویٹر (Twitter): ٹویٹر ایک امریکی سوشل ویب سائٹ ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص اپنا اکاؤنٹ بنا کر 140 لفظوں میں اپنی بات کہہ سکتا ہے۔ اس سائٹ کو 2006 میں امریکن سافٹ وئر انجینئر Jack Dorsey نے بنایا تھا۔ کم الفاظ میں اپنی بات کہنے کی وجہ سے اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کو SMS of the Internet بھی کہتے ہیں۔ فی الحال پوری دنیا میں 150 ملین لوگ ٹویٹر کے ذریعے اپنی بات لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور تقریباً 340 ملین پیغام ہر روز پوسٹ کیے جاتے ہیں۔ اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر آپ اردو کے علاوہ 28 مختلف زبانوں میں Twit کر سکتے ہیں۔

لنکڈ ان (Linked In): یہ ایک پیشہ ور سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے۔ 2002 میں کیلی فورنیا میں Reid Hoffman اور Allen Blue نے اس کی بنیاد ڈالی۔ لیکن مئی 2003 میں اس سائٹ کو عام کیا گیا۔ فی الحال پوری دنیا میں 150 ملین افراد اس سائٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ انگریزی کے علاوہ دنیا کی بڑی زبانوں میں بھی اپنی خدمات مہیا کراتی ہے۔

مائی اسپیس (My Space): مائی اسپیس کیلی فورنیا Based ایک مشہور سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے۔ 2003 میں اس سائٹ کو Chris DeWolfe اور Tom Anderson نے مل کر بنایا تھا۔ لیکن بعد میں اسے Specific Media کمپنی کو بیچ دیا گیا۔ فی الحال پوری دنیا میں 25 ملین لوگ اس سوشل سائٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ امریکہ

میں سب سے زیادہ لوگ اپنی بات شئر کرنے کے لیے مائی اسپیس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس سوشل نیٹ ورک پر آپ ویڈیو اور موسیقی بھی اپ لوڈ کر سکتے ہیں۔

گوگل پلس(Google+): یہ سرچ انجن گوگل کی ایک سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے گوگل نے جون 2011 میں اس کی شروعات کی اور عام لوگوں نے اس کا استعمال ستمبر سے شروع کیا۔ لیکن کم ہی وقت میں لوگوں کے درمیان یہ کافی پاپولر ہو گیا۔ فی الحال اس کے 170 ملین رجسٹرڈ صارفین ہیں۔ گوگل کے چیف ایگزیکیوٹو افسر لیری پیج کا کہنا ہے آنے والے دنوں میں یہ سائٹ فیس بک کو ٹکر دے سکتی ہے۔

سماجی میڈیا اور خبروں کی دنیا

سوشل میڈیا اب نہ صرف اپنی بات رکھنے اور طرح طرح کی جانکاری دوسروں سے شیئر کرنے کا ذریعہ ہے۔ بلکہ یہ خبروں کا بھی ایک اہم ذخیرہ بن گیا ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ کے ذریعے اب عوام کی رائے اور اس کی سوچ میں تبدیلی لائی جا رہی ہے۔ یعنی اب یہ Opinion Maker کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر Arab Spring کے دوران ٹیونیشیا اور مصر میں جمہوریت کے لیے جتنی بڑی لڑائی عوام نے سڑکوں پر لڑی اتنی ہی شدت سے یہ لڑائی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر بھی لڑی گئی۔ ہندوستان میں سوشل میڈیا کے ذریعے پروان چڑھتے آندولن کی صحیح بھنک ہمیں انا کی تحریک کے دوران ملی۔ کرپشن سے پریشان لوگوں نے سوشل میڈیا پر انا کو زبردست تعاون دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیس بک، ٹویٹر اور یو ٹیوب جیسے سائٹس کے ذریعے یہ تحریک بین الاقوامی بن گئی۔ اس ڈیجیٹل تحریک نے عوام کے درمیان خاص کر نوجوانوں کے بیچ سوشل میڈیا کو کافی مقبول بنا دیا۔

اب تو خبر نویسوں کا ایک کام تمام بڑی ہستیوں کے بلاگ، ٹویٹر اور سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کے دوسرے اکاؤنٹ پر نظر رکھنا بھی ہے۔ کیوں کہ بڑی ہستیاں اب ان سائٹس کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچا رہی ہیں۔ ایل کے آڈوانی، عمر عبداللہ، ششی تھرور ہوں یا پھر دیگر سیاسی رہنما وہ جو کچھ twit کرتے ہیں وہ خبر بن جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں امیتابھ بچن اپنی صحت یا فلم کے بارے میں ٹویٹر پر کوئی جانکاری دیتے ہیں تو بھی وہ خبر بن جاتی ہے۔ اب تو اداکار اپنی فلم کے پروموشن اور اپنے پروگرام کی تشہیر کے لیے بھی سوشل میڈیا کا سہارا لے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جنوبی ہندوستان کے فلم اسٹار دھنش کے گانے 'کولا وری ڈی' کو لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس گانے کا ویڈیو یوٹیوب پر ڈال دیا پھر کیا تھا اس گانے کو لوگوں نے اتنا پسند کیا کہ کچھ ہی دنوں میں پانچ لاکھ سے زیادہ لوگوں نے اس گانے کو سنا اور ڈاؤن لوڈ کیا۔ عامر خان کے ٹی وی شو 'ستیہ میو جیتے' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بات صاف ہے، آج کا دور سوشل میڈیا کا ہے اور وہی لوگ فائدے میں ہیں جو اس کا استعمال بخوبی جانتے ہیں۔

درحقیقت نیوز تنظیمیں اور سوشل میڈیا اب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا جہاں سوشل میڈیا کے ذریعے کئی طرح کی خبریں حاصل کر رہے ہیں، وہیں سوشل میڈیا بڑی خبروں کے ارد گرد لوگوں کو جوڑ رہا ہے۔ ملک میں کوئی بڑے حادثے یا واقعے رونما ہوتے ہیں تو سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر لوگوں کے Opinion کی ڈھیر لگ جاتی ہے۔ ٹویٹر اور فیس بک جیسی سائٹس تو اخباروں اور ٹی وی چینلوں کو بڑا ٹریفک بھی مہیا کروا رہی ہیں۔ انٹرنیٹ سروے ایجنسی Hitwise inteligence کی رپورٹ کے مطابق گوگل، یاہو اور ایم ایس این کے بعد فیس بک نیوز ویب سائٹس کو سب سے زیادہ ریونیو دے رہی ہے۔

ایک طرف جہاں سوشل میڈیا کا صحیح استعمال ہو رہا ہے تو دوسری طرف لوگ اس کا غلط استعمال بھی کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہاں Like، Share اور Twit کرنے سے پہلے لوگ سوچتے نہیں ہیں۔ دوسروں پر چھینٹے کسنا، لیڈروں کے خلاف بھدے کارٹون اور الزام تراشی نے سوشل نیٹ ورکنگ کی ساکھ پر بٹہ لگایا ہے۔ اس کے علاوہ غلط اکاؤنٹ بنا کر لوگوں کے جذبات و احساسات کے ساتھ کھیلنے کی شکایت بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔ اسی منفی پہلو کو دیکھتے ہوئے سرکار نے سوشل میڈیا پر لگام لگانے کی شروعات کر دی ہے۔ جس پر کافی ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا پر لگام لگانے کی سرکار کی کوشش کو 'انٹرنیٹ سنسر شپ' سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کو چاہیے کہ وہ تمام طرح کے غیر اخلاقی اور خراب مضامین یا ویڈیو پر روک لگانے کے لیے خود کچھ قدم اٹھائے۔

سوشل میڈیا اور کاروبار

فیس بک اور ٹویٹر جیسے سماجی میڈیا آج کے دور کی حقیقت بن چکے ہیں۔ پوری دنیا میں فیس بک استعمال کرنے والوں کی تعداد ایک بلین اور ٹویٹر پر جانے والوں کی تعداد پانچ سو ملین پہنچ گئی ہے۔ Forrester IT & Market Research کے مطابق ہر ہفتے ایک تہائی نوجوان فیس بک یا ٹویٹر جیسی سوشل سائٹس پر کم سے کم ایک پوسٹ لکھتے ہیں۔ ایک چوتھائی نوجوان بلاگ لکھتے ہیں اور انٹرنیٹ پر ویڈیو یا آڈیو اپ لوڈ کرتے ہیں۔ تقریباً ساٹھ فیصد نوجوان سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اپنی پروفائل Maintain رکھتے ہیں۔ 70 فیصد نوجوان بلاگ یا ٹویٹر پڑھتے ہیں یا ویڈیو دیکھتے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ٹیلی ویژن چینل اور اخبار کے ناظرین و قارئین سے ان سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے۔

ظاہر ہے، اقتصادی نقطۂ نظر سے سوشل میڈیا پر اتنی بڑی صارفین کی تعداد کو نظر انداز کرنا کسی بھی کمپنی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل زیادہ تر کمپنیاں یہ جاننے کو بیتاب ہیں کہ آخر کار سوشل میڈیا ہے کیا چیز؟ اور اس کے ذریعے کاروبار کو کس طرح آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ عالمی سطح پر ایسے بدلاؤ دیکھنے کو مل رہے ہیں جس میں زیادہ تر کمپنیاں سوشل پلیٹ فارم کی طرف متوجہ ہو رہی ہیں۔ اس لیے بڑی کمپنیوں نے مارکٹنگ کے شعبے میں Social Media Expert کو ملازم رکھنا بھی شروع کر دیا ہے۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا اظہار رائے کی آزادی کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔ سوشل میڈیا عام لوگوں کے پاس ایک ایسا ہتھیار ہے جس کا استعمال سماج کو بہتر بنانے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ کے ذریعے ہم ایسی چیزوں کو سامنے لا سکتے ہیں جسے Main Stream Media کبھی سامنے نہیں لاتا۔ سوشل میڈیا صرف باتیں کرنے اور تفریح کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ Citizen Journalism کا ایک ہتھیار بن گیا ہے۔

روایتی میڈیا کو اگر جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے تو سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس نے جس طرح عام لوگوں کو اپنی بات رکھنے کی طاقت دی ہے، اس کے ذریعے جس طرح لوگ آپس میں جڑ رہے ہیں، ایک نئی سوچ اور نئی دنیا بن رہی ہے اور عوام کو سماج میں پھیلی بد عنوانی اور بد نظمی کے خلاف بیدار کیا جا رہا ہے اس کی بنا پر سوشل میڈیا کو جمہوریت کا پانچواں ستون کہنا چاہیے۔ ■

Tanzeel Ather, 269, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 110067

اردو رسم الخط اور ٹیکنالوجی

ہاشمی سید وہاج الدین

اکیسویں صدی کے آغاز سے پہلے کسی نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ زبانیں سماجی میل جول اور موضوعی (Subjective) رویوں سے ہٹ کر تکنیکی اور معروضی (Objective) حالات کی بھینٹ چڑھ جائیں گی اور تہذیبی سطح پر صرف وہی زبان قائم رہے گی جو ٹیکنالوجی کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچ رہے گی۔[1] دراصل سائنس اور تکنالوجی کی ترقیات بالخصوص انٹرنیٹ کی ایجاد نے انسانی زندگی کے علاوہ علمی میدان میں حیرت انگیز کارناموں سے انسان کو انگشت بدانداں کر رکھا ہے۔ جدید علوم وفنون کا ٹیکنالوجی کے ذریعہ پھیلاؤ اور اس کے ابلاغ نے دنیا کو عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ علم کے اس پھیلاؤ کو علمی دھماکہ (Knowledge Explosion) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ دورِ جدید کی ان ترقیات نے علمی دنیا میں ترجمہ کے میدان کو بھی نہیں چھوڑا، اور اب تیز رفتار و معیاری ترجمے مشین (کمپیوٹر) کے ذریعہ دستیاب ہیں۔ زبانوں کو ٹیکنالوجی میں ڈھالنے کا باقاعدہ عمل پچھلے چھ دہے سے جاری ہے۔ بہت ساری زبانیں اس عمل سے گزر چکی ہیں۔ اُردو زبان بھی اس عمل سے گزر رہی ہے۔

رسم الخط کیا ہے؟

’الفاظ کے تحریری سراپے (Drawing of the Writing) کو رسم الخط کہا جاتا ہے‘۔[2] ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون ’ناگری، رومن اور اردو رسم الخط کا قضیہ‘ میں رسم الخط کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ’رسم الخط سے مراد وہ نقوش وعلامات ہیں جنھیں حروف کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت متعین ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی تحریری صورت کا نام رسم الخط ہے۔‘ ڈاکٹر فرمان مزید لکھتے ہیں کہ ’زبان نام ہے مجموعہ الفاظ کا۔ الفاظ مرکب ہیں اصوات سے اور اصوات نام ہے ان تصاویر، خطوط اور نشانات کا جو ارتقا کی منزلیں طے کر کے آج حروف کے نام سے ہمارے سامنے ہیں۔ یہی حروف جو تلفظ کے ادا اور معنی کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اپنی مربوط صورت میں کسی زبان کا رسم الخط کہلاتے ہیں‘۔[3] رسم الخط تحریری علامتوں کا ایک باقاعدہ نظام اور سلسلہ ہوتا ہے۔ اس نظام میں ہر علامت زبان کی ایک اکائی کی مظہر بنتی ہے اور اس کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہر زبان اپنے پسندیدہ رسمِ الخط سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا لگاؤ ہے جسے فطری کہنا بجا ہے۔ البتہ جس طرح زبان میں زمانے کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح رسم الخط بھی اپنی پہلی حالت پر قائم نہیں رہتا۔ اس میں بھی تغیر وتبدل کا ہونا لازمی ہے چنانچہ رسمِ خط میں بھی فطری ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔[4]

جب ہندوستان میں اُردو کی داغ بیل پڑی تو اسے دیو ناگری میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن جب اُس نے زبان کی حیثیت اختیار کرنا شروع کردی تو فارسی داں اس کو فارسی خط میں لکھنے لگے۔ انگریزوں کا دور دورہ شروع ہوا تو یہی اردو رومن خط میں لکھی جانے لگی۔ اردو کا رسم الخط فارسی رسمِ خط کی توسیع شدہ شکل ہے۔ اس رسم الخط میں بعض ترمیمات و اضافے کے بعد اسے اردو زبان کے لیے اختیار کیا گیا۔ لیکن بنیادی طور پر اردو کا رسم الخط کا ڈھانچہ وہی رہا جو عربی رسم الخط کا تھا۔ اردو کا طرزِ تحریر ’نستعلیق‘ کہلاتا ہے جو اردو

اُردو رسم الخط

جب ہندوستان میں اُردو کی داغ بیل پڑی تو اسے دیو ناگری میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن جب اُس نے زبان کی حیثیت اختیار کرنا شروع کردی تو فارسی داں اس کو فارسی خط میں لکھنے لگے۔ انگریزوں کا دور دورہ شروع ہوا تو یہی اردو رومن خط میں لکھی جانے لگی۔ اردو کا رسم الخط فارسی رسمِ خط کی توسیع شدہ شکل ہے۔ اس رسم الخط میں بعض ترمیمات و اضافے کے بعد اسے اردو زبان کے لیے اختیار کیا گیا۔ لیکن بنیادی طور پر اردو کا رسم الخط کا ڈھانچہ وہی رہا جو عربی رسم الخط کا تھا۔ اردو کا طرزِ تحریر ’نستعلیق‘ کہلاتا ہے جو اردو

کو فارسی کی دین ہے۔ خطِ نستعلیق کا ارتقا ایران میں ہوا۔ وہاں کے ایک عالم خواجہ میر علی تبریزی نے عربی کے دو رسوم خطِ 'نسخ' اور 'تعلیق' کو ملا کر ایک نیا رسمِ خط ایجاد کیا جو 'نستعلیق' کہلایا۔ اردو کے لیے آج بھی یہی رسمِ خط مروج ہے اور یہ اردو کا اپنا رسم الخط بن گیا ہے۔

اردو زبان میں آوازوں کی تعداد دیگر زبانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو بین العلاقائی مزاج کی زبان ہے۔ اس نے اپنے نظامِ تہجی میں عربی، فارسی اور ہندی یعنی آریائی اور سامی دونوں خاندان کی زبانوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس میں انگریزی سے لے کر علاقائی زبانوں تک کی ساری زبانیں اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ دنیا کی مختلف زبانوں کی آوازوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ ہر اُردو جاننے والا عربی، فارسی ہندی اور انگریزی کو ان کے حقیقی تلفظ کے ساتھ عموماً بول لیتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک آواز بھی ایسی نہیں جو اردو میں موجود نہ ہو یا جس کو ادا کرنے پر اردو خواں طبقہ قادر نہ ہو۔ گویا جس طرح اردو اپنے ذخیرہ الفاظ اور صرف ونحو کے لحاظ سے ایک مخلوط زبان ہے، اسی طرح اس کا رسم الخط بھی مخلوط ہے۔

اُردو زبان اور ٹیکنالوجی

اردو زبان کا شمار عالمی سطح کی اہم زبانوں میں ہوتا ہے۔ لینگویج ٹوڈے میں جارج ویبر کے مقالہ 'دنیا کی دس بڑی زبانیں' میں اردو کو دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی چوتھی زبان بتایا گیا ہے [5]۔ دنیا کی تمام زبانیں اس وقت تبدیلی کے ایک زبردست عمل سے گزر رہی ہیں۔ لسانی میدان میں تکنالوجی کی اس غیر معمولی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے کمپیوٹری لسانیات کے ماہر ڈاکٹر عطش درانی اس طرح رقمطراز ہیں: ''دنیا کی زبانوں کو جدید تکنالوجی کا دیو ہڑپ کیا جارہا ہے۔ اب صرف وہی زبان باقی بچے گی جو جدید اطلاعیات کی تکنالوجی میں استعمال ہوگی باقی زبانیں علمی دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گی اور یہ بات نوشتۂ دیوار کی طرح اٹل ہے'۔ [6] اقوامِ متحدہ کے ایک سروے رپورٹ کے مطابق آج دنیا بھر میں بولی جانے والی سات ہزار زبانوں میں سے نصف کے وجود کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ اس رپورٹ میں مزید یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق عالمی سطح پر ہر دو ہفتوں میں ایک زبان متروک ہورہی ہے۔ [7] دنیا کی بیشتر زبانیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر اپنی بقا کے امکانات اور ترقی کی راہیں ہموار کررہی ہیں۔ عالمی سطح پر لسانی ٹیکنالوجی میں دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں نظر انداز کیے جانے کے باوجود، اردو زبان ٹیکنالوجی کی زبان کی دوڑ میں شامل ہوچکی ہے۔ لیکن اردو زبان کو ٹیکنالوجی کی زبان بنانے کے عمل میں جہاں اس کے لسانی وقواعدی مسائل حائل ہیں وہیں اس کا رسم الخط اردو کے تکنیکی زبان بننے میں سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تاہم ہند وپاک کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

ٹیکنالوجی سے مراد ترجمہ کے عمل میں ترجمہ کے لیے تکنالوجی سے وابستہ مشینوں کا استعمال ہے۔ اس میں وسیع طور پر برقی اور برقیاتی آلات شامل ہیں جن کے ذریعہ ترجمہ کے عمل میں سہولت ہوتی ہے۔ باالفاظِ دیگر ترجمے کی ٹیکنالوجی دراصل ترجمے کا مشینی تصور ہے اور ایسے ترجمے کو جو جدید آلات کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے مشینی ترجمہ کہتے ہیں۔ جس میں مختلف زبانوں میں موجود مواد کی منتقلی جدید مہارتوں، آلات اور دیگر امدادی وسائل کے استعمال کے ذریعہ سے ترجمہ کی رفتار اور مقدار میں اضافہ کو معیاری بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مقتدرہ قومی زبان کا مرکز فضیلت برائے اُردو اطلاعیات نے مائیکروسافٹ جیسے ادارے سے مل کر اردو مشینی ترجمہ پر گراں قدر کام انجام دیا ہے جس کی بدولت کمپیوٹر اسکرین اردو میں بدلی ہے۔ مقتدرہ کا یہ مرکز اردو کے حوالے سے نستعلیق رسمِ خط پر کام کرہا ہے اس کے دائرۂ کار میں حروف تہجی، ہجا، ترسیمہ (مل کر لکھے گئے حروف جو، ا، ر، د، و پر ختم ہوں) علامتیات، نشانات، رموز واوقاف، ترتیبِ حروف، جوڑ کار، سمتِ تحریر، معنویاتِ حروف، فاصلِ تحریر، شوشے، اضافی علامات وغیرہ جیسی رسمِ خط کی باریکیوں ونزاکتوں پر کام کررہا ہے۔ [8] اس مقصد کے لیے عالمی معیارات وضع کیے جارہے ہیں اور عالمی ضابطوں کے لیے اس مرکز نے یونی کوڈ کی رکنیت حاصل کی ہے جس کی وجہ سے اردو کا سفر معیاری تیکنکی زبان کی جانب ممکن ہوسکا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے یونی کوڈ کی بورڈ (Keyboard Unicode) متعدد ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

الف: اردو اور یونی کوڈ نظام

یونی کوڈ (Unicode) ایک ایسا نظام ہے جو کسی بھی کمپیوٹر آپریٹنگ سسٹم یا کمپیوٹر پر پروگرام میں تمام زبانوں کے ہر ایک ایک حرف کو ایک خاص عدد مہیا کرتا ہے۔ کمپیوٹر کی دنیا اس خاص عدد سے مراد صرف وہی حرف لے گی جو یونیکوڈ نے ترتیب دے رکھا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے حرف 'ب' کو 0628 عدد دیا گیا ہے اب کسی بھی کمپیوٹر میں 0628 یونیکوڈ قدر (Unicode Value) سے مراد حرف 'ب' ہی لیا جائے۔ حقیقت میں کمپیوٹر صرف اعداد کو ہی سمجھتا ہے۔ کمپیوٹر اسکرین پر نظر آنے والے حروف، الفاظ، تصاویر اور باقی سب کے پس پردہ کمپیوٹر اعداد کے ایک پیچیدہ نظام کے تحت چلتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی چیز کو محفوظ کرنے کے لیے بھی اعداد کے نظام ہی کو استعمال کرتا ہے۔ جب صارف کوئی حرف یا حروف دیکھنا چاہتا ہے تو کمپیوٹر کی یاداشت میں محفوظ اعداد کو کسی ایک نظام کے تحت حرف یا حروف میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اعداد کی حرف میں تبدیلی کے نظام کو اینکوڈینگ سسٹم (Encoding System) کہتے ہیں۔ کسی بھی اینکوڈنگ سسٹم میں پہلے سے ہی یہ بات مقرر کردی جاتی ہے کہ کس عدد کے بدلے کون سا حرف دیکھانا ہے۔ آج کل جو اینکوڈنگ سسٹم استعمال کیا جارہا ہے اسے یونیکوڈ کہتے ہیں۔ یونیکوڈ کنسورشیم نے پہلے پہل اردو کے لیے جزوی سہولت مہیا کی۔ دائیں سے بائیں لکھی جانے والی زبانوں میں سب سے پہلے عربی کے لیے یونی کوڈ میں سہولت دی گئی۔ لیکن حروفِ تہجی کی تعداد کے اعتبار سے عربی کا ابجد فارسی کا تحتی سیٹ ہے اور فارسی کا ابجد اردو کا تحتی سیٹ بنتا ہے اسی لیے یہ نظام ذرا سی مشکل کا شکار ہوگیا۔ تاہم یہ حقیقت ظاہر ہونے کے بعد کہ اردو میں حروف کی تعداد عربی اور فارسی سے زیادہ ہے، یونی کوڈ نے اردو کے لیے حروفِ تہجی داخل کرنے کا راستہ کھول دیا۔ اردو اگرچہ اب بھی عربی کوڈ چارٹ یعنی 0600 ہی سے متعلق ہے اور ایسا ہونا بالکل فطری بھی ہے، تاہم اب اس کوڈ چارٹ میں اردو کے لیے تمام سہولت مہیا ہے۔ یونی کود کے ورژن 4.0 اور 5.0 میں اردو کے لیے مزید علامات اور نشانات داخل کیے گئے۔ [9] یونی کوڈ کے کوڈ چارٹ 0880 Arabic Glyph Parts نے ظاہراً اردو اور دائیں سے بائیں لکھی جانے والی تمام زبانوں کے لیے تکنیکی زبان بننے کی راہ ہموار کردی ہے۔

ب: اردو کی بورڈ

کی بورڈ یا کلیدی تختہ میں تمام Keys پر حروف ایک خاص ترتیب سے لکھے ہوتے ہیں۔ اس خاص ترتیب کو کی بورڈ لے آوٹ (Keyboard Layout) کہا جاتا ہے۔ جس میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ فلاں کی (Key)

دبانے سے کون سا حرف لکھا جائے گا اور فلاں دبانے سے کون سا۔ یہ ایک چھوٹا سا پروگرام ہوتا ہے۔ زیادہ تر زبانوں کے لیے یہ چھوٹا سا پروگرام پہلے سے ہی مائیکرو سافٹ ونڈوز یا دوسرے آپریٹنگ سسٹم میں موجود ہوتا ہے۔ انگریزی لکھنے کے لیے دنیا میں ایک معیار بنا دیا گیا ہے کہ فلاں کی (Key) سے فلاں حرف اور فلاں سے فلاں۔ اسی لیے ہمارے کلیدی تختہ پر انگریزی کے حروف پہلے سے ہی لکھے ہوتے ہیں اور کمپیوٹر کے تمام آپریٹنگ سسٹم میں اس کا چھوٹا سا پروگرام پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ ویسے تو ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں اردو کے لیے پروگرام پہلے سے ہی موجود ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کس کی (Key) سے کیا لکھا جائے۔ اس میں ایک مسلہ یہ ہے کہ ہمارے لوگ جو کمپیوٹر پر اردو لکھتے ہیں زیادہ تر ایسی ترتیب استعمال کرتے ہیں جو اردو کے پرانے سافٹ ویئر میں موجود تھی۔ جیسے عام طور پر A کی، کی سے 'الف' اور B سے 'ب' لکھا جاتا ہے۔ لیکن ونڈوز میں یہ ترتیب موجود نہیں ہے بلکہ A سے 'م' اور B سے 'ش' لکھا جائے گا۔ اس مسلہ کو ختم کرنے کے لیے آپ خود سے اپنا کلیدی تختہ (Keyboard Layout) بنا سکتے ہیں۔ پھر جس کی Key سے جو لکھنا چاہیں ترتیب دے لیں۔ ویسے کلیدی تختہ عام طور پر اردو کی کچھ ویب سائٹ سے بنا بنایا مل جاتا ہے۔ 10

ج: اردو فانٹس

فانٹ کا معنٰی ہے حروفِ تہجی کا روپ یا پہناوا۔ لکھتے وقت کسی بھی زبان کے کسی بھی حروف کو موقع و مناسبت سے کسی بھی روپ میں لکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً انگریزی کا حرف A لکھنے کے لیے حسب ضرورت کبھی ٹائمز نیو رومن کبھی ایریل وغیرہ فانٹ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اردو حروف لکھنے کے لیے بھی کئی فانٹ موجود ہیں جن میں سے نسخ اور نستعلیق بہت مشہور ہیں۔ اردو اپنی اصل شکل نستعلیق رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جو نسخ رسم الخط سے مختلف اور پیچیدہ ہے مثلاً نسخ رسم الخط میں ب کی صرف چار شکلیں ہوتی ہیں، جب کہ یہی ب نستعلیق رسم الخط میں 30 مختلف اشکال رکھتا ہے اور نستعلیق فانٹ میں حرف کی شکل متعین کرنے کے لیے حرف کے سیاق یا context کے حوالے سے مختلف قواعد بنانا پڑتے ہیں۔ اردو زبان میں مشینی ترجمہ کے حوالے سے فانٹ سازی پر مقتدرہ قومی زبان کے ادارے Center for Research in Urdu Language Processing (CRULP) نے اردو فانٹ پر کافی کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ویب سائٹس جیسے، نوری محفل، القلم وغیرہ بھی اس ضمن میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور ان سائٹس پر اردو فانٹس کو فری ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ اردو فانٹ پر انفرادی طور پر بھی بعض اردو دوست حضرات نے بھی کام کیا ہے حتیٰ کہ انھوں نے اردو فانٹ سرور تک بھی اپنے ذاتی خرچ پر بنایا ہے۔

> اردو زبان میں موجود مختلف سافٹ ویئرز، برقی لغات (Electronic Dictionaries) اور انٹرنیٹ پر بے شمار اردو ویب سائٹس اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو اب تکنیکی زبان کی دوڑ میں مسابقت کررہی ہے۔ اردو کی مشینی ترجمہ میں موجودہ پیش رفت کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اردو تکنیکی میدان میں دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی ہم پلہ ہوگی، اور جدید علوم وفنون کا ذخیرہ جس طرح انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبانوں میں بکثرت موجود ہے اردو میں بھی اسی انداز میں دستیاب رہیگا اور اردو بولنے والے کے لیے یقینا یہ نعمتِ غیر مترقبہ سے کم ثابت نہیں ہوگا۔

ان فانٹس کے ذریعہ آپ ورڈ، ایکسل، پاور پوائنٹ وغیرہ میں بنی ہوئی یونیکوڈ اردو فائلوں کو خوبصورت نستعلیق فانٹ میں پڑھ سکتے ہیں۔ حال ہی میں کرلپ کی ایک ٹیم نے پینگو(Pango) رینڈرنگ انجن کو ایک موبائیل فون میں نصب کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے جس کی وجہ سے پیچیدہ لکھائی کے نظاموں مثلاً نستعلیق کا موبائیل فون میں لکھنا ممکن ہوگیا ہے جس میں Nokia E51 پر نفیس نستعلیق اوپن ٹائپ فانٹ کو پینگو رینڈرنگ انجن کی مدد سے دکھایا گیا ہے۔ ابتدائی فانٹ فارمیٹ اتنے طاقتور نہیں تھے کہ ان کے ذریعہ نستعلیق لکھنا ممکن ہوتا کیونکہ یہ فارمیٹ بنیادی طور پر لاطینی لکھائی کے نظاموں کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ بعد ازاں اوپن ٹائپ فانٹ فارمیٹ وضع کیا گیا جس کی مدد سے پیچیدہ ایشائی رسم الخطوط مثلاً نستعلیق، دیو ناگری، سنہالی وغیرہ کے لیے فانٹ تخلیق کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ 11

اردو زبان میں موجود مختلف سافٹ ویئرز، برقی لغات (Electronic Dictionaries) اور انٹرنیٹ پر بے شمار اردو ویب سائٹس اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو اب تکنیکی زبان کی دوڑ میں مسابقت کررہی ہے۔ اردو کی مشینی ترجمہ میں موجودہ پیش رفت کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اردو تکنیکی میدان میں دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی ہم پلہ ہوگی، اور جدید علوم وفنون کا ذخیرہ جس طرح انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبانوں میں بکثرت موجود ہے اردو میں بھی اسی انداز میں دستیاب رہیگا اور اردو بولنے والے کے لیے یقیناً یہ نعمتِ غیر مترقبہ سے کم ثابت نہیں ہوگا۔ بلا شبہ اردو رسم الخط کے مسائل اردو کے تکنیکی زبان بننے میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کا رسم الخط ایسا نہیں ہے کہ اسے ہر لحاظ سے مکمل اور نقائص سے پاک کہا جاسکے۔ اپنے رسم الخط کے ناقص ہونے کی شکایت دنیا کی ہر زبان کو ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو رسم الخط دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مکمل رسم الخط ہے۔ لہٰذا اردو رسم الخط پر تکنیکی حوالے سے جاری سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ قوی توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں اردو دنیا کی سب سے زیادہ کامل تکنیکی زبان بن جائے گی۔

حوالہ جات:

1 درانی ڈاکٹر عطش: اردو اطلاعیات (جلد اول) 2 چوہان ڈاکٹر محمد صفوان: اردو اطلاعیات: آج اور کل 3 ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ناگری، رومن اور اردو رسم الخط کا قضیہ 4 شیما مجید: اردو رسم الخط (انتخاب مقالات) 5 گوہر محمد الطاف: لسانیات؛ زبان کی سائنس اور لفظوں کی شرارت 6 درانی ڈاکٹر عطش: اردو اطلاعیات (جلد اول) 7 Deccan Chronicle, Hyderabad, 29th Oct.2010 8 درانی ڈاکٹر عطش: اردو اطلاعیات (جلد اول) 9 چوہان ڈاکٹر محمد صفوان: 'مشین ریڈایبل اردو رسم الخط: حروف کی کشتیاں، اعراب، نقطے، شوشے اور کششیں' 10 mbilalm.com 11 حسین سید سرمد ڈاکٹر: Urdu in its True Form 'Spider, 2009

Hashmi Syed Wahajuddin, Dept. of Translation, Maulana Azad National, Urdu University, Hyderabad-500032 (AP)

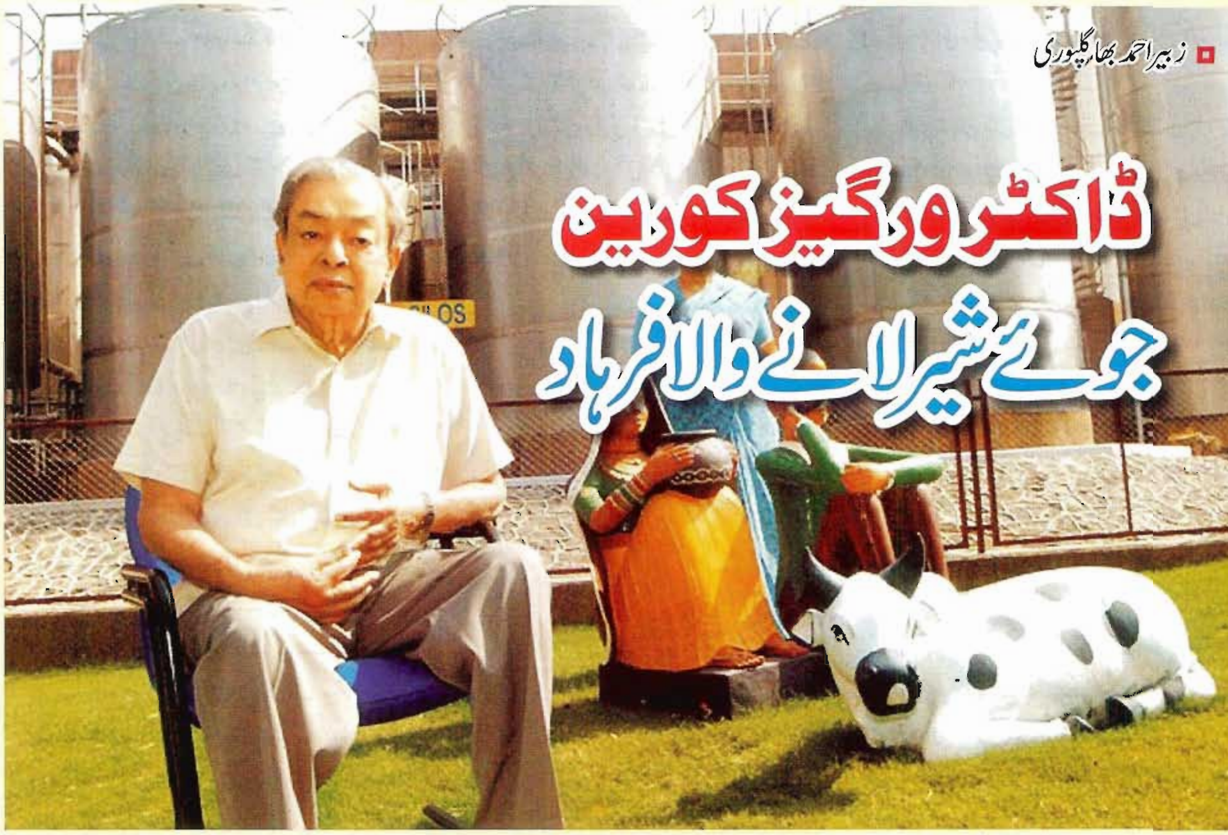

■ زبیر احمد بھاگلپوری

ڈاکٹر ورگیز کورین
جوئے شیر لانے والا فرہاد

جنت نشان ہندوستان میں دودھ کی نہریں بہانے والے ڈاکٹر ورگیز کورین نے 9 ستمبر 1912 کو 90 سال کی عمر میں ایک مختصر علالت کے بعد ناڈیاڈ (گجرات) کے ایک اسپتال میں آخری سانس لی۔ ڈاکٹر کورین ہندوستان کی ان عظیم ہستیوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے وطن کو دنیا کے نقشے میں ایک اہم مقام دلانے میں اہم رول ادا کیا۔

26 نومبر 1921 کو کیرل کے ایک عیسائی خاندان میں آنکھ کھولنے والے ڈاکٹر کورین نے گوینڈی، چنئی سے میکانیکل انجینئرنگ کرنے کے بعد اپنا کیریر بہار کے جمشید پور کے ٹسکو کمپنی میں بطور انجینئر بحال ہوکر شروع کیا لیکن بعد میں وہ آنند، گجرات منتقل ہوگئے جہاں سے انھوں نے 70 کی دہائی میں 'آپریشن فلڈ' یا 'سفید انقلاب' کی شروعات کی۔ یہ وہ دور تھا جب خوردنی اشیا کے نقطہ نظر سے ہندوستان کو حقارت بھری نظروں سے دنیا بھر میں دیکھا جاتا تھا۔ دنیا میں تغذیاتی شعبے میں ان دنوں ہندوستان کی کوئی خاص وقعت نہیں تھی۔ ڈاکٹر کورین نے ایسے نازک دور میں اپنے 'امول ماڈل' کے بل بوتے دودھ کے شعبے میں وہ انقلاب برپا کیا جس سے نہ صرف ہندوستانیوں کو دودھ کی قلت سے نجات ملی بلکہ 12-2011 میں ہمارا ملک دودھ کی پیداوار کے میدان میں دنیا کا سب سے بڑا ملک بن گیا۔ آج ہندوستان دنیا کا 17% دودھ اکیلے پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر کورین کے دودھ کے شعبے کو ہی انتخاب کرنے کے پیچھے ان کا یہ ذاتی نظریہ کارفرما تھا کہ کسی بھی ملک یا سماج کی ترقی کے لیے ان کے شہریوں کا صحت مند ہونا ضروری ہے جس میں دودھ کا انتہائی اہم رول ہے لیکن ان کے لیے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا کیونکہ گجرات کی تہذیب و ثقافت چند ایسے عناصر کارفرما تھے جو ڈاکٹر کورین کے مزاج کے خلاف تھے۔ مثلاً کیرالہ کا یہ کرشچین گوشت کھانے کا عادی تھے جو اسے آنند میں بآسانی میسر نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ یہاں اسے لسانیاتی مسئلہ سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ سچ پوچھیے تو آنند کا تمدن شروعات دنوں میں ڈاکٹر کورین کو راس نہیں آیا لیکن جس کے حوصلے بلند ہوتے ہیں اسے منزل تک پہنچنے میں دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ معلوم ہو کہ جب ڈاکٹر کورین آنند کے چھوٹے سے شہر پہنچے تو ان کو قیام کے لیے ایک روم تک نہیں ملا۔ مجبوراً شروع میں انھیں ایک گیراج میں رہنا پڑا۔ ان نامساعد حالات سے کورین کے قدم کبھی کبھی لڑکھڑائے بھی لیکن انھوں نے ان ناموافق حالات میں بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ ڈاکٹر کورین نے اپنی نوکری کا معاہدہ پورا کر کے ممبئ جانے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن قدرت کو ان سے آنند میں ہی کام لینا تھا۔

AMUL کی داغ:

آنند ملک یونین لمیٹڈ کی شروعات کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ جس وقت ڈاکٹر کورین اپنی نوکری سے پریشان ہوکر ممبئ جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے، گجرات کے کائرا ضلع کے کوآپریٹیو ملک پروڈیوسرس یونین کے اس وقت کے صدر تربھون داس پٹیل سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہی کورین سے ودھ کی امداد باہمی کی اپنی سوسائٹی کو مستحکم بنانے کے لیے تعاون چاہا۔ دراصل ان دنوں اس علاقے میں 'پولسن' نام کی کمپنی کا ڈیری شعبے پر تسلط تھا۔ وہ کمپنی علاقے کا سارا دودھ ممبئ سپلائی کردیا کرتی تھی جہاں دودھ سے مکھن تیار کیا جاتا تھا۔ اس عمل سے کمپنی کو زیادہ فائدہ اور علاقے کے دودھ تاجروں کو زیادہ نقصان ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علاقے کے دودھ سے جڑے تاجر اور لیڈر پولسن کمپنی سے ناخوش تھے۔ انھی حالات میں تربھوون داس پٹیل نے ڈاکٹر کورین سے مدد چاہی۔ کورین بادل ناخواستہ پٹیل کی درخواست پر آنند میں رک گئے اور دودھ صنعت کی بہتری کی فکر کرنے لگے۔ انھوں نے اس سمت میں گیارہ مہینے کی محنت شاقہ کے بعد ایک ایسا ملک پروسیسنگ پلانٹ تیار کیا جو اس وقت ملک کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید ترین پلانٹ

تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے افتتاح کے لیے اس وقت وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو اس کے لیے آنند جانا پڑا۔ یہی سے مشہور زمانہ AMUL کی داغ بیل پڑی جس نے مرور ایام کے ساتھ ہندوستان کو دودھ کی صنعت کے شعبے میں وہ مقام دلایا جو اس سے قبل اسے کبھی حاصل نہیں تھا۔

ڈاکٹر کورین کی جدید فکر اور نئی تکنیک کے استعمال کا بہتر نتیجہ جلد ہی سامنے آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈیری صنعت سے منسلک دیگر کمپنیوں نے بھی 'امول ماڈل' اپنانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کورین نے اس صنعت کو بلندیوں پر پہنچانے میں انتھک محنت اور نئی تکنیک کے ساتھ ساتھ مارکیٹنگ کے نئے ہنر کو بھی اپنایا جس کے سبب توقع سے زیادہ انھیں کامیابی ملی۔ ان کی کامیابی کی شہرت ملک اور بیرون ملک تک جا پہنچی۔ یہاں تک کہ اس وقت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے انھیں 'امول ماڈل' کا استعمال ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی نافذ کرنے کی گزارش کی۔ یہی نہیں، جناب شاستری نے ان سے متاثر ہو کر ان کی قیادت میں نیشنل ڈیری ڈیولپمنٹ بورڈ (NDDB) قائم کر دیا۔

'آپریشن فلڈ' کا آغاز

1971 میں نیشنل ڈیری ڈیولپمنٹ بورڈ نے ملک کے ہر شہری تک سستے داموں میں دودھ پہنچانے کے مقصد سے 'آپریشن فلڈ' کا پروگرام شروع کیا۔ اس کے علاوہ اس پروگرام کا مقصد دودھ کی پیداوار میں اضافہ کرنا، دیہی علاقے کے لوگوں کو آمدنی میں اضافہ کرنا اور کسانوں اور دودھ کے تاجروں کو ان کا مناسب منافع بہم پہنچانا بھی تھا۔

ڈاکٹر کورین کی اہمیت صرف اس لیے نہیں کہ انھوں نے اہل وطن کو ڈیری صنعت کی نئی تکنیک سے روشناس کرائی اور اس سے منسلک کسانوں کی اقتصادی حالت میں معتد بہ بہتری لائی بلکہ ان کی قدر و قیمت ہمارے ملک میں اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے یہ کارنامہ ایسے وقت میں سرانجام دیا جب کہ دوسرے ملکوں کے لوگ ہندوستان کو بطور مدد اشیائے خوردنی مہیا کراتے تھے جن میں دودھ کے ساز و سامان بھی تھے۔ اس کے علاوہ اس دور میں ڈیری صنعت میں سرمایہ کاری کرنے کی رسک لینے کے لیے سرمایہ کار تیار نہیں تھے۔ ایسے نازک اور ناگفتہ بہ وقت میں ڈاکٹر کورین نے اپنا خون جگر دے کر ڈیری صنعت کو سرسبز بنایا۔

جہاں تک AMUL کے کاروبار کا سوال ہے، اس کی مصنوعات کی مارکیٹنگ Gujrat Co-operative Milk Marketing Federation (GCMMF) کی زیر نگرانی ہوتی ہے۔ ابتدا میں اس ادارے سے صرف دو دیہی ڈیری امداد باہمی سوسائٹیز منسلک ہوئی تھیں اور یہ ادارہ صرف 247 لیٹر دودھ کا کاروبار کرتا تھا لیکن یہی ادارہ آج 2.5 ارب ڈالر کا کاروبار کر رہا ہے اور ملک بھر کے 32 لاکھ کسان اس ادارے سے منسلک ہو چکے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کے زمانے میں کسی بھی کمپنی کی تجارت کسی بڑے اسٹار کے ذریعے تجارتی مصنوعیت کے اشتہار کے بغیر نہیں چلتی لیکن 'امول' نے اپنی صنعت کے فروغ کے لیے صلاحیت کے باوجود کسی بڑی ہستی کو اشتہار بازی کے میدان میں نہیں اتارا۔ اس نے صرف ایک کارٹون کردار کو اپنی مصنوعات کی تشہیر کا ذریعہ بنایا جو 'امول گرل' کے نام سے اشتہاری دنیا میں جانی جاتی ہے۔ امول نے ڈاکٹر کورین کی سربراہی میں ہندوستان میں پہلی بار بھینس کے دودھ سے ملک پاؤڈر اور کنسنڈ پاؤڈر بنانے کی تکنیک کو فروغ دیا جو امول کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے۔ کمپنی نے اس کے بل بوتے نیسلے جیسی بڑی کمپنی کو زوردار ٹکر دی جو ملک پاؤڈر اور کنسنڈ پاؤڈر بنانے کے لیے صرف گائے کے دودھ کا استعمال کرتی تھی۔

ڈاکٹر کورین کی اهمیت صرف اس لیے نهیں که انهوں نے اهل وطن کو ڈیری صنعت کی نئی تکنیك سے روشناس کرائی اور اس سے منسلك کسانوں کی اقتصادی حالت میں معتد به بهتری لائی بلکه ان کی قدر و قیمت همارے ملك میں اس لیے بهی هے که انهوں نے یه کارنامه ایسے وقت میں سرانجام دیا جب که دوسرے ملکوں کے لوگ هندوستان کو بطور مدد اشیائے خوردنی مهیا کراتے تهے جن میں دوده کے ساز و سامان بهی تهے. اس کے علاوه اس دور میں ڈیری صنعت میں سرمایه کاری کرنے کی رسك لینے کے لیے سرمایه کار تیار نهیں تهے.

کورین کا بہار رابطہ:

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، ڈاکٹر کورین نے اپنے کیریر کی ابتدا ٹسکو، جمشید پور سے کی جو اس وقت بہار میں تھا۔

بہار میں 1977 میں بہار کوآپریٹیو کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس وقت اس کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ بہار کی ڈیری صنعت میں بہتری لانے کے لیے حکومت بہار نے ڈاکٹر کورین کو بہار آنے کی دعوت دی۔ پہلے تو وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے لیکن بعد میں بہار کی ڈیری صنعت کو سنوارنے کی حامی بھر دی لیکن ساتھ ہی کئی شرطیں بھی رکھیں جنھیں حکومت بہار نے تسلیم کر لی۔ بالآخر ڈاکٹر کورین نے 1981 میں بہار کوآپریٹیو کی کمان سنبھال لی۔ ان کے آنے کے بعد ہی حکومت بہار بہار کوآپریٹیو کو ٹیک اوور کرنے کی جرأت کر سکی اور اس کا نام 'پٹنہ ڈیری پروجکٹ' رکھا۔ حکومت نے ڈاکٹر کورین کو اس پروجکٹ کی مینیجنگ کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا جس پر وہ 1988 تک فائز رہے جس وقت انھوں نے PDP جوائن کیا تھا۔ اس وقت یہاں صرف 500 لیٹر دودھ ہی اکٹھا ہوتا تھا لیکن ان کے آنے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کسان پٹنہ ڈیری سے منسلک ہوئے اور ایک سال میں ہی دودھ کا ذخیرہ دس گنا ہو گیا۔ اس کے لیے انھوں نے گاؤں گاؤں کا دورہ کیا اور کسانوں کو دودھ مہیا کرانے کی ترغیب دی۔ شروع میں دودھ بوتلوں میں سپلائی کیا جاتا تھا لیکن آج جو ہم دودھ پاؤچ میں حاصل کرتے ہیں یہ ڈاکٹر کورین کی کوشش کا ہی نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کورین کے وژن سے مویشی خوراک فیکٹری (CFF) قائم ہوئی اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار کی ڈیری صنعت بھی ڈاکٹر کورین کی مرہون منت ہے۔

ڈاکٹر کورین کا تاریخی سفر:

- 1949 میں حکومت نے کریم پر ریسرچ کے لیے آنند، گجرات بھیجا۔
- کچھ برسوں بعد نوکری چھوڑ کر ڈیری صنعت سے جڑے اور 1956 میں 'امول' کی بنیاد ڈالی۔
- لال بہادر شاستری نے 1965 میں کورین کی صدارت میں NDDB قائم کیا۔
- 1971 میں 'آپریشن فلڈ' شروع کیا جس کا مقصد ملک بھر میں ڈیری صنعت کا جال بچھانا تھا۔
- 1973 میں GCMMF قائم کیا جسے ملک اور بیرون ملک دودھ کی فروخت کی ذمہ داری سونپی۔
- 2006 میں GCMMF سے اختلاف کے بعد قطع تعلق کیا اور خود کو تعلیم کے شعبے سے منسلک کیا۔
- 9 ستمبر 2012 کو 90 برس کی عمر میں مادی دنیا کو خیر باد کہا:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

◘

Zobair Ahmad Bhagalpuri, Urdu Section, Bihar Legislative Council, Patna - 15 (Bihar)

تبصرہ وتعارف

کلیات سرور جہاں آبادی

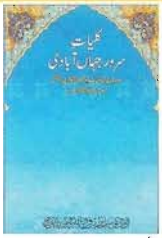

مرتب: کلدیپ گوہر

صفحات: 368، قیمت: 108 روپے، سن اشاعت: 2012

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالرشید، A187/3 شاہین باغ، اوکھلائی دہلی 25

موقر جان ارباب ہنر کو بے لباسی میں
کہ جو ہو تیغ با جوہر وہ کم جاتی ہے پہچانی

اردو شاعری کے ہر دور میں ایسے باکمال شعرا رہے ہیں جنھوں نے گیسوئے سخن کے پیچ وخم کو سلجھایا، سنوارا اور تابدار بنایا ہے۔ تاہم امتدادِ زمانہ کے شکار بھی ہوئے، نیز اپنی تنگ دستی وتنگ دامانی کا گلہ بھی کیا۔ لیکن حاصل عنقا رہا۔ مجبور ومقہور زمانہ سخنوروں کو سخن فروشی پر مجبور بھی ہونا پڑا۔ سخن فروشی کا سلسلہ ہر زمانے میں رہا۔ اساتذہ شعرائے کرام کے کلام شاگردوں ودیگر قدر شناسوں کے ذریعے مشاعروں میں پڑھے جاتے تھے اور شعرا معاوضہ طلب کرتے تھے جس کا مشاہدہ آج ہم خود کر سکتے ہیں۔ فلموں کے لیے فرمائشی گیت وغزل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، اسد بھوپالی، کیف بھوپالی اور جاں نثار اختر کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ نئے دور کے ان شعرا نے کیسی تنگ حال زندگی گزاری ہے۔ جب کہ شاہ نصیر اور مصحفی کا زمانہ قدرے بعید ہے۔

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی انھیں بدقسمتوں میں سے ایک تھے۔ 37 برس کی عمر میں بے وقت جہان آب وگل سے کوچ وہ بھی عالم افلاس میں، تمام تمنائے دل درگور ہوگئیں لیکن ان کے بیش بہا موتی غیروں نے کوڑیوں کے مول اڑائے، کبھی معاوضہ دیا کبھی وہ بھی اڑا گئے کم عمر میں سرور جہان آبادی اپنے عہد کے باکمال شاعر تسلیم کر لیے گئے۔ شاعری کی سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ قدیم وجدید شاعری اور اسلوب کو برت کر اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ سرور جہان آبادی کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ان کی رفیق حیات اور اکلوتے بیٹے کا داغِ مفارقت دے جانا ہے۔ یہ سانحہ ان کی زندگی کو مفلوج کرنے میں غیر معمولی ثابت ہوا، زندگی کی رمق ماند پڑگئی، عزم وحوصلے ڈوب گئے۔ روئیدگیِ دماغ تو باقی رہی لیکن خواہش دنیا تمام ہوگئی۔ اس کا فائدہ ان شاعروں نے اٹھایا جس میں دو نام سرفہرست ہیں، پیارے لال شاکر میرٹھی اور دوسرا اہم نام مہاراجہ اجے گڑھ (اخگر اجے گڑھی) ہے۔ سرور کی تخلیقات ان کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ آتشِ بطن اور فکر معاش نے سرور جہان آبادی کو اپنی قیمتی تخلیقات 'اکسیر سخن' کا سودا کرنے پر مجبور کیا۔ جو سنسکرت کے عظیم ہندوستانی شاعر کالی داس کی سنسکرت نظموں کے مجموعہ 'رتو سنگھار' کا اردو ترجمہ ہے 'اکسیر سخن' کو پہلی بار نول کشور پریس لکھنؤ نے 1913 میں شاکر میرٹھی کے نام سے شائع کیا تھا جس میں منشی پریم چند نے مقدمہ لکھا تھا۔ پیارے لال شاکر میرٹھی ایک پنڈت کی مدد سے 'رتو سنگھار' کا اردو نثر میں ترجمہ کرتے۔ بعد ازاں سرور جہان آبادی اسے تخلیقی نظم کا جامہ پہناتے۔ جس کے رموز ولطافت اور باریک بینی کی تفہیم سے قاصر تھے۔ سرور کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں بہت سارے خطوط ایسے ملے جن سے سرور کے سارقین کلام کا پردہ فاش ہوا جو ملک کے معیاری رسائل وجرائد میں سرور کا کلام اپنے نام شائع کرتے اور عزت پاتے تھے۔

سرور جہان آبادی کا جو کلام بچ گیا وہ ان کی شناخت کے لیے کافی ہے۔ 'جام سرور' کو سرور جہان آبادی نے اپنی زندگی میں طباعت کے لیے تیار کر دیا تھا جو دو حصوں پر مشتمل تھا لیکن شائع نہیں ہوسکا۔ یہ دونوں حصے بھی سرور نے شاکر میرٹھی کے حوالے کر دیا تھا۔ لوگوں کے تقاضے کے بعد بھی شاکر میرٹھی نے شائع نہیں کیا۔ سرور کے انتقال کے فوراً بعد 1911 میں 'جام سرور' پہلا مجموعہ انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ دیانرائن نگم نے نظموں کا انتخاب 'خمخانہ سرور' کے نام سے شائع کیا اور 'خمکدۂ سرور' کے نام سے ایک تیسرا مجموعہ نظم شائع ہوا۔

اتنے مراحل سے گزرنے کے بعد سرور جہان آبادی کا حاصل شدہ کلام مرتبہ کلدیپ گوہر کو قومی اردو کونسل نے 'کلیات سرور جہان آبادی' کے نام سے پہلی بار 2012 میں چھاپنے کا شرف حاصل کیا۔ ضخامت کے اعتبار سے 368 صفحات کو محیط ہے۔ دل ودماغ کو قوت وانبساط بہم پہنچانے والی تخلیق، جس کے خالق سرور جہان آبادی ہیں، کی قیمت محض 108 روپے ہے۔ سرور جہان آبادی کا کلام حلقہ اردو ادب میں مقبول ومسلم ہے۔ کلیات میں موجود نظمیں سرور کے مجموعۂ کلام کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد سے حاصل ہوئی ہیں۔ کلیات ترتیب دیتے وقت بہت سی نظموں میں تکرار کی غلطی در آئی ہے۔

تاریخِ ادب اردو (جلد نہم)

مصنف: محمد انصار اللہ

صفحات: 491 قیمت: 126 روپئے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر شفقت اعظمی 'دلکشا'،

این 49-، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

اردو زبان میں رام بابو سکسینہ سے لے کر پروفیسر جمیل جالبی تک تاریخِ زبان وادب اردو کے موضوع پر اہم کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں سے اول الذکر کتاب نے ایجاز کے باوجود عرصۂ دراز تک درسیات کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کی، لیکن پروفیسر جمیل جالبی کی مطبوعہ کتاب منصۂ شہود پر آجانے کے بعد یہ خلا کافی حد تک پر ہوگیا اور تاریخِ ادب اردو کا وسیع مطالعہ کرنے والے طلبہ واساتذہ کی ایک دیرینہ تمنا پوری ہوگئی۔

بایں ہمہ اردو جیسی کمسن اور ترقی یافتہ زبان کے لئے مزید وسعتوں اور پہنائیوں کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی نے منصوبہ بند طریقے سے بالکل منفرد لیکن جامع انداز میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کیا جو بلاشبہ فرد واحد کے بس کا تھا بھی نہیں۔ بقول ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، یہ کام 17 جلدوں پر مشتمل ہوگا، جن میں سے اول پانچ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر 9 ویں جلد پروفیسر انصار اللہ کی تحقیق اور زورِ قلم کا ثمرہ ہے۔ دراصل پروفیسر انصار اللہ کا مفوضہ کام انیسویں صدی عیسوی کی زبان وادب کے تدریجی ارتقا پر مشتمل ہے جو تین جلدوں پر محیط ہوگا۔

زیرتبصرہ کتاب (جلدنہم) میں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں برصغیر ہندوستان کے مختلف مراکز میں ادبیات اردو کے ارتقائی مناظر وکوائف کو ضبطِ تحریر میں لانے کی سعی مشکور نظر آتی ہے۔ دہلی، لکھنؤ، کلکتہ اور حیدر آباد کی مرکزیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلّم سہی، تاہم چھوٹے چھوٹے مقامات سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہاں کے آب وگل سے بھی کیسے کیسے گل سرسبد پیدا ہوئے ہیں، جن کی حیثیت ان خلیات (Cells) کی سی ہے جن کا پورے وجود کی تعمیر میں اہم حصہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں چھ زمروں کے تحت حسب ذیل مقامات کا احاطہ کیا گیا ہے:

(1) صوبہ جاتِ مغربی: ہریانہ، پنجاب، کشمیر اور صوبۂ سرحد، (2) دہلی (3) آگرہ وگوالیار (4) راجستھان: اجمیر، الور، بھرت پور، ٹونک، جودھ پور اور جے پور (5) بندیل کھنڈ: کالپی اور باندہ (6) بنارس۔

کتاب میں اربابِ قلم کی زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں پر غائر نظر ڈالی گئی ہے نیز ان کے قیام وسکون تک رسائی حاصل کی گئی ہے تاکہ ان کے کلام اور نثری ادب پاروں کی قدریں متعین کرنے میں آسانی ہو اور ان کے افہام وتفہیم میں کوئی ابہام باقی نہ رہ جائے۔ بلاشبہ تاریخ نویسی بڑی جگر کاوی کا کام ہے، جس میں جذب وشوق اور عرق ریزی کے ساتھ صبر وتحمل کے ساتھ تلاش وجستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فن بڑی دیانت داری اور کمال ذمہ داری کا متقاضی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی بنیاد فراہم کرتا ہے جس مستقبل کی فلک بوس عمارتوں اور انفرا اسٹرکچر کا انحصار ہوتا ہے۔ ذرا سی غفلت اور تن آسانی بنیاد کو کھوکھلا اور عمارت کو متزلزل کر سکتی ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ مصنف نے بڑی لگن، جتن اور ژرف نگاہی سے کام لیتے ہوئے اس منزل کو باحسن الوجوہ سر کیا ہے۔ ابواب کو ضروری حواشی سے مزین کر کے اس کی معتبریت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ فہرستِ مضامین کے علاوہ بالخصوص دہلی اور بنارس کے تذکرے میں نظم ونثر کے مختلف اصناف کی درجہ بندی کر کے اربابِ قلم کی خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ درج ذیل موضوعات پر شعری و نثری حوالوں کے ساتھ عالمانہ گفتگو کی گئی ہے:

غزل، قصیدہ، ہجو و ہزل، واسوخت، مثنوی، نامۂ منظوم،، مرثیہ وغیرہ، ریختی، رباعیات دمستزاد، قطعات، تضمین، تاریخ گوئی، معمہ، پہیلیاں، گیت اور جگت گرو وغیرہ، مذہبی نثر اور تذکرے وغیرہ۔ شعرا اور مصنفین کی فہرست کی شمولیت سے نفسِ مضمون تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔

تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ تذکرہ وتاریخ کے متعلقہ عہد کے خد وخال بڑی خوبی سے نمایاں کئے گئے ہیں مثلاً غالب ومومن کا دور اردو شاعری کا عہدِ زریں بھی ہے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس عہد میں پہنچانے کا ہنر بھی جانتے ہیں، نتیجۃً کار بہت سے تاریخی اور ادبی عقدے خود بخود ڈھلتے جاتے ہیں، مثلاً خوب چند ذکا کو اولیں تذکرہ نویس بتاتے ہوئے اقتباسِ ذیل کے حوالے سے، بڑی اہم باتیں لکھی ہیں جو مبنی برحقیقت بھی ہیں۔

مواد، عنوان وہیت کے اعتبار سے اس مبسوط اور جامع کتاب پر مصنف اور اردو کونسل دونوں مستحق مبارکباد ہیں۔ اس سلسلہ کی تکمیل کے بعد اردو زبان وادب کے طلبا، ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ خوشگوار آسودگی محسوس کریں گے کیونکہ انھیں وہ گنج گرانمایہ حاصل ہو جائے گا جو صدیوں ہمارے کاروانِ تحقیق کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرتا رہے گا اور بنیادی مآخذ کے طور پر کام آتا رہے گا۔ کتابت وطباعت شاندار، کاغذ معیاری نیز ٹائٹل دیدہ زیب و معنیٰ خیز ہے۔ اتنی ساری خوبیوں اور ضخامت کو دیکھتے ہوئے قیمت برائے نام ہے۔ امید کہ نہ صرف ادب کے طلبہ، اساتذہ ومحققین کے حلقوں میں اس کی بھرپور پذیرائی ہوگی بلکہ اسے وسیع پیمانے پر تعلیمی اداروں اور جامعات کی لائبریریوں کی زینت بنایا جائے گا۔

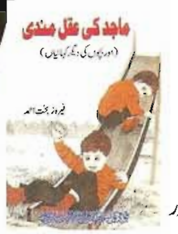

ماجد کی عقل مندی

مصنف: فیروز بخت احمد
صفحات: 149، قیمت: 24 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: خان احمد فاروق، صدر شعبہ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور

فیروز بخت احمد انگریزی اور اردو کے معروف کالم نگار ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خانوادہ کے چراغ ہیں۔ پکے دہلوی ہیں اور دہلی کے تاریخی آثار، روایت اور پہچان کو بچانے اور قائم رکھنے میں عملی طور پر بھی خاصے سرگرم رہتے ہیں۔ زیرنظر کتاب 'ماجد کی عقل مندی' (دیگر کہانیاں) بھی فیروز بخت احمد کا اپنی تاریخ کو محفوظ و مامون کرنے کے سلسلے میں اٹھایا گیا ایک اہم قدم ہے اور اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ یہ دہلی سے شائع ہونے والے بچوں کے معروف رسالہ 'کھلونا' کے مشمولات کا شاندار انتخاب ہے۔

آج ہمارے یہاں بچوں کے ادب کو وہ اہمیت قطعی حاصل نہیں ہے جس طرح دوسری زبانوں میں ادب اطفال کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کے برعکس ایک زمانہ تھا جب 'کھلونا' کے ساتھ ساتھ پیام تعلیم، ٹافی نور، چندہ نگری، شریر، گل بوٹے، جنت کا پھول، بچوں کا ساتھی جیسے رسائل نکلتے تھے اور گھر گھر پڑھے جاتے تھے۔ آج 'امنگ'، 'پیام تعلیم' اور 'ہلال' بھی قلیل تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور کتنے گھروں میں پڑھے اور منگوائے جاتے ہیں اس پر شاید ہی کوئی بات کرنا پسند کرے اور ہمارے زمانے میں ہی ہندی کے کتنے رسالے آن لائن ہیں۔ بھوپال سے نکلنے والا ہندی کا ایک بچوں کا رسالہ 'چکمک' تو ہر برس اپنے ادارے کی جانب سے تین روزہ جشن کا اہتمام کرتا ہے اور اس میں ہندی کے معروف لکھنے والے تین روز تک بچوں کے ساتھ رہتے ہیں ان سے اپنے خیالات اور تجربات شیئر کرتے ہیں اور بچوں کو بھی لکھنے کے لیے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ آج ہمارے یہاں ایسی کسی روایت کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا ہے۔

لیکن جب دہلی سے 'کھلونا' نکلتا تھا تو آج کی صورتِ حال کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا تھا۔ اردو کا بڑے سے بڑا قلم کار 'کھلونا' کا بخوشی تعاون کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ 'کھلونا' کے قاری اُس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے قاری میں گھریلو تربیت کی طرح رچا بسا ہے۔ اس کتاب نے وہ دن یاد دلا دیے جب سب دن اچھے ہوتے تھے۔

اردو میں اہم ادبی رسائل اور جرائد کی فہرست سازی، کتابیات اور اُن کے مشمولات کی ترتیب کی روایت موجود ہے لیکن بچوں کے رسائل کی طرف کبھی اس طرح توجہ کی گئی۔ فیروز بخت احمد کی یہ پہلی کوشش نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ کیونکہ یہ اپنی روایت اور تاریخ کو محفوظ کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اگر اب اس طرف توجہ نہیں گئی تو شاید آگے اس کو محفوظ نہیں کیا جاسکے گا۔ کیونکہ ابھی فیروز بخت احمد اور نکہت ستار (کراچی) کے 'کھلونا' کا خزینہ موجود ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں اس کو گھر کا کاٹھ کباڑ جان کر ٹھکانے لگا دیں۔ اس طرح کی کئی مثالیں دریا گنج دہلی میں اتوار کو لگنے والے کتاب بازار میں اکثر مل جاتی ہیں۔

'کھلونا' کی مقبولیت کے سلسلے میں فیروز بخت احمد نے ہی کہیں بڑا دلچسپ واقعہ لکھا کہ ''ایک مرتبہ ماہنامہ 'کھلونا' کے مدیر اور بانی یونس دہلوی 60 کی دہائی میں کسی فلائٹ سے دبئی جا رہے تھے۔ اتفاق سے ان کی بغل کی سیٹ پر معمر سیاست داں سید محمود بیٹھے تھے۔ انھوں نے یونس دہلوی کو پہچان لیا اور دونوں میں گفتگو شروع ہوگئی۔ دوران گفتگو سید محمود صاحب نے کہا ''یونس صاحب! آپ کے رسالے میں شائع ہونے والی ایک عبارت سے میں متفق نہیں ہوں۔'' یونس صاحب نے دریافت کیا تو محمود صاحب نے

جواب دیا۔ بھائی آپ لکھتے ہیں کہ 'کھلونا' آٹھ سے اسی سال کے بچوں کے لیے ہے مگر میں تو اسی برس سے زیادہ کا ہوں اور بڑے شوق سے آج بھی پڑھتا ہوں۔ اسی طرح ایک واقعہ اور بھی انھوں نے لکھا کہ 'ان کے کسی کالم کو پڑھ کر پاکستان کی نکہت ستار نے ان سے ای میل کے ذریعے رابطہ کیا کہ ''اس (کھلونا) کے تمام پرچوں کو نہ صرف اپنے پاس محفوظ رکھا ہے بلکہ انھوں نے ایک 'کھلونا' کلب بھی قائم کر رکھا ہے جس میں وہ ماہنامہ کھلونا کے شماروں اور 'کھلونا' بک ڈپو کی کتابوں کا لین دین کرتی ہیں۔

'کھلونا' کے پرستار آج بھی اس کو اپنے بچپن کی یادگار کے طور پر گلے سے لگائے ہیں۔ مزید اگر کھلونا کی تمام کاپیوں کو Digitalize کر کے اس کی ایک سائٹ بنا دی جائے تو وہ انشاء اللہ ہمیشہ ہمیشہ کے محفوظ ہوسکتا ہے۔

مکتوبات ماجدی (جلد ہفتم)

مرتب: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
صفحات: 432، قیمت: 300
ناشر: اپلائڈ بکس 1739/3 نیو کوہ نور ہوٹل، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: شاہد الاسلام

جید عالم دین، صاحب طرز انشا پرداز، ممتاز صحافی اور تفسیر ماجدی کے خالق مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط کا مجموعہ 'مکتوبات ماجدی' (جلد ہفتم) پیش نظر ہے جس کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے بہ حسن وخوبی انجام دی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا شمار ان جلیل القدر علما میں ہوتا ہے جنھیں خدائے بزرگ و برتر نے بے پناہ علمی، ادبی و صحافتی صلاحیتوں سے نوازا اور زندگی کی آخری سانس تک انھوں نے علم و ادب کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ زائد از 60 کتابوں کے مصنف مولانا موصوف اعلیٰ پایہ کے مترجم بھی تھے، صحیفہ نگاری ان کا محبوب مشغلہ تھا، شعروادب، تنقید وتحقیق اور فلسفہ وعلوم اسلامیہ پر ان کی مربوط ومبسوط تحریروں کو سند کا درجہ حاصل ہے۔

بیک وقت مختلف اصناف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کرنے والے مولانا عبدالماجد دریابادی نے جملہ شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مشاہیر سے مراسلت کا ایک ایسا طویل سلسلہ قائم کیا جسے مکتوب نگاری کے باب میں قابل قدر اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مولانا کے خطوط کے اس سے قبل 6 مجموعے ادارہ 'انشائے ماجدی' کلکتہ سے شائع ہوکر خواص عوام کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ مکتوبات ماجدی جلد ہفتم اس سلسلے کی ساتویں کڑی ہے جسے ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے ناشر محمد عارف اقبال ہیں، جنھوں نے اسے 'اپلائڈ بکس' کے بینر تلے شائع کیا ہے۔ مراسلوں کے اس مجموعہ کی خاص بات یہ ہے کہ سابقہ جلدوں کے مقابلے میں اس جلد میں مکتوب الیہم کی تعداد زیادہ ہے۔ دوسری خصوصیت جو خود مرتب موصوف نے پیش لفظ میں بیان کی ہے، وہ یہ کہ زیر تبصرہ مجموعہ میں وہ خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں جو 1953 سے پہلے لکھے گئے تھے۔ مکتوبات کے اس مجموعہ کی ایک قابل ذکر بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس میں بعض ایسے مکتوب الیہم بھی موجود ہیں جو اِس وقت اردو کی ادبی اور صحافتی دنیا میں قابل احترام شخصیت کے مالک بھی تصور کیے جاتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں سے رونق بزم بھی قرار پاتے رہے ہیں۔ اس مجموعہ ہائے مکتوبات میں جن 94 مکتوب نگاروں کے نام مرحوم مولانا کے تقریباً 500 خطوط شامل کیے گئے ہیں، ان کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہوئے بلاخوف تردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کاتب مرحوم نے مختلف علمی، ادبی، نیم ادبی، ثقافتی، دینی و دنیوی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے اہل علم سے اپنے قلمی رشتوں کو کچھ اس طرح استوار کیا ہے جسے موضوعاتی رنگارنگی کا بہترین مرقع کہا جاسکتا ہے۔ کسی مراسلہ میں ادبی حلاوت کا احساس ہوتا ہے تو کسی مکتوب میں دینی مزاج کی آئینہ داری محسوس کی جاسکتی ہے۔ کسی خط میں فلسفیانہ موشگافیوں کی جلوہ سامانی دکھائی دیتی ہے تو کسی رقعہ میں علمی بحث کا دفتر کھلتا دکھائی دیتا ہے۔ غرضیکہ موضوعاتی لحاظ سے تنوع نمایاں طور پر اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ مراسلوں کی تفہیم کے لیے مرتب کی حاشیہ برداری بھی بڑے غضب کی ہے جس سے ابہام واشکال کے در وا ہونے سے قبل ہی مقفل ہو جاتے ہیں اور مکتوب الیہ سے مولانا کے تعلقات کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ کن صاحبان سے ان کے مراسم کیسے تھے۔

زیر تبصرہ کتاب میں شامل تمام مکتوبات کا الگ الگ جائزہ لینا ممکن نہیں لہٰذا چند خطوط کا خصوصی طور پر ذکر کیا جارہا ہے تاکہ مولانا دریابادی کے افکار وخیالات کو سمجھنا آسان ہوسکے۔ 'مکتوبات ماجدی' جلد ہفتم میں شامل پہلا خط مولانا اسعد اللہ خان کے نام ہے جو اس زمانہ میں جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور کے ناظم تھے۔ یہ رقعہ مولانا نے 2 جون 1959 کو تحریر کیا تھا۔ جس میں تھانہ بھون، تفسیر ماجدی کے کاپی رائٹ اور کتب خانہ 'صدق بک ایجنسی' کا تذکرہ کچھ یوں کیا گیا ہے:

''مدت دراز کے بعد فی الجملہ خیریت دریافت کر کے خوشی ہوئی۔ اللہ شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ جی ہاں تھانہ بھون کی صحبتیں اور محبتیں اکثر یاد آتی رہتی ہیں۔ تفسیر کے اس ایڈیشن کی کاپی رائٹ تاج کمپنی کو حاصل ہے، وہیں سے کتاب کی اشاعت ہوئی ہے۔ میرے پاس بجز میرے ذاتی نسخے کے اور کچھ نہیں رہتا۔ تاج کمپنی ہی سے خرید کر صدق بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ فروخت کرتی ہے۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی کو حکیم الامت مولانا سید اشرف علی تھانویؒ سے گہری عقیدت تھی اور بقول مرتب مولانا دریابادی حکیم الامت کی صحبت بابرکت سے مستفید ہونے کے لیے تھانہ بھون جاتے رہتے تھے۔ اسی تعلق خاص کی بنیاد پر مراسلہ نگار نے درج بالا خط میں تھانہ بھون کی صحبتوں اور محبتوں کا ذکر کیا ہے۔

ملک کے ممتاز صحافی احمد سعید ملیح آبادی کے نام خط میں مولانا دریابادی نے بانی آزاد ہند کولکاتا (عبدالرزاق ملیح آبادی) سے اپنے تعلق خاص کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے:

''مرحوم سے میرے تعلقات جہاں تک یاد پڑتا ہے 1918 سے شروع ہوئے اور تقریباً دس سال تک گہرے مخلصانہ تعلقات بالکل عزیزانہ اور برادرانہ رہے...... اس دس سال کی خوش گوار یاد اب تک قائم ہے۔ مرحوم اس وقت تازہ ولایت یعنی مصر سے واپس آئے تھے اور جوش عملی کے ایک پیکر مجسم تھے، خوبصورت چہرے پر خوش نما داڑھی بہت بھلی لگتی تھی اور لباس بھی اس وقت خالص مشرقی تھا۔ مجھ سے آخری ملاقات غالباً 1926 میں ہوئی تھی۔ داڑھی مونچھ کی صفائی وضع ولباس کی تبدیلی یہ سب واقعات بہت بعد کے ہیں۔''

اس مجموعۂ مکتوب میں شامل بیشتر خطوط دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔ فراق گورکھپوری، حیات لکھنوی، مولانا محمد تقی امینی، احمد جمال پاشا، صبا لکھنوی، مولانا کوثر نیازی، بیگم صالحہ عابد حسین، نصیر الدین ہاشمی، ساغر نظامی، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا مفتی شفیع، حکیم عبدالحمید، سردار خشونت سنگھ، شان الحق حقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر محی الدین زور، چودھری غلام رسول مہر، شوکت تھانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مسعود حسن رضوی ادیب وغیرہم سے مولانا دریابادی کی مراسلت خاصے کی چیز کہی جاسکتی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی 432 صفحات پر مشتمل مکتوبات ماجدی (ہفتم) کا یہ نسخہ عوام اور خواص دونوں کے لیے مفید ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور قیمت بھی مناسب۔

پلیتہ

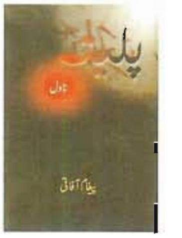

مصنف: پیغام آفاقی
صفحات:600، قیمت:600روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: رحمٰن عباس، 206، پونم پارک،
نزد حیدر چوک، میرا روڈ، تھانہ (مہاراشٹر)

پیغام آفاقی اردو دنیا میں افسانہ نگار، مضمون نویس اور ناول نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ پیغام کا پہلا ناول 'مکان' قریباً دو دہائی قبل شائع ہوا تھا۔ مکان کی اشاعت نے پیغام کو ایک سنجیدہ ناول نگار کے طور پر متعارف کرایا۔ اس ناول کو سنجیدہ ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد پیغام آفاقی ناول کے افق سے غائب رہے جس کا ملال ان کے دوستوں اور قارئین کو ضرور ہوا ہوگا۔ پیغام آفاقی اب اپنے دوسرے ناول 'پلیتہ' کے ساتھ ہمارے سامنے وارد ہوئے ہیں۔ اس ناول کے موضوع اور اس کی ضخامت کے بعد اس بات کا انداز ہوتا ہے کہ اتنے طویل عرصے تک وہ کہاں غائب تھے اور کیا کر رہے تھے۔ دراصل پیغام آفاقی 'پلیتہ' کی بنت کو فن کارانہ روپ عطا کرنے اور اس ناول کے لیے درکار تجربات کو وسعت دینے کے لیے انڈومان کی سنسان بستیوں اور جانے کتنی لائبریریوں میں کرم خوردہ کتابوں کے مطالعے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پیغام آفاقی کے مذکورہ ناول میں تاریخی مآخذات اور تاریخی سچائیوں کی ایک دنیا آباد ہوگئی ہے لیکن ریسرچ ناول کے صفحات میں اس طرح سما گئی ہے جیسے دھواں بادلوں میں سما جاتا ہے اور ہم فرق نہیں کر پاتے۔ اردو ناول کی مختصر سی تاریخ میں سیاسی بادلیدگی پر اتنا عمدہ ناول نہیں لکھا گیا ہے۔

'پلیتہ' 600 صفحات پر مشتمل ہے جس کے بارے میں مشرف عالم ذوقی نے بجا فرمایا ہے کہ 'پلیتہ' میں آپ نئی صدی کی بازگشت کو بہ آسانی محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ بازگشت کالا پانی کی سزا کاٹنے والے افراد، انگریز سامراج کی سیاہ کاریاں اور اس پس منظر میں موجودہ سماجی اور سیاسی زندگی کی سنگلاخی اور سفاکی کا قصہ ہے۔

'پلیتہ' کی کہانی خالد سہیل کی پراسرار موت کے رمز سے شروع ہوتی ہے۔ خالد سہیل کی موت کے بعد اس کے کمرے سے کچھ تحریریں دستیاب ہوتی ہیں جن سے یہ احساس ہوتا ہے کہ خالد کی موت کے ساتھ ان تحریروں اور خیالات کا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہے۔ ناول نگار قاری کو اس دنیا کی سیر کرانے لے جاتا ہے جسے کالا پانی کہتے ہیں اور جہاں خالد نے زندگی کی ایسی تصویر دیکھی تھی جس کا اظہار، شفافیت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود سامراجی تصوارت کی بنائی ہوئی مہذب دنیا میں نہیں کیا جاتا۔ یہ بہ ظاہر مذہب کہی جانے والی دنیا دراصل ظلم، مفادات کے حصول کے لیے استحصال اور محکوم اقوام پر مظالم سے عبارت ہے۔ یہ سفاک حقیقت نگاری ہے جو پیغام آفاقی کو انگریزی ناول نگار جارج اورئیل کے ناول 1984 کے قریب لے آتی ہے۔ پیغام آفاقی کا بیانیہ اس ناول کی طاقت ہے جو انتہائی باریک بینی سے انگریز سامراج کی فلسفیانہ بنیادوں میں دبی ہوئی غیر انسانی اخلاقیات کا پردہ فاش کرتا ہے۔

خالد سہیل کی موت کے پس منظر میں اس بات کو دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ وہ اپنے دادا امیر علی کی زندگی کے حالات کی دریافت کے لیے انڈومان جاتا ہے۔ وہ اپنے دادا کے خلاف ہونے والے مقدمے کو ایک تاریخی لڑائی میں تبدیل کرنے کا متمنی تھا۔ لیکن اسے اس بات کا قطعی گمان نہیں تھا کہ اس کوشش میں اس کے ہاتھ ایک ایسا مقدمہ آئے گا جس کے سرے پوری انسانی تاریخ میں سمائے ہوئے ہوں گے۔ یہ حقیقت اور اس کا انکشاف کروڑوں افراد کی زندگی کی سنگین داستانوں سے اسے روشناس کرے گا۔ جن کا مداوا فلسفیانہ افکار کی نئی تفسیر اور تعبیر میں تلاش کیا جانا چاہیے ایک ایسا فلسفہ جو آج کی زندگی کی سچائیوں میں آدمی کو تھام سکے، آدمی کو آدمی رہنے کی اجازت دے سکے۔

پیغام آفاقی نے بیانیہ کی رو میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ خالد ''تو دراصل اس بڑے واقعہ میں اپنے ہی موجودہ معاشرے اور ملک کو دیکھ رہا تھا البتہ اس کو اس وقت اس کا بالکل شعور نہیں تھا۔'' ناول آگے چل کر سول سوسائٹی کی اساس اور آدمی کی بے وقعتی پر سوالات قائم کرتا ہے جن سے قاری خود کو نہ صرف مربوط کرتا ہے بلکہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جس طرح کے 'سوکولڈ جمہوری نظام' میں وہ جی رہا اس میں اس کی حیثیت ایک قیدی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے حقوق، اس کی شناخت، اس کی آزادی، سب محکومی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایک نئے معاشرے کی اسے ضرورت ہے جس میں اقتدار کی سفاکی سے نجات حاصل ہو۔

'پلیتہ' کی سنجیدہ قرات کے دوران قاری ہر اس مسئلے کو محسوس کرتا ہے جو اس کے اردگرد آج موجود ہیں۔ سیاسی بے حسی، انسانی حقوق کی پائمالی، کارپوریٹ اور سامراجی کلچر کی پھیلائی ہوئی معاشی اور سیاسی انارکی، مارکیٹ اکانومی کی حقیقت، گلوبلائزیشن، مفادات کے لیے سامراجی جنگیں اور میڈیا مینیا وغیرہ۔ اس ناول میں تاریخی کردارں اور کالا پانی کی سزا کی تفاسیر سے مصنف نے استفادہ کرنے کے بجائے ایک فراموش کردہ، سازش کے طور پر فراموش کردہ' حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جس کے توسط سے مصنف یہ بات بیان کرنا چاہتا ہے کہ جو حقیقت ہمارے عہد میں اسٹبلیش کی جاتی ہے ممکن ہے کہ وہ جھوٹ ہو اور یہ جھوٹ اقتدار کی لبوریٹری میں پالیسی کے تحت تیار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو سچ کا عرفان ہو جائے تو اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو خالد سہیل کا ہوا ہے۔ 'پلتیہ' سنجیدہ سیاسی ناول ہے۔ جس پر مکالمہ لازمی ہے۔ یہ مختصر تبصرہ کتاب کی قرات اور مکالمے کا دعوت نامہ ہے۔

رُوبرو (ریڈیو انٹرویوز کا مجموعہ)

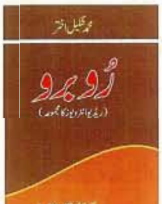

تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر محمد شکیل اختر
صفحات:400، قیمت:215 روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
مبصر: اصغر اعجاز، امامیہ ہال، نیشنل کالونی، امیر نشاں، علی گڑھ

انٹرویو کا حتمی مقصد ناظرین، سامعین یا قارئین کو کسی مخصوص شخصیت، حالات یا خیالات سے خاطر خواہ واقفیت یا آگاہی دلانا ہوتا ہے۔ اگر کوئی صحافی ذرائع ابلاغ خصوصاً اخبار، میگزین، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ کے انٹرویو کے فن اور رموز سے بخوبی واقف نہیں ہے تو وہ ایک مستند اور معتبر صحافی کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ انٹرویو صحافت کا خاصہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ہی مقبول ترین صنف بھی ہے اور اخبارات کے بعد جس میڈیم نے اس کو ترویج اور ترقی کی منزلیں عطا کی وہ یقیناً ریڈیو ہی ہے۔ انٹرویو کے نقطۂ آغاز اور تاریخ کے سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنا بڑا مشکل ہے البتہ زیر نظر کتاب انٹرویو کی تاریخ اور ارتقا کو سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہوگی۔ انیسویں صدی میں چھاپہ خانے کی ایجاد سے دنیا بھر میں تعلیم و تعلم کے شعبے میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی اور یہ انقلابی دھمک ہمیں ذرائع ابلاغ کی دنیا میں بھی نظر آئی نتیجتاً پہلے کے مقابلے اب اخبارات بھی زیادہ تعداد میں شائع ہونے لگے اور انٹرویو جیسی صنف کے دھندلے نقوش ہمیں ان اخبارات میں شاذو نادر نظر آنے لگے۔ کتاب کے محقق و مرتب ڈاکٹر شکیل اختر نے بیس صفحات پر مشتمل اپنے دیباچے میں بڑے ہی بیباک اور حقیقت پسندانہ طور پر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ آج کل انٹرویو خصوصاً ٹیلی ویژن انٹرویو کا مقصد جوابات کا حصول نہیں بلکہ جارحانہ نقطۂ نظر کا مسلسل اظہار ہے جو صحافت کے پیشہ ورانہ اصولوں سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا جس کا اظہار انھوں نے اپنے طویل دیباچے میں کیا ہے۔

کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت ڈاکٹر شافع قدوائی نے اس قسم کی انٹرویونما گرما گرم بحث کے پس پردہ مقصد کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ انٹرویو کے دوران مہمان کے تئیں جارحانہ رویے کا اصل سبب یہ ہے کہ ٹی وی چینل اپنی TRP بڑھانے کے لیے لڑائی جیسی صورتِ حال پیدا کرنے کا مسلسل التزام رکھتے ہیں کہ اس سے ناظرین کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور پروگرام زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل اختر نے انٹرویو کے مقصد اور افادیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب بڑی دلجمعی اور لگن کے ساتھ مرتب کی ہے۔ انٹرویو کے مروجہ چلن کے برعکس انھوں نے انٹرویو کے ذریعے تمام بڑے شاعر، ادیب، محقق اور تنقید نگاروں کے تخلیقی اور تنقیدی گوشوں کو ہمارے سامنے لانے کی نہایت عمدہ سعی کی ہے جو ہمارے علم میں اضافہ کرنے کے ساتھ ہمیں ادیب یا شاعر کے ان نہاں خانوں کی بھی سیر کراتے ہیں جن سے دنیا ابھی تک ناواقف ہے۔ انٹرویو کے حوالے سے انھوں نے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے ایک پروگرام 'ہم خیریت سے ہیں' کے ذریعے انٹرویو کی اہمیت اور افادیت کو ہم پر منکشف کرنے کی کوشش کی ہے۔

انٹرویو کے سلسلے سے ان کی یہ بات بڑی معتبر ہے کہ اگر آپ ایک منفرد انٹرویور بننا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنا ایک الگ اسلوب وضع کرنا پڑے گا اور سوالات پوچھنے کے طریقہ کار میں بھی نیا پن لانا پڑے گا۔ سامعین سوال کے ساتھ ساتھ جواب سننے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انٹرویو کے منجملہ پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے پیشِ نظر کتاب 'روبرو' انٹرویو کا ایک انوکھا اور نایاب مجموعہ ہے اگرچہ یہ کوئی نئی کوشش نہیں ہے کیونکہ اردو ادب میں معصوم مرادآبادی کا 'بالمشافہ'، ڈاکٹر طاہر مسعود کا 'یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'، ندا فاضلی کا مجموعہ 'ملاقاتیں'، گوپی چند نارنگ کا مجموعہ 'دیکھنا تقریر کی لذت' اور مناظر عاشق ہرگانوی کا مجموعہ 'روبرو' جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔ ان تمام مجموعوں میں ایک ہی شخص کئی شخصیات سے روبرو نظر آتا ہے لیکن زیرِ نظر کتاب میں متعدد ادبی شخصیات سے متعدد بڑے نام روبرو ہوئے ہیں جنھوں نے ان کا انٹرویو لیا ہے جن میں مجیب صدیقی، محمود ہاشمی، کے کے نیر سے لے کر شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ تک شامل ہیں اس کے علاوہ انٹرویو دینے والوں میں فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، راجیندر سنگھ بیدی، امرتا پریتم، جاں نثار اختر، اختر الایمان اور عصمت چغتائی سے لے کر کشور ناہید، منیر نیازی، احمد فراز، حبیب جالب، افتخار عارف، انتظار حسین اور جمیل جالبی جیسی سرکردہ ادبی شخصیات شامل ہیں۔ اس کتاب میں شامل تمام انٹرویو لائق مطالعہ ہیں جن کے ذریعے ان ادیبوں کی داخلی زندگی، مشاغل، مصروفیات، نظریات اور ادبی و علمی سروکاروں سے خاطر خواہ آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شامل تمام انٹرویو جو کہ اب آل انڈیا ریڈیو کا ایک بیش قیمتی سرمایہ ہیں ان کو ٹیپ سن کر لکھا گیا ہے۔ اردو سروس کی یہ نشریات ایک زمانے میں کافی مقبول تھیں اور ان کی بڑی اہمیت ہے اس لیے کہ اس میں کہی گئی بعض باتیں، نقطے اور انکشافات ایسے بھی ہیں جن سے سامعین یا قارئین پہلے باخبر نہیں تھے۔

اسی طرح مجیب صدیقی نے جب اختر الایمان سے یہ پوچھا کہ بطور ایک فلم مکالمہ نگار معاشرے میں کس قسم کا سدھار لانے کی کوشش کریں گے تو انھوں نے اس بات کا بڑا ہی پرتاثر جواب دیا کہ 'میرے ذہن میں جو یہ بات تھی وہ یہ کہ لچر بات نہیں کرنی چاہیے اور آپ جو لکھیں اس کا اثر لوگوں پر برا نہیں پڑنا چاہیے اس لیے کہ فلم کا ایک تبلیغی پہلو تو ہے۔ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں مگر اس کا ایک پہلو تو یہ ہے۔ میں نے کوشش یہ کی ہے کہ جو بھی کہانی لکھوں اس کے کردار ایسے ہوں جن کا اچھا اثر پڑے۔ خواجہ احمد عباس سے کے کے نیر نے ان کی ادبی اور فلمی زندگی کے حوالے سے جب یہ پوچھا کہ آپ کے اندر کا جو ادیب ہے وہ آپ کے فلم ساز سے مطمئن ہے یا نہیں تو انھوں نے اس کا جواب نفی میں دیا اور اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ 'فلم سازی کے لیے بہت سے دماغوں کے اشتراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادیب تو صرف اپنے دماغ سے کام لیتا ہے اور فلم ساز اپنے دماغ سے۔ اپنے کیمرہ مین کے دماغ سے، ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے دماغ سے، وسائل سے، پیسے سے، فلم اسٹاک سے ملا کر وہ اس کی تخلیق کرتا ہے اس لیے میں سو فیصد اپنی کسی فلم سے یا فلم سازی سے مطمئن نہیں ہوں۔

اس قسم کے تمام انکشافات، نظریات، جوابات اور خیالات سے یہ کتاب اٹی پڑی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ قاری کے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ بڑے بڑے ادبا اور مشاہیر کے خارجی اور داخلی سرچشموں سے واقفیت ہوگی اور ان کے ادبی، سماجی اور معاشرتی نظریات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی نیز ان کی ذہنی کشمکش اور ان کی شخصیت کی مختلف پرتوں تک رسائی حاصل کرنے میں رہنمائی ہوگی۔ قوی امکان ہے کہ اس کتاب کا دنیائے ادب میں بڑا ہی والہانہ خیر مقدم ہوگا۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی (حیات اور کارنامے)

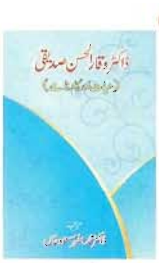

مرتب: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں
صفحات: 680، قیمت 600
ناشر: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں، تالاب ملا رام، رامپور
مبصر: ڈاکٹر نوشاد عالم، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی

زیرِ تبصرہ کتاب 'ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی (حیات اور کارنامے)' مضامین، منظومات، متفرقات اور Introduction جیسے ابواب پر مشتمل ایک ضخیم مگر قابلِ قدر کتاب ہے جسے ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے نہایت عرق ریزی اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔ مذکورہ کتاب کی ترتیب و تہذیب کے سلسلے میں ان کی جانفشانی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 680 صفحات پر مشتمل کتاب میں انھیں مضامین کا انتخاب شامل ہے جنھیں انھوں نے بذاتِ خود قلم کاروں سے حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کی بلند قامت و عہد آفریں شخصیت، ان کی عصری آگہی، شعر و ادب کا رچا ہوا شعور اور رضا لائبریری سے والہانہ وابستگی و شیفتگی اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں کوئی ٹھوس اور اساسی کام ہو اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کی یہ تحقیقی کد و کاوش لائقِ ستائش ہے۔

کتاب میں مضامین کا باب خاصا وسیع ہے جس میں اساتذہ، اسکالرز اور مختلف دانشوروں کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے بالاستیعاب مطالعہ سے نہ صرف ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کی ہمہ جہت اور رنگا رنگ شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کی انسانی ہمدردی، چھوٹوں سے محبت و شفقت، اوالولعزمی اور ان کے سیکولر مزاج کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ مضامین کا ایک معتد بہ حصہ ان کے شعری اسلوب کی شناخت، متغزلانہ آہنگ کا تجزیہ اور 'عکسِ ہستی' کے حوالے سے ان کی شاعری کی مختلف جہات و ابعاد کو اجاگر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، رضا لائبریری سے ان کی شیفتگی اور محبت، اس کو ایک اہم اشاعتی ادارے کے حیثیت سے ساری دنیا میں متعارف کرانے کا بیان بھی کتاب کے اسی حصے میں مندرج ہے۔ وقار الحسن صدیقی نے رضا لائبریری میں 1993 سے 2011 تک کی مدت میں اپنی فعالیت اور سرگرمی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے سو سے کچھ اوپر کتابیں شائع کرائیں جو یقیناً قابلِ صد افتخار بات ہے۔ مزید برآں مرتب نے 1928 سے 2011 تک رضا لائبریری سے شائع مطبوعات کی مکمل فہرست بھی پیش

کی ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت و وقعت مزید بڑھ جاتی ہے۔

وقار صاحب اسلامیات اور مشرقیات سے خصوصی شغف رکھتے تھے۔ اردو فارسی علوم کے ساتھ اسلامی تہذیب وثقافت اور تاریخ کا بھی ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا لیکن اس کے با وصف ان کی شخصیت میں سیکولرزم کا عنصر ایک کلیدی اہمیت رکھتا تھا چنانچہ انھوں نے اپنی مدت کار میں ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے پروگراموں کا اہتمام کیا، عالمی اور کل ہند مشاعرے ہوئے تو اکھل بھارتیہ کوی سمیلنوں کا بھی انعقاد ہوا، اردو، فارسی اور عربی مخطوطات نیز کلام پاک کے نادر ونایاب قلمی نسخوں کی نمائش ہوتی تو دوسری طرف ہندی اور سنسکرت کی مطبوعات، تاریخی مخطوطات، مذہبی کتابوں اور بھوج پتروں کی نمائش کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ ان کی اختراع پسند طبیعت نے ادب، سماج اور رضا لائبریری کو ان گنت چیزیں دیں۔ انھوں نے ہر سال ہندی میں 'راج بھاشا پتریکا' شائع کرنے کی بھی روایت قائم کی۔

مضامین کے علاوہ منظومات ومتفرقات کا باب بھی اس اعتبا سے قابل قدر ہے کہ ان میں وقار صاحب کے تعلق سے مختلف لوگوں کے تأثرات اور خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ وقار الحسن کے مختصر سوانحی کوائف کے بیان نے کتاب کو ہر جہت سے مکمل کر دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں دو مضامین انگریزی میں Introduction کے عنوان سے ہیں جن میں وقار الحسن صدیقی کی محکمۂ آثار قدیمہ میں بطور ڈائریکٹر فرائض انجام دینے کی روداد کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کا تعارف بھی شامل ہے۔

مرتب کو اگر وہ خطوط مل جاتے جو وقار الحسن صاحب کے نام آئے تھے اور وہ خطوط بھی جو وقار صاحب نے اپنے احباب کے لکھے تھے تو وقار صاحب کی شخصیت کے کئی اور پہلو روشن ہو سکتے تھے لیکن بایں ہمہ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کی یہ تحقیقی کاوش قابل مبارکباد ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی (حیات اور کارنامے) ترتیب دے کر ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کر دی ہے۔

مولوی محمد سلیمان کی ادبی خدمات

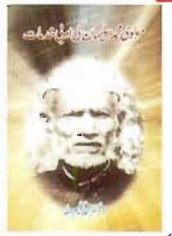

مصنف: ڈاکٹر محمد کلیم اللہ

صفحات: 175، قیمت: 200 روپے

ناشر: مصنف

مبصر: عذرا نقوی، اڈمیکس NRI سٹی، GH2، ٹاور 3، فلیٹ نمبر 203 گریٹر نوئیڈا

'مولوی محمد سلیمان کی ادبی خدمات' ڈاکٹر کلیم اللہ کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ حالات زندگی، محمد سلیمان کی ادبی خدمات (1. شعری، 2. نثری)۔ انتخاب کلام سلیمان۔ اور اردو ادب میں سلیمان کا مقام۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ڈاکٹر کلیم اللہ نے پورنیہ کے تاریخی اور ادبی پس منظر پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مولوی محمد سلیمان پورنیہ کی ادبی اور ثقافتی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں۔ انھوں نے ادب کی خدمت پورے خلوص اور خاموشی سے کی ہے۔ وہ شاعر، صحافی، خاکہ نگار، اور سوانح نگار ہیں اور تنقید نگار، اور ترجمہ نگار کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے ایک کامیاب وکیل تھے۔ مولوی محمد سلیمان نے اپنی زندگی کے پچھتر سال گزار کر 1957 میں انتقال فرمایا۔ ان کے ادبی سرمائے میں مندرجہ ذیل تصنیفات اور تالیفات شامل ہیں:

گلبن فصاحت (رسالہ)۔ حسنیٰ سیاہ فام (مثنوی)۔ حیات فرید (داد کی سوانح)، اقبال اور وطن کی محبت۔ مقالات نیومن (ترجمہ)۔ نوائے نے (شعری مجموعہ)۔ اس کے علاوہ ان کے مختلف مضامین ومقالات بھی ہیں، جو مختلف جریدوں شائع ہوتے رہے۔

پورنیہ کی تاریخ اور ادبی اہمیت کے تعلق سے ڈاکٹر کلیم اللہ نے 'انسان' اخبار کے پورنیہ نمبر کے حوالے سے لکھا ہے ''یہ ضلع جس طرح تاریخی یادگاروں کے لحاظ سے مالا مال ہے، اسی طرح اپنی جغرافیائی محل وقوع اور سیاسی وعسکری نقطۂ نظر سے ہمیشہ اہم رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اور علمی، ادبی، صحافتی، سیاسی خدمات لے لحاظ سے ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جائے۔ اس ضلع میں علم وادب کا چرچا کوئی نئی چیز نہیں۔ اس نے نواب سعید احمد صولت جنگ اور شوکت جنگ جیسے فوجداروں کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

مولوی محمد سلیمان کا خاندانی نام سلیمان اور تخلص سلیمان ہے۔ ان کی پیدائش قدیم ضلع پورنیہ کے پلاس منی گاؤں میں (1901) میں ہوئی۔ یہ گاؤں زمانہ قدیم سے اردو فارسی علم وادب کا مرکز رہا ہے۔ اس گاؤں ان کے خاندان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، یہ خاندان باوقار، تعلیم یافتہ اور اہل جائداد تھا۔ ان کے دادا فرید بخش منصف تھے۔

محمد سلیمان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ مذہب، اقتصادیات، ادبیات، قانون، ہر طرح کی کتابیں پڑھتے تھے۔

ڈاکٹر کلیم اللہ نے اپنی تنقیدی وتحقیقی بصیرت کا استعمال کرتے ہوئے مولوی محمد سلیمان کی مکمل ادبی خدمات کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان کی شعری ونثری خدمات اور اردو ادب میں ان کے مقام پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر کلیم اللہ نے جہاں مولوی محمد سلیمان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے وہیں انتخاب کلام سلیمان کر کتاب کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف ان کی ادبی خدمات بلکہ ان کی تخلیقات بھی دی گئی ہیں جس سے یہ کتاب کافی مفید بن پڑی ہے۔ ڈاکٹر کلیم اللہ کے مطابق ان کا غیر مطبوعہ کلام بھی کافی ہے۔ ان میں رومانی سیاسی، مذہبی نظمیں، طرحی غزلیں مشاہیر کی موت پر تعزیتی نظمیں شامل ہیں۔

محمد سلیمان کی تین مطبوعہ نثری تصانیف ہیں۔ ''حیات فرید'' سولہ صفحات پر مشتمل ہے اس میں میں انھوں نے اپنے دادا فرید بخش کا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔ دوسری مطبوعہ تصنیف ''اقبال اور وطن کی محبت، 1938 میں شائع ہونے والی یہ کتاب 32 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اقبال کی حب الوطنی اور اور وطن دوستی کی وکالت کی ہے۔ محمد سلیمان رقمطراز ہیں'' اقبال حبّ وطن کے مخالف نہ تھے بلکہ اس عصبیت کے خلاف تھے جس سے انسانیت چھن جائے''۔ مقالات نیومین، 42 صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ انگریزی کے نامور ادیب کارڈینل نیومین کے پانچ مقا لات کو ترجمہ ہے۔ اس کے مشمولات مندرجہ ذیل ہیں۔ (1) دیباچہ، (2) علم اپنی غایت آپ، (3) یونیورسٹی، (4) شریف النفس، (5) یونیورسٹی کے فیضانات، (6) لٹریچر۔

ان نثری کتابوں کے علاوہ محمد سلیمان نے کئی کتابوں کے مقدمے اور دیباچے بھی لکھے ہیں اور ان کے متعدد مضامین مختلف اردو جریدوں میں چھپے ہیں۔ بدیا دھر۔ 'پورنیہ کی ایک قدیم تصنیف' ان کا ایک اہم مقالہ ہے۔ 'پورنیہ میں علم وادب کا چرچا' بھی ان کا ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ اس کے علاوہ اور ان کے اور بھی اہم مضامین تاریخی نوعیت کے ہیں۔ 'جنت آباد گور' میں انھوں نے گور کے مقام کا جغرافیائی اور تاریخی تعارف کرایا ہے۔ ان کا ایک اور اہم مضمون 'سری پوریا یا کشن گنجیا' ہے جس میں انھوں نے کچھ لسانی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔

مصنف ڈاکٹر کلیم اللہ نے اپنی کتاب 'مولوی محمد سلیمان کی ادبی خدمات' کے آخیر میں انتخاب کلام سلیمان پیش کیا ہے۔ پوری مثنوی 'حسنہ سیاہ فام' کے علاوہ 'نوائے نے' سے منتخب نظمیں اور غزلیں اور ان کی چار فارسی نظمیں شامل ہیں اور اس کے بعد'' اردو ادب میں محمد سلیمان کا مقام'' عنوان کے تحت اکابرین کی آرا پیش کی ہیں۔ ◘

ادارہ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ نئی دہلی 110025

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی XXXV ویں میٹنگ کی روداد

تاریخ: 18.10.2012 وقت: 11.00 بجے صبح مقام: بورڈ روم (فرسٹ فلور)، انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر 87-86 لودھی روڈ، نئی دہلی

میٹنگ میں موجود قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، ایگزیکیوٹیو بورڈ کے ممبر شیخ علیم الدین اسعدی، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر محمد عبدالحکیم ازہری، سید وقار الدین، وزارت کے نمائندے ایس کے ساہا اور ستپال شرما

حاضرین:

(1) پروفیسر وسیم بریلوی (وائس چیئرمین، قومی اردو کونسل) زیر صدارت

(2) ڈاکٹر محمد عبدالحکیم ازہری

(3) پروفیسر اختر الواسع

(4) جناب سید وقار الدین

(5) جناب شیخ علیم الدین اسعدی

(6) ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

وزارت کے نمائندے:

(1) جناب ایس کے ساہا (ڈی ایس [لسان] وزارت ترقی انسانی وسائل)

(2) جناب ستپال شرما (اے ایف اے [مالیات]، وزارت ترقی انسانی وسائل)

افتتاحی کلمات میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین نے ڈائرکٹر اور ایگزیکیوٹیو بورڈ کے اراکین کا استقبال کیا۔ اس کے بعد ایجنڈا آئیٹم پر بحث شروع ہوئی۔

آئیٹم نمبر XXXV.1 روداد کی تصدیق

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی xxxiv ویں میٹنگ منعقدہ 18 جون 2012 کی روداد کی تصدیق کی گئی اور ریکارڈ بھی کیا گیا۔

آئیٹم نمبر XXXV.2 عمل درآمد رپورٹ

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی میٹنگ منعقدہ 18 جون 2012 کی روداد پر عمل درآمد رپورٹ ملاحظہ کی گئی اور ریکارڈ میں درج کی گئی۔

آئیٹم نمبر XXXIV.5 پر بحث میں فیصلہ لیا گیا کہ یو جی سی کے ذریعے بنائے گئے ضابطے کو کونسل نہیں اپنائے گی۔ مختلف اسکیموں کے تحت چل رہے منصوبوں کو صحیح ڈھنگ سے چلانے کے لیے یہ فیصلہ لیا گیا کہ ہر پروجیکٹ اور قلیل مدتی مطالعے کو گرانٹ ان ایڈ اسکیم کے تحت چلنے والے پروجیکٹ کی حیثیت دی جائے گی۔ بورڈ نے اسکیموں میں ترمیم کی اور تجویز رکھی کہ ان پروجیکٹ کی مالی امداد مندرجہ ذیل کے تحت ادائیگی کی جائے گی۔

(الف) (I) 50,000 روپے منصوبے کا اعزازیہ (II) 10,000 روپے سفری اخراجات

(III) 10,000 روپے اسٹیشنری، پوسٹ آفس، زیروکس اور منصوبے کے لیے خریدی جانے والی کتابوں پر آنے والے ممکنہ اخراجات کے لیے۔

(ب) ایک سال کی معینہ مدت میں پروجیکٹ مکمل کیا جائے گا۔ پروجیکٹ کی تکمیل پر کتابیں اور ایسی اشیا جو پروجیکٹ کے لیے خریدی گئی تھیں کونسل کو سونپ دی جائیں گی۔

(ج) کونسل پروجیکٹ پر آنے والے اخراجات کے تعین کے ساتھ پروجیکٹ کی منظوری دے گی اور پروجیکٹ کی پیش رفت کو مدنظر رکھتے ہوئے قسطوں میں فنڈ جاری کرے گی۔

(د) پروجیکٹ کا مسودہ موصول ہونے کے بعد ماہرین کمیٹی کی سفارشات پر ہی اگلی قسط جاری کی جائے گی۔

(ہ) پروجیکٹ پر ہونے والے تمام اخراجات کا یوٹی لائزیشن سٹیفکیٹ جو چارٹرا کاؤنٹنٹ سے تصدیق شدہ ہو۔ پروجیکٹ کے اختتام مگر آخری قسط کی ادائیگی سے قبل داخل کرنا لازمی ہے جہاں کہیں بھی ضروری ہو وہاں ادائیگی کے لیے کمپوزر، پروف ریڈر، پریس، کاغذی تاجر، جلد سازی وغیرہ کے اصل بل/ واؤچر/ رسیدیں منسلک کی جائیں۔

(v) پروجیکٹ کے اختتام پر مذکورہ مواد کونسل کی ملکیت ہوگی اور حسب منشا شائع کیا جائے گا۔

آئیٹم نمبر XXXV.3 فائنانس کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ 18 جون 2012 کی روداد کا ملاحظہ

بورڈ نے فائنانس کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ 18 جون 2012 کی روداد کو منظوری دی اور اس میں لیے گئے فیصلوں کی تصدیق کی۔

آئیٹم نمبر XXXV.4 فائنانس کمیٹی کی XXXI ویں میٹنگ منعقدہ 18 جون 2012 کی روداد پر عمل درآمد رپورٹ۔

آئیٹم نمبر XXXV.5 مدارس اور اردو اکادمیوں کے ذریعے چلائے جارہے منتخب مراکز اور اقلیتی طالبات اور معذوروں کے لیے چلائے جارہے منتخب مراکز اور اقلیتی طالبات اور معذوروں کے لیے چلائے جارہے مراکز کے مالی تعاون کے تسلسل پر غور وفکر۔

کونسل کے ڈائرکٹر نے مدارس اور اردو اکادمیوں کے ذریعے چلائے جارہے منتخب مراکز اور اقلیتی طالبات اور معذوروں کے لیے چلائے جارہے مراکز کی مالی امداد کے تسلسل کی اسکیم پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی۔ ایک رکن نے تجویز رکھی کہ سرکار مدارس کو جدید طرز پر لانے کی خواہش مند ہے اور یہ کہ مدارس کو کمپیوٹر کی تعلیم شروع کردینی چاہیے۔ بورڈ نے سفارش کی کہ کونسل کو اپنے مراکز کے لیے مالی امداد کی پالیسی از سر نو تشکیل دینی چاہیے۔ مدارس اور اردو اکادمیوں کے ذریعے چلائے جارہے مراکز کی مالی معاونت پانچ یا دس سال کی قید سے قطع نظر جاری رکھنی چاہیے بشرطیکہ ان اداروں سے درخواست موصول ہوا اور ان کی کارکردگی کی رپورٹ مثبت ہو۔

دور دراز کے علاقوں میں نیٹ ورک اور کمپیوٹر کی سہولیات کی عدم دست یابی کے پیش نظر قرار پایا کہ غیر سرکاری تنظیموں کی طرف سے موصول ہونے والی CABA-MDTP سے متعلق تحریری درخواستیں زیر غور لائی جائیں گی۔

کمیٹی نے مدارس اور اردو اکادمیوں کے ذریعے چلائے جارہے منتخب مراکز اور اقلیتی طالبات اور معذوروں کے لیے چلائے جارہے 29 مراکز کو منظوری دی۔

آئیٹم نمبر XXXV.6 NIELIT کے ساتھ معاہدے کی تجدید پر غور وفکر

مندرجہ ذیل نظر ثانی شدہ شرح پر اساتذہ کی تنخواہ، جس کی بنیاد AICPI پر ہے، کی نکاسی، امتحان کا انعقاد، نظم وضبط اور نگرانی سے متعلق NIELIT کے ساتھ مفاہمت کی عرضداشت کی تجدید کو بورڈ نے منظوری دی۔

		موجودہ			نظر ثانی شدہ
نمبر شمار	مصارف	ماہانہ فی مرکز اخراجات (روپے میں)	سالانہ فی مرکز اخراجات (روپے میں)	ماہانہ فی مرکز اخراجات (روپے میں) AICPI - اپریل 2012 کی بنیاد پر	سالانہ فی مرکز اخراجات (روپے میں)
اخراجات جو NIELIT کو ادا کیے جاتے ہیں۔					
(1)	2 سینئر استاد کی تنخواہ	17500.00	210000.00	19280.00	231360.00
(2)	1 جونیئر استاد کی تنخواہ	7620.00	91440.00	8430.00	101160.00
(3)	علاقائی معاون (25 معاونین)	290000.00	3480000.00		
(4)	کل		3781440.00		332520.00
(5)	مشاورتی اخراجات 20% (موجودہ) 12.50% نظر ثانی شدہ		756288.00		41565.00

(6)	سروس ٹیکس (4+5)12.36%		560863.00		46237.00
(7)	فی مرکز سالانہ ممکنہ مجموعی اخراجات		5098591.00		420322.00
(8)	NIELIT کے ذریعے امتحان کا انعقاد	فی طالب علم 300 روپے		فی طالب علم 330 روپے	
	قومی اردو کونسل کے زیر انتظام اخراجات				
(9)	ہارڈ ویئر اور اشیائے صرف کا Amc -(271 مراکز)	40000 روپے فی مرکز	10840000.00	قومی کونسل بلا براہ راست 15000 ہر ایک مرکز کو دیتا ہے۔	4065000.00
(10)	کمپیوٹر کی فراہمی		10% سروس چارج کے ساتھ NIELIT کا ٹنڈر	قومی کونسل کا ٹنڈر	4065000.00
(11)	امتحان کا انعقاد NIELT کے ذریعہ	فی طالب علم 300 روپے		فی طالب علم 330 روپے	
(12)	تدریسی مواد اور اشتہارات کی اشاعت	قومی کونسل کے ذریعے		قومی کونسل کے ذریعے	

آئیٹم نمبر XXXV.7 9 نئے کمپیوٹر مراکز کے لیے سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کی فراہمی کی منظوری پر غور وفکر۔

9 نئے کمپیوٹر مراکز کے لیے 89.27 لاکھ روپے کے ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کی فراہمی کے ٹنڈر کو بورڈ نے منظوری دی۔ جو شیلے آئی آٹی سولوشنس کی جانب سے آیا تھا۔

آئیٹم نمبر XXXV.8 گرانٹ ان ایڈ، تھوک خریداری، کمپیوٹر اسٹڈی سنٹر، خطاطی، عربی اور اردو کے اداروں سے متعلق کمیٹیوں کی روداد پر غور وفکر اور منظوری۔

کمیٹی نے گرانٹ ان ایڈ، تھوک خریداری، کمپیوٹر اسٹڈی سنٹر، خطاطی، عربی اور اردو کے اداروں سے متعلق کمیٹیوں کی روداد کو منظوری دی۔ مندرجہ ذیل نئے اسٹڈی سنٹرس (جن کی سفارش میٹنگ کی روداد میں کی گئی تھی) بھی منظور کیے گئے۔ ایک دوسرے کے مقابل درج ہے۔

نمبر شمار	اسکیم	منظور شدہ تجاویز کی تعداد	مالی معاونت 2012-2013 (لاکھ میں)	2013-2014 (لاکھ روپے)
(1)	عربی اسٹڈی سنٹر کی میٹنگ منعقدہ 30-05-12 کی روداد	38 (ایک سال) 26 (دو سال)	02.00 02.90 صرف درسی کتابوں پر	19.40 13.30
(2)	اردو اسٹڈی سینٹر کی میٹنگ منعقدہ 31-05-12 کی روداد	56	02.66 (درسی کتب)	28.85
(3)	کیلی گرافی اسٹڈی سنٹر کی میٹنگ منعقدہ 26-09-12 کی روداد	04	03.50 (درسی کتب)	06.40
(4)	کمپیوٹر اسٹڈی سنٹر کی میٹنگ منعقدہ 10-09-12 کی روداد	09	11.25	45.00
(5)	کتابوں کی تھوک خریداری کی میٹنگ منعقدہ 04-07-12	210 کتابیں	25.05	
(6)	سیمینار/مسودات کے لیے امداد کی میٹنگ منعقدہ 28-09-12 (صفحہ 90 تا 113)	سیمینار-76، لکچر-25 اردو مسودہ-69، عربی مسودہ-14		

آئیٹم نمبر XXXV.9 **وزارت کے مراسلہ نمبر 1042/2012-III مورخہ 10-09-12 اور DoPT No. AB-14017/6/2009 مورخہ 30 اپریل 2010 کے مطابق ملازمین بھرتی کرنے کے قوانین پر عمل کرنا۔**

ڈائرکٹر نے کمیٹی کو مطلع کیا کہ پرنسپل پبلیکیشن آفیسر (PPO) کا عہدہ ڈائرکٹر کے بعد ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داری بشمول عربی و فارسی کے تمام علمی منصوبوں کی نگرانی کرنا ہے۔ ماضی میں قومی کونسل کو ڈیپوٹیشن کی بنیاد پر موجودہ اردو پس منظر رکھنے والے میدان سے کسی مناسب امیدوار کی تلاش میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بورڈ نے مندرجہ ذیل قرار دادیں پاس کیں:

(I) PPO کے عہدہ کے لیے مطلوب سند ایم اے (اردو) میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی اور اردو کے ساتھ ساتھ عربی وفارسی کی معلومات رکھنے والے امیدوار کو ترجیح دی جائے گی۔

(II) ہنرمندانہ تعلیم کی اضافی ذمے داریوں کے پیش نظر ڈپٹی ڈائرکٹر سطح کے ایک سینئر آفیسر کی ضرورت ہے۔ کونسل اس عہدے کی منظوری کے لیے وزارت میں درخواست پیش کرے گی۔ ڈائرکٹر نائب چیئرمین کی مشاورت سے اس عہدے کے لیے مطلوبہ صلاحیتوں کا تعین کرے گا۔

(III) کثرت کار کے حامل ملٹی ٹاسکنگ اسٹاف) ملازمین کے سلسلے میں (GIDOPT OM No.AB-1401716/2009-ESTT(RR مورخہ 30-04-2010 کے مطابق یہ طے پایا کہ قومی کونسل کے تمام ڈی گروپ ملازمین جن کی تعیناتی گروپ 'C'PB-1GP-1800 میں ہوتی ہے ان سب کو ملٹی ٹاسکنگ اسٹاف (MIS) کا درجہ دیا جائے گا۔ جس کے لیے ان کی تعلیمی لیاقتوں کو میٹرک یا آئی ٹی آئی سے اوپر اٹھا کر DoPT کی ملازمت سے متعلق نئے ضابطوں کے مطابق کردیا جائے گا۔ بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ کونسل میں تمام اسامیوں کے لیے اردو کو لازمی/اختیاری مضمون کے طور پر شامل کیا جائے اس کے مدنظر تقرری کے ضوابط میں مناسب ترمیم کی جائے۔

آئیٹم نمبر XXXV.10 'عالمی سہارا' اور 'زی سلام' نے 'اردو زبان وثقافت کے تحلیل وتجزیہ' اور 'اردو زبان کی تدریس' کے ساتھ کونسل کی دیگر اہم سرگرمیوں کو پیش کرنے کی تجویز دی ہے۔

بورڈ کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کونسل ETV Urdu کے طرز پر عالمی سہارا اور زی سلام کے تعاون سے ''نیوز اور ویوز ٹیلی ایڈیشن پروگرام شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جس کا مقصد اردو زبان وثقافت کی ترویج، اردو زبان کی تدریس اور دیگر متعلق سرگرمیوں کی تشہیر ہے۔

اس بورڈ نے تنبیہ کرتے ہوئے تجویز کو منظوری دی کہ ETV کے پروگرام کی نقل نہ کی جائے۔ فیصلہ لیا گیا کہ یہ تجویز وزارت کو علیحدہ بھیجی جائے گی۔ بورڈ نے سفارش کی کہ DD اردو سے اس قسم کے پروگرام کے لیے رابطہ کیا جائے۔

آئیٹم نمبر XXXV.11 قومی کونسل کی اسکیموں پر نظر ثانی

بورڈ نے قومی کونسل کی اسکیموں پر نظر ثانی کی منظوری دی۔ فیصلہ لیا گیا کہ اس معاملے میں ایک باضابطہ تجویز وزارت کو پیش کی جائے گی۔

آئیٹم نمبر XXXV.12 قومی کونسل سے براہ راست وابستگی نہ رکھنے والے باصلاحیت افراد کو سہولتیں فراہم کرنا۔

ایسے افراد کے لیے جو کسی یونیورسٹی سے منسلک نہیں ہیں اور ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں انھیں کونسل کی سرگرمیوں کا علم ہونا چاہیے تاکہ ان کے تخلیقی وتنقیدی کام کی حوصلہ افزائی ہو اور اسے شائع کیا جاسکے۔ اسی غرض سے بورڈ نے اس تجویز کو منظور کیا۔

آئیٹم نمبر XXXV.13 گروپ انشورنس پالیسی پر غور وفکر

بورڈ نے اس تجویز سے اختلاف کیا، البتہ یہ فیصلہ لیا گیا کہ قومی کونسل وزارت ترقی انسانی وسائل سے رابطہ کرکے اردو کے تین بڑے اسکالرس کے لیے سالانہ اسکالرشپ کی تجویز پیش کرے گی جس طرز پر صدر جمہوریہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے اسکالروں کو ایوارڈ دیتے ہیں۔

آئیٹم نمبر XXXV.14 پروجیکٹ یا کتاب کی مکرر اشاعت پر رائلٹی کی اسکیم کے لیے مطلوب معیار میں ترمیم۔

الف: بورڈ نے فیصلہ لیا کہ عام حالات میں حالیہ دور کے ادبی کلیات کی تجویز منظور نہیں کی جائے گی۔ قدیم ادب کے کلیات اور نادر کتابیں زیر غور آئیں گی۔

ب: کونسل بورڈ، کمیٹیوں، ذیلی کمیٹیوں اور پینل کے اراکین یا ان کے قریبی رشتہ داروں کو معاوضہ پر مبنی کوئی پروجیکٹ نہیں دے گی۔ کونسل رکنیت کے رہنما اصول معین کرے گی اور آخری شکل دینے کے بعد اسے ویب سائٹ پر شائع کرے گی۔

ج: ایسی کتابوں کی مکرر اشاعت کی رائلٹی جسے کسی دوسرے پبلیشر نے بھی شائع کیا ہو، فروخت کا دس فیصد ہوگی یا یک مشت 10,000 روپے جو بھی مصنف کے ساتھ طے پایا جائے۔

آئیٹم نمبر XXXV.15 قانونی کمیٹیوں، DPC، MDA اور سلیکشن کمیٹی کے لیے اعزازیہ میں اضافے پر غور وفکر۔

بورڈ نے قومی کونسل MoA، DPC اور سلیکشن کمیٹی کے لیے نذرانہ کے مندرجہ ذیل پیمانے مقرر کیے ہیں۔

		معیار	
ممبر	اعزازیہ	ہوٹل	ملاحظات
مقامی	2000 روپے	–	DA 50% زیادہ ہوتو 25% اعزازیہ زیادہ کردیا جائے گا۔
بیرونی	2000 روپے	3000	

آئیٹم نمبر XXXV.16 دیگر آئیٹم بہ اجازت چیئرمین

(الف) DD، AIR پرائیویٹ ایجنسیوں اور افراد سے تقاریر، مباحثے اور مشاعروں کی ریکارڈنگ کے لیے رابطہ کیا جائے گا۔

(ب) قومی کونسل کے اسٹاف کی ڈائرکٹری کی اشاعت کی جائے

(ج) اشاعتوں کو بہتر بنانے کے لیے تراجم کو فروغ دیا جائے۔

(د) NCPUL آفس میں بایومیٹرک مشین رکھنے کے امکانات پر غور کیا جائے گا۔

چیئرمین کے شکریہ کے ساتھ میٹنگ اختتام پذیر ہوئی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

پروفیسر وسیم بریلوی
وائس چیئرمین قومی کونسل
برائے فروغ اردو زبان

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

دھلی یونیورسٹی

ادبی تقریب

نئی دھلی: تنقید کو تخلیق سے زیادہ مشکل بنا کر پیش کرنا ادبی ناانصافی ہے کیونکہ اس سے تخلیق کی افہام و تفہیم متاثر ہوتی ہے، نیز طالب علم تنقید کی نظری بحثوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر علی احمد فاطمی نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بزم ادب کے زیر اہتمام منعقد تقریب میں بطور مہمان خصوصی اپنا خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا کہنا یہ نہیں کہ ساختیات یا پس ساختیات، تاثراتی، رومانی اور متنی تنقید نہ ہو لیکن کسی تنقید کو اس کے عہد

سے الگ کرنا مناسب نہیں ہے اور اپنے نظریات کو پیش کرنے کے لیے کسی نظریہ کا رد کیا جانا بھی درست نہیں ہے۔ پروفیسر فاطمی نے تحقیق و تنقید اور تخلیق پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، مولانا محمد حسین آزاد، محمد ہادی رسوا، پریم چند اور قرۃ العین حیدر جیسے ناول نگاروں کا ذکر کیا اور ان کے تعلق سے ہونے والی عملی تنقید کا جائزہ لیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2012

جواھرہ لعل نھرو یونیورسٹی

ماس میڈیا پر خصوصی لیکچر

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں ٹیلی ویژن پروڈکشن کے موضوع پر ایک خصوصی لکچر کا انعقاد کیا گیا۔ دوردرشن کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل اشوک جیل خانی نے ٹیلی ویژن پروڈکشن کے موضوع پر معلومات سے بھرپور لکچر دیا۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر محمد شاہد حسین نے سب سے پہلے مہمانوں کا استقبال کیا اور خصوصی طور پر اشوک جیل خانی کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ لیکن پھر بھی انھوں نے جے این یو کے طلبہ کے لیے وقت نکالا۔ اشوک جیل خانی اور مہاراج شاہ کی مشترکہ کتاب 'ٹیلی ویژن پروڈکشن: تکنیک اور ترسیل' کا اجرا ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئرپرسن پروفیسر رام بخش جاٹ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروفیسر رام بخش جاٹ نے تفصیل سے ٹیلی ویژن کے مختلف پروگرام کے بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ماس میڈیا پروڈکشن دراصل ٹیم ورک ہے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے جے این یو میں ماس میڈیا کی تعلیم کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے اس موقعہ پر اپنے استاد پروفیسر محمد حسن صاحب مرحوم کو یاد کیا جنھوں نے جے این یو میں ماس میڈیا کا کورس شروع کیا۔ انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اردو ماس میڈیا کے حوالے سے کتابوں کی کمی ہے اور اشوک جیل خانی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کی سمت میں ایک اہم قدم ہے۔

پریس ریلیز، شفیع ایوب، جے این یو، 13 نومبر 2012

ذاکر حسین دھلی کالج

فارسی ماخذ میں عہد مغلیہ کی دہلی کا تہذیبی اور ثقافتی پس منظر

نئی دھلی: شعبہ فارسی، ذاکر حسین دہلی کالج میں سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار بہ عنوان 'فارسی ماخذ میں عہدِ مغلیہ کی دہلی کا تہذیبی اور ثقافتی پس منظر' کا اہتمام کیا گیا۔ اختتامی جلسے کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی۔ جلسہ کے آغاز میں شعبۂ فارسی، ذاکر حسین دہلی کالج کے صدر ڈاکٹر جمیل الرحمٰن نے اپنی افتتاحی تقریر میں سیمینار میں پڑھے جانے والے تقریباً 35 مقالات پر روشنی ڈالتے ہوئے سیمینار کی اہمیت و افادیت پر گفتگو کی۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے اپنے خطبہ میں عہدِ مغلیہ میں دہلی کی سماجی اور فرہنگی (کلچرل) زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف گوشوں پر سیمینار کے برگزار کنندگان کو ایک کامیاب سیمینار منعقد کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے فارسی زبان کے معیار کو مزید بہتر بنانے سے متعلق اسکولوں میں اس زبان پر زیادہ توجہ دینے کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر یونس جعفری نے اس سیمینار کو ایک معیاری سیمینار قرار دیا۔ پٹنہ کے پروفیسر شرفِ عالم، لکھنؤ یونیورسٹی سے

پروفیسر عبدالقادر جعفری، شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر علیم اشرف خان، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی اور لکھنؤ ڈاکٹر صالحہ رشید نے سیمینار سے متعلق اظہارِ خیال کیا۔ جلسے کی نظامت سیمینار کے ڈائریکٹر ڈاکٹر جمشید خان نے کی اور ڈاکٹر ملک سلیم جاوید نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس اختتامیہ جلسہ میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ڈاکٹر اختر حسین، ڈاکٹر اخلاق آہن، ڈاکٹر اشتیاق احمد، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر محسن، خانم عفت نقابی، دہلی یونیورسٹی سے پروفیسر ریحانہ خاتون، ڈاکٹر راجندر کمار اور ڈاکٹر علاء الدین شاہ وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 11 نومبر 2012

علی گڑہ مسلم یونیورسٹی

سرسید احمد خاں کا یومِ پیدائش

علی گڑھ: ماہنامہ داعلی گڑھ موومینٹ، ملت بیداری مہم کمیٹی اور جامعہ اردو علی گڑھ

کے زیراہتمام اعظیم مصلح قوم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے 195ویں یوم پیدائش کے تعلق سے منعقدہ ہفت روزہ تقریبات کے تحت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی لاونج میں 'سرسید کا سائنسی مسلم معاشرہ کا خواب' موضوع پر منعقدہ قومی سمینار سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر ایم ایم انصاری نے کہا کہ سرسید کی شناخت صرف یہ نہیں کہ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسا عظیم ادارہ قائم کیا بلکہ سرسید وہ پہلے ہندوستانی تھے جس نے قوم میں سائنسی مزاج پیدا کیا۔ اے ایم یو کورٹ کے رکن نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے کہا کہ یہ مسلم قوم کی خوش نصیبی ہے کہ اسے سرسید جیسا رہنما ملا۔ اے ایم یو کے ڈاکٹر محمد شاہد نے کہا کہ وہ ہر اس تحریک کے ساتھ ہیں جو سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے شروع کی گئی ہو۔ پروفیسر ہمایوں مراد نے کہا کہ سرسید جیسا مصلح قوم صدیوں میں ایک پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ داعلی گڑھ موومینٹ ہر سال سرسید شناسی کو عام کرنے کی غرض سے کل ہند سطح کا سرسید مضمون نویسی مقابلہ منعقد کرتی ہے جس میں بڑی تعداد میں اسکول کالج اور یونیورسٹی سطح کے طلبا و طالبات حصہ لیتے ہیں۔ جسیم محمد نے کہا کہ سرسید جدید ہندوستان کے معمار تھے اور یہ بدنصیبی کی بات ہے کہ حکومت نے آج تک سرسید کو بھارت رتن ایوارڈ سے سرفراز نہیں کیا۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ سرسید شناسی کو عام کرنا ہی سرسید کو سب سے بڑا خراج عقیدت ہے اور وہ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں جو سرسید کی فکر کو عام کرنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ اس موقعے پر ماہنامہ داعلی گڑھ موومینٹ کے مدیر اعلیٰ جسیم محمد کی کتاب 'سرسید احمد خاں اینڈ علی گڑھ موومنٹ' کا اجرا پروفیسر ایم ایم انصاری اور نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے کیا۔ پروگرام سے کل ہند سرسید مضمون نویسی مقابلے کے سینئر زمرے سے پہلا انعام حاصل کرنے والی صدف انجم اور جونیئر زمرے سے اوّل انعام حاصل کرنے والی نقیبہ نسو کی نے بھی خطاب کیا۔ اس کے علاوہ دولت رام، سینئر صحافی مسٹر این جمال انصاری، ویمنس کالج اسٹوڈینٹس یونین کی سابق نائب صدر فوزیہ ذوالفقار اور سماجی خدمات کے لیے اے ایم یو کورٹ کے رکن ڈاکٹر شاہد قمر قاضی کو 'سرسید مشن ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' 19 اکتوبر 2012

عصر حاضر میں مولانا رومی کی معنویت

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز تحقیقات فارسی کے زیراہتمام اور آئی سی سی آر، نئی دہلی کے تعاون سے 'معنویت مولانا در عصر حاضر' عنوان کے تحت ایک دو روزہ بین الاقوامی سمینار انعقاد کیا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جلسے کی صدارت کی۔ افتتاح ہندوستان میں ایران کے سفیر سید مہدی نبی زادہ نے کیا۔ تاجکستان کے سفیر جناب سعید بیگ سعیدوف، المصطفیٰ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب غلام رضا مہدوی مہمان اعزازی کی حیثیت سے اور ایران کلچر ہاؤس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر علی دہگاہی مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس جلسے میں شریک ہوئے۔ جناب موسیٰ رضا، آئی اے ایس، چیئرمین، سدرن انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ چنئی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ افغانستان کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر بشیر شبیر نے بھی افتتاحیہ جلسے میں شرکت کی۔ مرکز تحقیقات فارسی کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رومی کی فکر اور ان کے فلسفۂ انسان دوستی کی آج دنیا کو شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں واقع ایرانی سفارت خانہ کے سفیر کبیر سید مہدی نبی زادہ نے مولانا کی حیات اور خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا روم نہ صرف ایران میں بلکہ تمام دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ تاجکستان کے سفیر جناب سعید بیگ سعیدوف نے کہا کہ مولانا روم کی تعلیمات اور دنیائے انسانی کے لیے ان کا پیغام یہ ہے کہ خدا اور اس کی مخلوق سے محبت کی جائے اور انسانیت، اخوت اور بھائی چارہ کو اپنا شعار بنائیں۔ اپنے کلیدی خطبے میں جناب موسیٰ رضا آئی اے ایس نے مولانا روم کو انسانیت کی تاریخ کا سب سے بڑا صوفی شاعر بتایا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ رومی انسان کو مذہبی مسلکی اور اس نوع کی تمام شناخت سے بالاتر ایک امت واحدہ کی شناخت حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جنرل ضمیرالدین شاہ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مولانا روم فارسی زبان کے ایک عظیم صوفی شاعر، فلسفی اور مفکر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے بنی نوع انسان کو اخوت و محبت، بھائی چارہ اور انسانیت کی تعلیم دی ہے۔ ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر علی دھگاہی، المصطفیٰ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب غلام رضا مہدوی اور ڈاکٹر بشیر شبیر، کلچرل کونسل افغانستان نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید محمد اسد علی خورشید نے انجام دیے۔ اس دو روزہ بین الاقوامی سمینار میں مرکز تحقیقات فارسی سے اس سال شائع شدہ تین کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ سمینار میں کل چھ جلسے منعقد ہوئے جس میں ایران، تاجکستان کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیز کے دانشور و فضلا مثلاً گریز صفر، تاجکستان، پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی ڈائرکٹر رضا لائبریری رامپور، پروفیسر عبدالقادر جعفری الہ آباد یونیورسٹی، پروفیسر چندشیکھر دہلی یونیورسٹی، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی دہلی یونیورسٹی، پروفیسر شمیم اختر بنارس ہندو یونیورسٹی، پروفیسر عمر کمال الدین لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر منصور عالم، ایران سوسائٹی کولکاتہ، پروفیسر عید محمد، بہار یونیورسٹی مظفرپور، ڈاکٹر عابد حسین پٹنہ یونیورسٹی، ڈاکٹر غلام سرور آزاد کالج کولکاتہ، ڈاکٹر کلیم اصغر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، وغیرہ نے اپنے گرانقدر مقالات پیش کیے۔

پریس ریلیز، پروفیسر آزرمی دخت صفوی، علی گڑھ، 20 ستمبر 2012

جامعہ ملیہ اسلامیہ

اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب وثقافت

نئی دھلی: اردو زبان، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی علامت ہے۔ اس زبان کی شاعری میں غیرمعمولی طور پر اخذ وقبول کی صلاحیت پنہاں ہے۔ اردو زبان کے آغاز سے اب تک اس شاعری کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اردو زبان کا ہندوستان کے بغیر اور ہندوستان کا وجود اردو زبان وتہذیب کے بغیر نامکمل ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سہ روزہ قومی سمینار میں

ادیبوں اور دانشوروں نے کیا۔ اس سمینار کا اہتمام وزارت ثقافت، حکومت ہند کے مالی تعاون سے کیا گیا۔ سمینار کا آغاز 9 نومبر کو جناب جواہر سرکار، آئی اے ایس (سی ای او

پرسار بھارتی) نے کیا۔جس کی صدارت جناب نجیب جنگ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔اس موقع پر پروفیسر عتیق اللہ نے اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے کلیدی خطبہ پیش کیا اور شعبے کے صدر پروفیسر خالد محمود نے شعبے کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس اجلاس کی نظامت، سمینار کے کنویز پروفیسر شہپر رسول نے کی جب کہ سبھی مہمانوں کا شکریہ پروفیسر شہزاد انجم نے شعبے کی جانب سے ادا کیا۔ اس موقعے پر 9 نومبر کی شام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام پروفیسر مظفر حنفی کی صدارت اور جناب معین شاداب کی نظامت میں کیا گیا۔ سمینار کے پہلے اجلاس کا آغاز 10 نومبر کی صبح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دیار میر تقی میر کے ٹیگور ہال میں ہوا۔جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر شمیم حنفی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر شہزاد انجم نے ادا کیے۔اس سیشن میں پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین، پروفیسر ابن کنول، جناب اقبال مسعود، پروفیسر آفاق احمد اور ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے مقالات پیش کیے۔سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر آفاق احمد اور جناب انجم عثمانی نے اور نظامت شعبے کے استاد ڈاکٹر ندیم احمد نے فرمائی۔ اس سیشن میں جناب شمیم طارق، پروفیسر نعمان خاں، ڈاکٹر مظہر احمد اور ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنے مقالات پیش کیے۔ 10 نومبر کی شام سات بجے انصاری آڈیٹوریم میں محفلِ چہار بیت کا انعقاد کیا گیا۔جس میں ٹونک کی ٹیم ستارۂ ہند کالی پلٹن اور بچھراؤں، اتر پردیش کی ٹیم بزم احباب نے شرکت کی۔سمینار کے تیسرے سیشن کا آغاز 11 نومبر کی صبح 10 بجے پروفیسر محمد ذاکر اور پروفیسر صغریٰ مہدی کی صدارت اور ڈاکٹر خالد مبشر کی نظامت میں ہوا۔ اس سیشن میں پروفیسر مختار شمیم، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سرور الہدیٰ اور ڈاکٹر رحمٰن مصور نے اپنے مقالات پیش کیے۔ لنچ کے بعد چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس الرحمٰن اور پروفیسر شہناز انجم نے اور نظامت ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے فرمائی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر احمد محفوظ اور ڈاکٹر مولا بخش نے اپنے مقالات پیش کیے۔سمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے کی اور پروفیسر اختر الواسع بطور مہمان خصوصی تشریف لائے اور اپنے وقیع خیالات کا اظہار کیا۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے کی۔

پریس ریلیز، شہزاد انجم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 11 نومبر 2012

گوپی چند نارنگ پروفیسر ایمریٹس مقرر

نئی دھلی: اردو حلقوں میں یہ خبر انتہائی مسرّت سے سنی جائے گی کہ اردو کے ممتاز محقق، نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنا پروفیسر ایمریٹس مقرر کیا ہے۔ ان کا یہ عہدہ تا حیات ہوگا۔ جامعہ فقط اُن اساتذہ کو اس اعزاز سے متصف کرتی ہے جنھوں نے دانش گاہ جامعہ کی بیش بہا تعلیمی خدمات انجام دی ہو۔ پروفیسر نارنگ اکتوبر 1974 میں جامعہ میں بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو

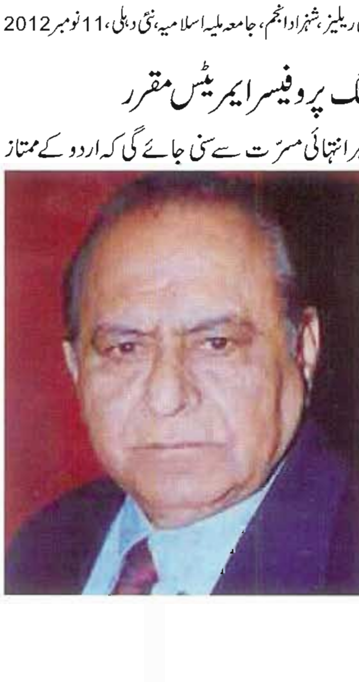

تشریف لائے تھے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنی دل سوزی، لگن اور محنت سے نہ صرف شعبے کی ادبی و تعلیمی سرگرمیوں کو تیز کر دیا اور ایسے یادگار سیمینار منعقد کرائے جنھوں نے شعبے کی شہرت کو پورے برصغیر میں بام عروج پر پہنچا دیا۔ جامعہ میں پروفیسر ایمریٹس مقرر کیے جانے کی خبر ملنے پر انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا زمانہ میری ذات اور وجود کا حصہ ہے۔ جامعہ میں پروفیسر ایمریٹس ہونا میرے لیے باعث عزت ہے۔

پریس ریلیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ٹیگور پروجیکٹ کو منظوری

نئی دھلی: وزارت ثقافت حکومت ہند کی جانب سے شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اطلاع دی گئی ہے کہ شعبہ کی جانب سے مجوزہ رابندر ناتھ ٹیگور کی تخلیقات وتصنیفات کے ترجمے اور تحقیق کا پروجیکٹ منظور ہوگیا ہے۔ اس دوسالہ پروجیکٹ کے تحت شعبہ کے اساتذہ اور ہندوستان کے مشاہیر کی مدد سے نوبل انعام یافتہ ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کی اہم تخلیقات اور تحریروں کا ترجمہ کیا جائے گا۔اس ضمن میں شعبہ کی جانب سے قومی سیمینار ،ورک شاپ، مشاعرے، ڈرامے، تحریری وتقریری مقابلے اور دیگر تہذیبی وثقافتی پروگرام کا انعقاد بھی کیا جائے گا۔ واضح ہو کہ اس دوسالہ پروجیکٹ کے لیے وزارت ثقافت حکومت ہند نے 96 لاکھ روپے منظور کیے ہیں۔

پریس ریلیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مولانا آزاد یونیورسٹی، حیدر آباد

خواتین کی تحریریں، خواتین سے متعلق تحریریں

حیدر آباد: اُردو کو مقبول عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُردو کے دامن کو وسیع کیا جائے۔ دیگر زبانوں سے اُردو میں اور اردو سے دیگر زبانوں میں تراجم کو فروغ دیا جائے۔ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد میاں وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کیا۔وہ آج مرکز برائے ادب اردو زبان، ادب اور ثقافت مانو کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار بعنوان 'خواتین کی تحریریں، خواتین سے متعلق تحریریں' کی اختتامی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔قبل ازیں سیمینار کی اختتامی تقریب کی مہمان خصوصی اودیش رانی باوا، شعبۂ اردو (این سی ای آر ٹی) نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے ہر خراب چیز کو بروقت روکنا چاہیے خالص دکنی لب ولہجہ میں تقریر کرتے ہوئے محترمہ اودیش رانی نے کہا کہ اشتہارات میں عورتوں کی پیش کش، مقابلہ حسن کے نام پر عورتوں کی نمائش عورتوں پر ظلم ہی کے زمرے میں آتا ہے۔انھوں نے تجویز پیش کی کہ اردو زبان وادب کے دامن کو وسیع کرنے کے لیے تراجم کا کام بڑے پیمانے پر ہونا چاہیے اور ایم اے اردو کے نصاب میں اس طرح کے تراجم کو شامل کیا جانا چاہیے۔ سیمینار کے آرگنائزنگ سیکریٹری پروفیسر خالد سعید نے دوروزہ سیمینار کی روداد پیش کی۔ سیمینار کے دوسرے دن چوتھا سیشن بعنوان 'اردو فکشن اور تانیثیت' 17 اکتوبر کو صبح 10 بجے سنٹرل لائبریری آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ ترنم ریاض اور ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے صدارت کی۔ ڈاکٹر رضوانہ معین، ڈاکٹر مسرت جہاں، طاہرہ نورانی نے مقالے پیش کیے۔ پانچواں اجلاس 11:30 بجے شروع ہوا۔ ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر مسرت فردوس نے صدارت کی۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون، ظفر عبداللہ وانی اور رقیہ نبی نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے پہلے دن پہلے تکنیکی سیشن، بموضوع 'اردو ادب اور تانیثیت' کی صدارت پروفیسر آمنہ کشور اور پروفیسر شہناز نبی نے کی۔ محترمہ ترنم ریاض،

ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر عزیز احمد عرسی، ڈاکٹر نکہت جہاں نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر بی بی رضا خاتون، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو نے نظامت کی۔ دوپہر میں 2:30 بجے سے دوسرے تکنیکی سیشن 'لوک ادب/ دکنی ادب میں تصورِ عورت' کی صدارت ڈاکٹر فاطمہ پروین نے کی۔ ڈاکٹر حامد اشرف، ثمینہ بیگم، ڈاکٹر آمنہ تحسین، اور بدر سلطانہ نے مقالے پیش کیے۔ تیسرا اجلاس 4 بجے شروع ہوا جس کا موضوع 'اردو شاعری اور تانیثیت' تھا۔ پروفیسر اشرف رفیع نے صدارت کی۔ ڈاکٹر حلیمہ فردوس، ڈاکٹر گلفشاں حبیب، ڈاکٹر کے تیجسونی، ایم للیتا سری دیوی، ڈاکٹر نور فاطمہ نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 18 اکتوبر 2012

مسلم انسٹی ٹیوٹ اسٹڈی سینٹر میں سالانہ جلسہ اور ادبی مجلّہ 'پرواز' کی رونمائی

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' دی مسلم انسٹی ٹیوٹ اسٹڈی سینٹر' کولکاتا میں 22 اکتوبر 2012 کو طلبا کی ادبی تنظیم 'بزمِ ادب' کے زیرِ اہتمام سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں 'بزمِ ادب' کے ترجمان سالانہ مجلّے 'پرواز' کے گیارہویں شمارے کی رونمائی بھی ہوئی۔ 'بزمِ ادب' کے جنرل سکریٹری محمد نصیر نے بزم کی گزشتہ برس کی تحریکات کی مختصر روداد پیش کی۔ اسٹڈی سینٹر کے اسسٹنٹ کوآرڈی نیٹر اکبر مرزا نے افتتاحی تقریب میں یونیورسٹی اور اسٹڈی سینٹر کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کی گزشتہ برسوں کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، نائب جنرل سکریٹری، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتا ایک باوقار ادارہ ہے، جو گزشتہ 100 برس سے زائد عرصے سے شہر بھر کے ملّی حلقے کا علمی، ادبی،

تہذیبی و ثقافتی مرکز بنا ہوا ہے۔ جناب خواجہ احمد حسین نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کلکتہ کے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں قائم اردو یونیورسٹی کا اسٹڈی سینٹر بڑی شان و شوکت سے چل رہا ہے اور خصوصاً تعلیمی سلسلہ منقطع کیے ہوئے افراد کی رہنمائی کر رہا ہے۔

پریس ریلیز، انیس نعیم MANUU، حیدرآباد، 25 اکتوبر 2012

مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس میں خطبہ

لکھنؤ: اردو زبان کا تہذیبی ورثہ اور بنیادی اقدار کی بازیافت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہماری زبان، تہذیب اور اس کے بنیادی لوازم ہی ہماری شناخت ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ ہم اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار عربی زبان و ادب کے اسکالر اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے استاد پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے مولانا آزاد

نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس کے زیرِ اہتمام ایک خصوصی لیکچر کے دوران کیا۔ انھوں نے زبان کو تہذیبی اور ثقافتی ورثہ قرار دیا اور کہا کہ اپنی ہی زبان اور تہذیب سے دوری کسی بڑے سانحے سے کم نہیں۔ پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے کہا کہ اردو کے خمیر میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ و محاورات بہت زیادہ دخیل ہیں۔ ابتدا میں کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے پروفیسر اسلم اصلاحی کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر ثمامہ فیصل نے نظامت اور تعارف کا فریضہ انجام دیا۔

پریس نوٹ، عمیر منظر MANUU، لکھنؤ کیمپس، 18 اکتوبر 2012

ممبئی یونیورسٹی

اردو کیمپس

ممبئی: سر سید احمد خاں کے 195 یوم پیدائش کے موقعے پر ممبئی یونیورسٹی کے الکیش دنیش مودی انسٹی ٹیوٹ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طلبا کی ایسوسی ایشن (ممبئی) کی جانب سے سر سید ڈے کا اہتمام نہایت تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا۔ ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی نے پروگرام کا تعارفی نوٹ پیش کرتے ہوئے سر سید کی شخصیت اور مختلف شعبوں میں ان کی خدمات پر اختصار سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس دور میں سر سید کی تعلیمات کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور یہ پروگرام اس ضرورت کی تکمیل کا ایک اہم جزو ہے۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل معروف صحافی کلدیپ نیر نے کہا کہ سر سید کی مکمل زندگی حرکت و عمل سے تعبیر ہے۔ کلدیپ نیر نے ملک کی آزادی اور تقسیم وطن کے دوران ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت مہاتما گاندھی نے بھی سر سید کا قول دہرایا تھا کہ ''ہندو اور مسلمان ہماری دو آنکھیں ہیں'' اور اس ملک کی سالمیت اسی وقت ممکن ہے جب یہ دونوں آنکھیں صحیح و سلامت رہیں۔ پروگرام کے صدر رٹائرڈ بریگیڈیر ایم عزیز صدیقی نے خطبہ صدارت میں کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف ایک تعلیمی ادارے کا نام نہیں ہے بلکہ جو مخصوص طرزِ حیات، تہذیب اور اقدار اس درس گاہ سے وابستہ ہیں وہ اس کی انفرادی شناخت ہیں۔ مہمان اعزازی تیستا سیتلواڈ نے کہا کہ یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں فرقہ وارانہ فسادات نے اس ملک کی عظمت اور وقار کو مجروح کر دیا ہے اور ایسے دور میں ضرورت ہے کہ ہم سر سید جیسی انقلابی سوچ اپنے اندر پیدا کریں تاکہ ملک میں اتحاد و یکجہتی کی راہ ہموار ہو اور ہم زندگی کے دشوار مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔ ایم ایل اے امین پٹیل نے بھی شرکا کو خطاب کیا اور کہا کہ وہ مہاراشٹر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شاخ کھولنے کے لیے ریاستی سرکار کو آمادہ کریں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2012

عالمی اردو نامہ

امریکہ

نارتھ امریکہ میں یادگار عالمی مشاعرہ

نیویارک : فیڈریشن آف علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن ہر سال بڑی آن بان کے ساتھ پورے نارتھ امریکہ میں مشاعروں کا انعقاد کر کے ایک نئی تاریخ رقم کرتی رہی ہے۔ واضح ہو کہ یہ مشاعرے فیڈریشن کے چیئرمین اور مشاعرہ کمیٹی کے چیف کوآرڈی نیٹر پرویز جعفری کی قیادت میں بڑے مقاصد کو لے کر کیے جاتے ہیں، جن کے ذریعے زبان وادب کی خدمت کے ساتھ ہی اس سے ہونے والی آمدنی سے ہندوستان کے ضرورت مند ہونہار طلبہ کو مالی امداد بھی فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی عالمی شہرت یافتہ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلبہ کی ہر طرح سے رہنمائی کے ساتھ ساتھ تعلیمی اخراجات کے سلسلے میں معاونت کی جاتی ہے۔ اس سال کے مشاعروں میں ہندوستان سے عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کے علاوہ سنیل کمار تنگ، حسن کاظمی اور مدن موہن دانش، جب کہ پاکستان سے مشہور شاعر افتخار عارف اور شاہدہ حسن، کینیڈا سے نزہت صدیقی اور ذکیہ غزل اور نارتھ امریکہ سے ڈاکٹر منیب الرحمٰن، ڈاکٹر صبیحہ صبا، حمیرا رحمٰن، عارف امام اور عشرت آفرین نے شرکت کی۔ اس سلسلے کا پہلا مشاعرہ شکاگو میں 7 ستمبر کو منعقد ہوا، جس کی صدارت ڈاکٹر عابداللہ غازی اور نظامت امین حیدر نے کی۔ دوسرا مشاعرہ 8 ستمبر کو ڈیٹرائٹ میں ہوا جس کی صدارت مشہور نظم نگار اور بزرگ شاعر ڈاکٹر منیب الرحمٰن نے کی اور نظامت کے فرائض فیڈریشن کے چیئرمین اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک پرویز جعفری نے انجام دیے۔ 14 ستمبر کو نیوجرسی اور 15 ستمبر کو یونیورسٹیوں کے شہر بوسٹن میں جو مشاعرے منعقد ہوئے ان کی صدارت پروفیسر

شاہدہ حسن

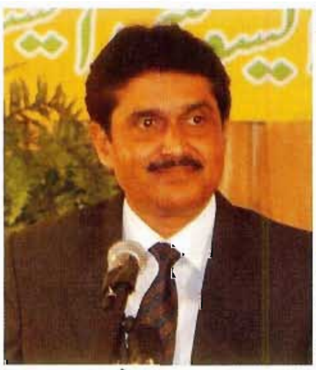
مدن موہن مونس

سنیل کمار تنگ

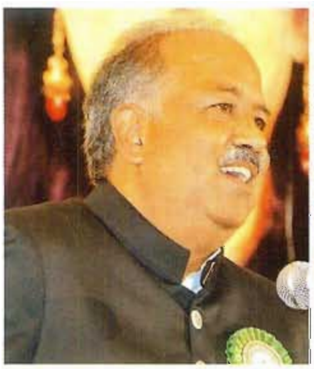
پرویز جعفری

امریکہ میں اردو اور ہندی والوں کو قریب لانے کی کوشش

چنامایا مندر کمپلیکس بوسٹن میں مشاعرے کے دوران فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے روح پرور مناظر

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی بطور شاعر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے متعدد دورے کر چکے ہیں لیکن اس مرتبہ انھوں نے فیڈریشن آف علی گڑھ المنائی ایوسی ایشن کی دعوت پر شمالی امریکہ کے مختلف شہروں کا ایک ماہ سے زائد عرصہ کا جو دورہ کیا اس کی خاص بات یہ رہی کہ ان کی ایما پر اردو اور ہندی والوں کے درمیان قربت کے راستے ہموار ہوئے ہیں۔ اس دورے سے واپسی پر انھوں نے بتایا کہ اس دفعہ میں نے مشاعروں کی اپنی بیشتر

صدارتی تقاریر میں اس بات پر زور دیا کہ اردو والوں کو ہندی اور دیگر علاقائی ہندوستانی زبانوں سے خود کو جوڑنا چاہیے تاکہ اردو کی توسیع کے نئے دروازے کھل سکیں۔ پروفیسر وسیم بریلوی نے بتایا کہ ان کے اس خیال سے پاکستان نژاد اردو والوں نے بھی اتفاق کیا اور اس سلسلے میں پہل کرتے ہوئے بوسٹن کے چنامایا مندر کمپلیکس میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر خیرسگالی کے جذبے کا اظہار کرتے ہوئے منتظمین مشاعرہ نے اپنی ضیافتوں میں خالص ویجیٹیرین کھانوں کا اہتمام کیا اور مندر کے منتظمین نے شرکا میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کا خیال رکھتے ہوئے مندر کمپلیکس میں ہی انھیں نماز پڑھنے کی سہولت دی۔ پروفیسر بریلوی نے کہا کہ ایسا امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے جب کسی مندر کمپلیکس میں مسلمانوں کے لیے نماز کا اہتمام کرایا گیا۔ انھوں نے امید ظاہر کی مستقبل میں اردو اور ہندی سے تعلق رکھنے والے امریکی باشندے ایک دوسرے کے اور قریب آئیں گے۔ (ادارہ)

وسیم بریلوی نے کی اور نظامت کے فرائض حسن کاظمی نے انجام دیے۔ 21 ستمبر کو لٹل راک اور 22 ستمبر کو ڈیلس میں جب کہ 28 ستمبر کو سین انٹونیو اور 29 ستمبر کو ہیوسٹن میں مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ ہیوسٹن کے مشاعرے کی صدارت پروفیسر وسیم بریلوی نے اور نظامت کے فرائض پرویز جعفری نے انجام دیے۔ اس عالمی مشاعرے کو جشن شاہدہ کا نام دیا گیا تھا۔ اس موقعے پر شاہدہ حسن کو 'علی سردار جعفری ادبی ایوارڈ' سے نوازا گیا جو ان کی خدمت میں ہندوستان کے کونسل جنرل پی ہریش نے پیش کیا۔ اس موقعے پر کونسل جنرل پی ہریش نے اردو زبان اور تہذیب کے ناطے سے نہایت مختصر اور جامع تقریر کر کے سامعین کے دل موہ لیے، ان کے جملوں پر ہال بار بار تالیوں سے گونج اٹھتا تھا۔ واضح ہو کہ یہ ایوارڈ اس سے قبل حمایت علی شاعر، پروفیسر وسیم بریلوی، ندا فاضلی اور سلیم کوثر کو دیا جا چکا ہے۔ اس موقعے پر آسٹن یونیورسٹی کے ہندی اردو فلیگ شپ پروگرام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے تین ہونہار طالب علموں، سیف علی، سونی پاٹھک اور ایلیا احمد نے مجاز ایوارڈ پروفیسر وسیم بریلوی کے ہاتھوں سے وصول کیا۔ ہیوسٹن سمیت کئی بڑے مشاعروں میں دیکھنے میں آیا کہ وسیم بریلوی صاحب کے کلام کے اختتام پر مجمع نے کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجائیں۔ مشاعروں کا یہ سلسلہ آگے چل کر 5 اکتوبر کو فینکس اور 6 اکتوبر کی شام سان فرانسسکو میں منعقد ہوا۔ ڈیلس اور سان فرانسسکو کے مشاعروں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں طلبہ کو اسکالرشپ دینے کے لیے فنڈ ریزنگ بھی کی گئی۔ دونوں جگہ شرکا نے دل کھول کر عطیات دیے۔ 12 اکتوبر کو البنی کے مشاعرے کی صدارت پروفیسر وسیم بریلوی نے کی اور نظامت پروفیسر جعفری نے۔ 13 اکتوبر کو نیویارک میں مشاعرہ ہوا، نیویارک کے مشاعرے میں سرسید ایوارڈ اس بار لندن سے آئے ہوئے دانشور اور تاریخ دان ڈاکٹر فرحان احمد نظامی کو دیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت مشہور شاعر افتخار عارف نے کی اور نظامت نوشہ اسرار نے کی۔ اس طرح 13 اکتوبر کو ان مشاعروں کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔ لگاتار ہوائی سفر کے باوجود ان مشاعروں کے انعقاد میں تقریباً ڈیڑھ ماہ کا عرصہ لگ گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اکتوبر 2012

حسن کاظمی

عشرت آفرین

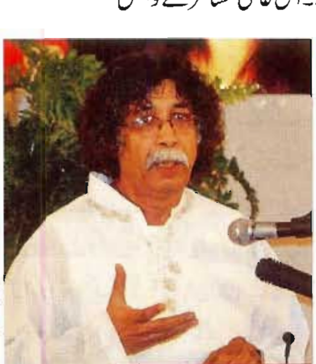
عارف امام

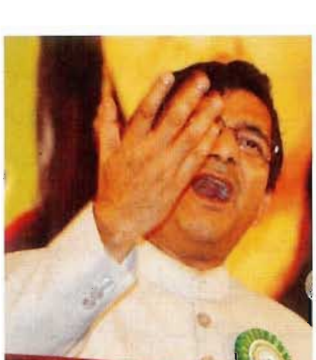
نوشہ اسرار

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

قومی اردو کونسل کا کتاب میلہ

اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش ہوگی: جتن پرساد

وزیر مملکت نے اردو زبان کو بے حد پیاری اور محبت کی زبان قرار دیا،
14 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کا شاندار افتتاح

لکھنؤ: اردو محبت کی زبان ہے، میری خوش قسمتی ہے کہ محکمہ انسانی وسائل سنبھالتے ہی پہلا افتتاح کتاب میلہ کا کر رہا ہوں، وہ بھی تہذیب اور تمدن کے شہر لکھنؤ میں۔ اردو کے فروغ کی ہر ممکن کوشش ہوگی، اس کے لیے بجٹ کو آڑے نہیں آنے دیا جائے گا۔ منگل کو سینٹینل اسکول میں ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جتن پرساد نے کیا۔ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے 14 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کا افتتاح کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی

کوشش ہو رہی ہے اس میں رکاوٹ نہیں آنے دی جائے گی۔ اقلیتوں اور اردو کی ترقی کے لیے بے حد سنجیدگی سے کام لیا جائے گا۔ مجھے کانگریس کی قومی صدر اور قومی جنرل سکریٹری راہل گاندھی نے یہ ذمہ داری سونپی ہے اس امید کے ساتھ کہ اقلیتوں کو اس کا حق ملے اور اردو کے لیے کام ہو۔ اردو کو جدید تکنیک سے جوڑا جائے گا تاکہ مدارس کے بچے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ روزگار سے بھی جڑ سکیں۔ انھوں نے طلسم لکھنؤ اور اردو صحافت پر لکھی کتاب اور اردو سیکھنے کے لیے سی ڈی کا اجرا بھی کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے افسران کو بند کمروں سے باہر نکلنا ہوگا۔ کاغذوں پر ترقی کی بات نہ کریں بلکہ اسے عملی جامہ پہنائیں۔ صرف کتابیں چھاپنے سے کوئی فائدہ نہیں اسے طلبہ تک پہنچانا بھی ہوگا۔ اردو کی ترقی کے لیے گاؤں گاؤں جائیے اور عوام کو جوڑیے۔ اردو بولنے والے لوگ بہت ہیں لیکن لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہوگا۔ انھوں نے آج کے پروگرام کے تعلق سے ڈائریکٹر کو دس میں سے 5 نمبر دیتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میلہ کے لیے بڑی جگہ کا انتظام کیا جانا چاہیے تھا کہ آنے والے لوگوں کو پریشانی نہ ہوتی۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اردو کو مقامی زبانوں کے ساتھ جوڑنا ہمارا مقصد ہے تاکہ یہ اور مضبوط ہو اور رسم الخط کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر انیس انصاری نے کہا کہ اردو کو بڑھانا ہے تو اسے اسکولوں میں جگہ دلانا ہوگی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت کر رہے شاعر ملک زادہ منظور احمد نے امید کا اظہار کی کہ مرکزی وزیر مملکت ایک خاندانی انسان ہیں، ان کے والد کو بھی اردو سے محبت رہی اور وہ ایک لائق اولاد ہونے کا فرض ادا کرتے ہوئے اردو کے فروغ کے لیے سنجیدگی سے کام کریں گے۔

روزنامہ 'انقلاب'، لکھنؤ، 7 نومبر 2012

قومی اردو کونسل کا بجٹ 45 کروڑ کیا جائے گا: جتن پرساد

لکھنؤ: مجھے آج بہت مسرت ہو رہی ہے کہ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی ذمہ داری ملنے کے بعد پہلی تقریب اردو میلہ میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ اس کے ذریعہ سے نہ صرف محکمہ کے کام کی شروعات ہو رہی ہے بلکہ دانشوروں، قلمکاروں سے ملاقات اور ان کو سننے کا موقع مل رہا ہے۔ کونسل کو سیمینار، کانفرنس، سمپوزیم تک محدود نہیں رہنا ہے۔ اس سے باہر نکل کر گاؤں گاؤں پہنچ کر عملی طور سے کام کرنے کی ضرورت ہے، جو محض کاغذوں تک نہ ہو بلکہ زمینی سطح پر نظر آئے۔ اس کا فائدہ عوام کو پہنچے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے وزیر مملکت جتن پرساد نے منگل کو 14 ویں قومی اردو کتاب میلہ کی افتتاحی تقریب میں کیا۔ سنٹینل انٹر کالج قیصر باغ میں منعقدہ 6 روزہ کتاب میلہ 11 نومبر تک جاری رہے گا۔ اس موقعے پر مسٹر پرساد نے کہا کہ حکومت اردو کے پرموشن پر بہت توجہ دے رہی ہے۔ پہلے اس کا بجٹ 28 کروڑ تھا، جو بڑھا کر 45 کروڑ کیا جا رہا ہے۔ اردو کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس زبان میں اپنی بات کہنے، اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا جو سلیقہ اور انداز ہے وہ کہیں نہیں ملتا۔ ہم ہندی بولتے وقت بھی اردو الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، لکھنؤ، 7 نومبر 2012

محبانِ اردو کا ہجوم، مختلف علوم پر ہزاروں کتابیں دستیاب

لکھنؤ: قومی کتاب میلہ میں اب شائقین کتب کی آمد بڑھنے لگی ہے۔ سینٹینل انٹر کالج

میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت لگے 14 ویں قومی کتب میلہ میں ملک کی مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیوں کے علاوہ متعدد بڑے ناشرین کے تقریباً 40 اسٹال لگے ہیں۔ جن میں مذہبی، ادبی، سماجی، نصابی، سائنس، وکمپیوٹر سمیت دیگر علوم پر مبنی ہزاروں کتابیں اردو زبان میں دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی و دیگر زبانوں میں بھی درجنوں کتابیں موجود ہیں۔

اردو کتاب میلہ میں ندوۃ العلما سمیت دیگر مدارس ومختلف تعلیمی اداروں کے طلبا وطالبات بھی کثیر تعداد میں پہنچ رہے ہیں اس کے علاوہ ہر عمر اور طبقہ کے محبان اردو بھی اسٹالوں پر نظر آرہے ہیں۔

اردو کتاب میلہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سرکاری افسران اور غیر مسلم افراد جنھیں کتابوں کا شوق اور ادب سے دلچسپی ہے وہ بھی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے میلہ میں آرہے ہیں۔ بدھ کے روز میلہ آنے والوں میں روز ارم گروپ آف کالج کے بانی و منیجر ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس، معروف سائنسداں ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی، پروفیسر ڈاکٹر شاہ عبدالسلام صدیقی، معروف قلم کار فیاض رفعت، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ اترپردیش کے معاون ڈائریکٹر ڈاکٹر وجاہت حسین رضوی، ایڈیشنل ضلع اطلاعات افسر رفعت نعیم صفوی، پی آئی بی فلم ڈویژن کے افسر مکیش والمیکی وغیرہ خاص طور پر شامل تھے اردو کتاب میلہ میں جس طرح سے خاص وعام کی آمد ہورہی ہے اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نہ تو کتب بینی کا شوق ختم ہوا نہ ہی اردو کتب خریدنے والوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔ بس ضرورت ہے معیاری کتب کی فراہمی کی کتاب میلہ میں کتابوں کے علاوہ کونسل کی جانب سے ادبی، ثقافتی اور موسیقی کے پروگراموں کی ستائش بھی کی جارہی ہے جس میں ادب و ثقافت کی معروف ہستیاں شریک ہورہی ہیں۔ بدھ کے روز شام قوالی میں وجاہت حسین خان بدایونی نے قوالی کی ایسی محفل سجائی کہ سامعین نشستوں پر جمنے رہنے کو مجبور رہے۔ محفل قوالی کی صدارت نواب جعفر میر عبداللہ نے کی اور اطہر نبی ایڈوکیٹ مہمان اعزازی تھے۔

کتاب میلہ میں نیشنل اوپن اسکول کی بیداری مہم

لکھنؤ: قومی کتاب میلہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ کا بھی اسٹال موجود ہے۔ جہاں پر کسی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کرسکے افراد، اسکول چھوڑ دینے والے طلبا زبان سے ناواقف افراد کے لیے ان کی مادری زبان میں ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ کی تعلیم دلانے کے بارے میں تفصیل سے معلومات فراہم کی جارہی ہے۔ اوپن اسکول کے ریجنل سینٹر الہ آباد سے آئے محمد ارقم نے بتایا کہ انسٹی ٹیوٹ کے توسط سے کوئی بھی شخص اپنا رجسٹریشن کراسکتا ہے۔ ہائی اسکول کے لیے کم از کم عمر

14 برس اور انٹرمیڈیٹ کے لیے 15 برس ہونا چاہیے۔ ایک مرتبہ رجسٹریشن کے بعد امیدوار پانچ برس میں کبھی امتحان دے سکتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' لکھنؤ، 8 نومبر 2012

قومی اردو کتاب میلہ

لکھنؤ: کہتے ہیں کہ کتابیں انسان کی بہترین دوست ہوتی ہیں۔ نہ ہو کبھی تکرار کرتی ہیں اور نہ قاری کے رائے سے اختلاف۔ بلکہ ہر موقعے پر قاری کو نکتہ کی بات ضرورت بتاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تنگی وقت کے سبب مطالعہ نہ کرپانے کا شکوہ کرنے والے بھی کتابیں خریدنے اور انھیں دیکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ ایسا ہی نظارہ ان دنوں اترپردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے لگے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) کے 14 ویں قومی کتب میلہ میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ میلہ میں طلبا، اساتذہ، ادیب وشاعر، محبان اردو، نیز مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد میلہ میں آمد درج کرارہے ہیں۔ قیصر باغ واقع سینٹینیل انٹر کالج میں قومی اردو کتاب میلہ کی آب وتاب میں اضافہ ہورہا ہے۔ جمعرات کو مدارس کے طلبا واساتذہ کی خاصی تعداد نظر آئی۔ چونکہ جمعہ کو ان مدارس میں عام تعطیل رہتی ہے اس لیے دوپہر کے بعد سے ان کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو میلہ کے اختتام تک بنا رہا۔ میلہ میں خدا بخش اورینٹل لائبریری

پٹنہ، رضا لائبریری، رامپور، مکتبہ جامعہ دہلی وغیرہ اداروں کے اسٹال پر زبردست بھیڑ رہی۔ میلہ میں صرف اردو کتب کے ناشرین ہیں لیکن ان کے اردو کتابوں کے علاوہ ہندی، انگریزی دیگر زبانوں کی کتب بھی شائقین کو متوجہ کررہی ہیں۔ رضا لائبریری رامپور کے اسٹال پر والمیکی رامائن کے ہندی ترجمہ کو خوب پسند کیا جارہا ہے۔ وہیں کتابوں کے علاوہ کمپیوٹر کے دور میں سی ڈی، ڈی وی ڈی و دیگر کمپیوٹرائزڈ پروگرام کی فروخت بھی خوب ہورہی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' لکھنؤ، 9 نومبر 2012

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

پروفیسر احتشام حسین عبقری شخصیت کے مالک تھے: شمس الرحمٰن فاروقی

الہ آباد: شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے 'پروفیسر احتشام حسین اور ان کا عہد' موضوع کے تحت سہ روزہ سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا، جس کا افتتاح الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے کے سنگھ نے شمع روشن کر کے کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر محمود الحسن، سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے کی۔ جب کہ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے مہمان خصوصی، اور پروفیسر مجاور حسین، پروفیسر قاضی جمال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ صدر شعبہ اردو اس سیمینار کی کنوینر پروفیسر شبنم حمید نے خیر مقدمی اور استقبالیہ کلمات میں سیمینار کے موضوع، مقصد اور اس کی اہمیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ الہ آباد

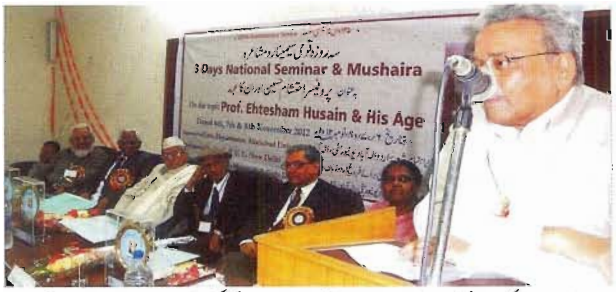

یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے کے سنگھ نے کہا کہ اگر کسی کو 100 سال کے بعد بھی یاد رکھا جائے یہ اس کی شخصیت کی ادبی اہمیت ضمانت ہے۔ احتشام صاحب نہ صرف اردو بلکہ انگریزی اور تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ نقاد، دانشور اور جدید تنقید کے علم بردار 'پدم شری' پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش کیا۔ انھوں نے مدلل انداز میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک احتشام حسین وہ لعل شب چراغ ہیں جس میں گنے چنے لوگوں کا نام لیا جاتا ہے۔ احتشام صاحب ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو کے بہت بڑے عالم تو تھے ہی لیکن وہ جس مدعے پر اپنی بات کہتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس شعبۂ علم کے عالم ہیں۔ احتشام صاحب نے ہمیشہ ترقی پسند تنقید کی لیکن وہ نئی بات اور نئی فکر کا ہمیشہ خیر مقدم کرتے تھے۔ پروفیسر شبنم حمید نے بتایا کہ پروفیسر احتشام حسین کی علمی شخصیت کا اعتراف ہر شخص کرتا ہے۔ ان کے ادب پاروں میں علم کا ایک بحر ذخار موجزن ہے۔ افتتاحی اجلاس کے مہمان اعزازی پروفیسر قاضی جمال حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کہا کہ احتشام حسین کی اہمیت وقتی نہیں بلکہ ان کی قدر و قیمت ہر جگہ ہر وقت میں یکساں رہے گی۔ احتشام صاحب اپنے وقت کے ہر مکتب فکر اور ہر علمی شعبے کے لوگوں سے مستفید ہوتے تھے۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی سابق صدر شعبۂ اردو، حیدر آباد یونیورسٹی، حیدر آباد نے کہا احتشام صاحب بے حد شفیق استاد تھے، جن کے ہونہار شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی پروفیسر سید محمد عقیل رضوی سابق صدر شعبہ اردو نے کہا کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ احتشام صاحب کے بدولت ہوں۔ احتشام صاحب کے علمی نور سے شعبۂ اردو 10 برس تک بقعۂ نور بنا رہا۔ صدر جلسہ پرفیسر محمود الحسن نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ احتشام صاحب ادبی اختلافات کو شخصیت پر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔ صدر جلسہ کی صدارتی تقریر کے بعد سیمینار کی کنوینر پروفیسر شبنم حمید نے رسم تشکر ادا کرتے ہوئے حاضرین محفل کی دل جمعی اور سنجیدگی کو سہ روزہ سیمینار کے لیے نیک فال قرار دیا۔ لنچ کے بعد دو پہر ڈیڑھ بجے سیمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر سید عقیل رضوی اور پروفیسر زماں آزردہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جلسے کی نظامت پروفیسر شبنم حمید نے کی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ پروفیسر مجاور حسین نے 'آخری چراغ' کے عنوان سے پڑھا۔ اس اجلاس کا دوسرا مقالہ پروفیسر فضل امام رضوی نے 'احتشام حسین کی تنقیدی بصیرت' کے عنوان سے پڑھا۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر زیبا محمود نے 'احتشام حسین کا تنقیدی شعور' کے عنوان سے پڑھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 7 نومبر 2012

تصوف اور پنجاب

مالیر کوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کی آرٹ گیلری میں منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت رکن آل انڈیا مسلم پرنسل لا بورڈ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے اور کلیدی خطبہ دہلی اردو اکادمی کے نائب صدر پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ مالیر کوٹلہ کے ایس ڈی ایم راجیش ترپاٹھی مہمان اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس تقریب میں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بھی شرکت کی۔ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر محمد اقبال نے موضوع کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ سرزمین پنجاب نے علوم و فنون تہذیب و تمدن کے ارتقا میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور تصوف کی تاریخ بھی پنجاب کا ذکر کیے بغیر کسی طور مکمل نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں چھٹا دریا تصوف اور روحانیت کا رواں دواں رہا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے کلیدی خطبہ میں پنجاب اور تصوف کے باہمی رشتہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پنجاب کے صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کی عطا سے تصوف کی کائنات مالا مال ہوئی۔ افتتاحی تقریب کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ اکادمی کے رکن ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کے تعلیمی اجلاسوں میں مختلف

دانشوروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تین مختلف تعلیمی نشستوں کی مجلس صدارت میں پروفیسر اختر الواسع، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ سے ڈاکٹر لطیف حسین کاظمی اور گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کے پروفیسر عبدالرشید شامل تھے۔ دوسری مجلس کی صدارت میں پروفیسر ڈاکٹر منظور حسن، پروفیسر دھرم چند واتش، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور تیسرے تعلیمی اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر ڈی ڈی بھٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ڈاکٹر شکیل اختر شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر منظور حسن نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 نومبر 2012

بیدر میں سیمینار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اسٹڈی سنٹر نئور (بی) تعلقہ بھالکی ضلع بیدر میں ماہانہ سیمینار محمد جبار احمد ایڈوکیٹ بیدر کی صدارت میں ہوا۔ مہمانِ خصوصی محمد انیس الرحمٰن صدر مدرس بیدر تھے۔ مقالہ نگار محمد معین الدین ضلع بیدر نے مقالہ پیش کیا۔ جس کا عنوان 'اکیسویں صدی میں پریم چند کی معنویت' تھا۔ بعد میں مقالہ نگار سے سوالات کیے گئے۔ صدر سیمینار نے کہا کہ 'پریم چند' اس شخصیت کا نام ہے، جس نے اردو ادب کو جلا بخشی تھی۔ مہمان خصوصی نے کہا کہ "پریم چند بے مثل افسانہ نگار تھے، پریم چند کی تحریروں اور سطروں میں ایک حقیقت پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔ اس سیمینار میں طلبا و طالبات کثیر تعداد میں موجود تھے۔ سیمینار کی نگرانی اردو ڈپلومہ کے لکچرار فرید احمد بیدر نے کی اور اس سیمینار کا اختتام اظہارِ تشکر محمد چاند نے کیا۔

بذریعہ ڈاک، صدر مدرس، دار العلوم محمدیہ، بیدر، 23 ستمبر 2012

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

قومی اردو کونسل میں تقرری کے لیے اردو جاننا لازمی

نئی دهلی: یہ بات اردو طبقہ کے لیے کسی خوش خبری سے کم نہیں ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں غیر اردو داں افراد کی تقرری پر روک لگادی گئی ہے۔ کونسل کی مجلس عاملہ کی ایک اہم میٹنگ جو انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں ہوئی میٹنگ میں عاملہ کی اراکین نے تقرری ضوابط میں ترمیم کرتے ہوئے اردو زبان کو لازمی کردیا اور یہ طے کردیا کہ کونسل میں تقرری پانے کے لیے امیدوار کو اردو داں ہونے کے سرٹیفکیٹ پیش کرنے ہوں گے۔ کونسل کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے بتایا کہ کونسل اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کرتی ہے۔ اس لیے ہم نے اردو مضمون کو لازمی کردیا۔ میٹنگ میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اردو کو شمال مشرقی ریاستوں میں مقبول بنانے اور زبان کے فروغ کے لیے اردو کی نامور شخصیات اور لیڈران کے تعلق سے سیمینار اور مباحث بھی کیے جائیں اس کے علاوہ مدارس اور کم بجٹ کی وجہ سے مالی مشکلات کا سامنا کرنے والی اردو اکادمیوں کے زیر انتظام چلنے والے کمپیوٹر مراکز کی امداد جاری رکھی جائے کیونکہ موجودہ اسکیم کے تحت دس سال تک ہی کونسل مالی امداد فراہم کراتی تھی جب کہ کونسل کے پروجیکٹوں کے لیے یو جی سی طریقہ کار کو نہ اپناتے ہوئے شارٹ ٹرم پروجیکٹ کو نافذ کرنے کا بھی فیصلہ ہوا۔ اس طریقہ کار کے تحت ایک مرتبہ پچاس ہزار کی امداد جب کہ سفری اخراجات اور کنٹی جینسی کی مد میں دس دس ہزار روپے دیے جائیں گے دو تین ماہ میں پروجیکٹ پورا کیا جائے گا۔ میٹنگ کے بعد اراکین نے امید ظاہر کی کہ ان تمام اقدامات سے نہ صرف کونسل کی کارکردگی بہتر ہوگی بلکہ اردو کے فروغ میں بھی نمایاں کامیابی ملے گی۔ میٹنگ میں شرکت کرنے والوں میں پروفیسر وسیم بریلوی، علیم الدین اسعدی، وقار الدین و دیگر اہم افراد شامل تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 19 اکتوبر 2012

مولانا آزاد کا یومِ پیدائش

کانکے روڈ: مورخہ 11 نومبر 2012 کانکے روڈ واقع غلام علی خاں ریسرچ اینڈ اسٹڈی سنٹر میں مولانا آزاد پر ایک مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر صدیق مجیبی نے کی جبکہ مہمان خصوصی پروفیسر سرفراز احمد خان تھے اور جلسے کی نظامت سہیل سعید نے کی۔ سب سے پہلے جواں سال شاعر و ادیب محمد ہدایت اللہ نے مہمانوں کی گلپوشی کی پھر عمران انصاری نے گلدستہ پیش کیا۔ مختار انصاری نے صدر صدیق مجیبی اور مہمان خصوصی سرفراز احمد خاں کو شال پیش کیا۔ مذاکرہ میں سب سے پہلے عالمگیر ساحل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''مولانا آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم

تھے جنھوں نے UGC کے ساتھ ساہتیہ اکادمی جیسے ادارے کی بھی تشکیل کی۔ گویا تعلیم اور فنون لطیفہ سے متعلق مولانا آزاد نے جو بنیادی کام کیا وہ آج بھی ہمارے سامنے ہے۔'' ڈاکٹر سرور ساجد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کے سیاسی اور سماجی افکار کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اس کی بنیاد مولانا نے ہندو مسلم ایکتا پر رکھی تھی کیونکہ وہ آزادی ملنے میں ہونے والی تاخیر کو تو برداشت کر سکتے تھے لیکن آزادی کے جلد بلکہ فوراً مل جانے کی قیمت ہندو مسلم ایکتا کو گنوا کر حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مہمان خصوصی پروفیسر سرفراز احمد خان نے کہ مولانا آزاد ہندوستان کی سالمیت کے قائل تھے اور انھوں نے آخری دم تک ملک کی تقسیم کی مخالفت کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر صدیق مجیبی نے کہا کہ مولانا آزاد ایک مذہبی رہنما، مفسر قرآن، جادو بیان مقرر اور قومی یکجہتی کے زبردست علم بردار تھے۔ وہ ایک بے مثل صحافی تھے۔ جواں سال ادیبہ سامعہ ناز نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، سرور ساجد، رانچی 11 نومبر 2012

اردو وراثت میلہ

نئی دهلی: حکومت دہلی کے محکمۂ فن وثقافت والسنہ کی جانب سے اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ پانچ روزہ 'اردو وراثت میلہ' تزک واحتشام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ پروگرام کے آغاز میں شام چار بجے ثقافتی پروگرام کے تحت سینٹ اسٹیفن کالج کے طلبا نے غزل اور نظم پیش کی جب کہ اینگلوعربک سینئر سکنڈری اسکول اجمیری گیٹ کے طلبا نے قوالی اور غزل پیش کر کے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ثقافتی پروگرام کے بعد شام پانچ بجے 'شام غزل' پروگرام میں معروف گلوکار فرید احمد خان نے بہادر شاہ ظفر کی غزل پیش کر کے اس پروگرام کا افتتاح کیا اس کے بعد مختلف کلاسیکی شعرا کی غزلیں اپنی مسحور آواز میں پیش کرکے سامعین کو داد دینے پر مجبور کردیا۔ شامِ غزل کے اختتام پر پروفیسر اختر الواسع وائس چیئرمین اردو اکادمی نے گلوکار فرید احمد خاں کا پھولوں کا گلدستہ پیش کر کے شکریہ ادا کیا۔ بعدازاں شام سات بجے تمثیلی مشاعرے کے تحت 'دلی کا آخری مشاعرہ' جو بہادر شاہ ظفر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا کی تمثیل پیش کی گئی۔ اس تمثیلی مشاعرے میں پردۂ سیمیں کے معروف

تمثیلی مشاعرہ 'دلی کا آخری مشاعرہ' کا ایک منظر

اداکار ٹام آلٹر نے بہادر شاہ ظفر کی تمثیل پیش کی جب کہ ڈاکٹر ایم سعید عالم نے ابراہیم ذوق، ہریش چھابڑا نے مرزا اسد اللہ خاں غالب، ایوب حسین خان نے مومن خاں مومن، وجے گپتا نے منشی تشنہ کا کردار پیش کیا، جسے سامعین بے حد پسند کیا۔ اردو وراثت میلہ نہ صرف اکادمی کا ایک پروگرام ہے بلکہ یہ گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کا عکاس بھی ہے۔ مشاعرے، غزل سرائی، قوالی، بیت بازی

کے پروگرام پیش کیے گئے وہیں اسکولی طلبا وطالبات کو لال قلعہ کے سبزہ زار پر انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ 7 نومبر سے منعقد ہونے والا 'اردو وراثت میلہ' 11 نومبر کو اختتام پذیر ہوا۔ پروگرام کے اختتام پر سکریٹری اردو اکادمی اور وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے شرکائے میلہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خاص طور سے وزیر اعلیٰ دہلی محترمہ شیلا دکشت اوران کی کابینہ کا بھی شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، مستحسن احمد (پروگرام آفیسر) اردو اکادمی، دہلی، 11 نومبر 2012

علامہ اقبال کا یوم پیدائش

نئی دہلی: 10 نومبر دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کی جانب سے علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر ایک نیشنل سیمینار کا انعقاد ہوا۔ جس میں اقبال شناسی پر خاص توجہ دلائی گئی۔ اس موقعہ پر پروفیسر توقیر احمد خاں، انجینئر محمد

فاروق، پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر معین الدین جینابڑا اور دانش حسین خان وغیرہ نے اظہار خیال کیا۔ جب کہ دہلی میں دوسرا پروگرام غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین اولیا میں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا (دہلی) اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (دہلی) کے زیر اہتمام پروفیسر عبدالحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر اتفاق رائے سے یہ قرار داد منظور کی گئی کہ علامہ اقبال کو نوبل انعام سے سرفراز کیا جائے اور اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد بڑھائی جائے نیز جلد از جلد اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ عالمی یوم اردو کا سب سے بڑا پروگرام لکھنؤ کے گاندھی بھون میں منعقد ہوا۔ یہاں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا (UMI) اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (UDO) کی مرکزی کمیٹی کی جانب سے نیشنل سیمینار برائے فروغ اردو زبان بعنوان 'اردو میڈیم اسکولوں کا قیام: مسائل مشکلات اور حل' کی صدارت سابق ایڈوکیٹ جنرل حکومت یوپی جناب ایس ایم اے کاظمی نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر ونے کمار پانڈے نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کو پڑھنے کے بعد انسانیت اور اردو کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوا کہ کس طرح یہ زبان متحدہ ہندوستان میں قومی زبان تھی۔ انھوں نے کہا کہ اردو نہ پڑھنے کا نقصان یہ ہوا کہ ہندوستان ایک خوبصورت تمدن سے محروم ہوگیا۔

پریس ریلیز، سید احمد خاں (کنوینر) عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی، دہلی 10 نومبر 2012

پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ

نئی دہلی: ''ہندوستانی مسلمان آزادی کے بعد سے اب تک ہندوستان کے ایک جدید جمہوری اور سیکولر ریاست بننے کے عمل کے دوران امید اور مایوسی کے کئی مرحلوں سے گزرے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں رہنے والے مسلمان ہندوستان کے آئین کی یقین دہانیوں کی روشنی میں قومی تعمیر وترقی میں دیگر تمام ہم وطنوں کی طرح شریک رہے ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شیخ الجامعہ جناب نجیب جنگ نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام سالانہ پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ جناب نجیب نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد کے گزشتہ الفیے کا تاریخی جائزہ پیش کرتے ہوئے ہندوستان اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی، ثقافتی اور لسانی تعامل کا تجزیہ کیا۔ جناب جنگ نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعمیر وترقی کے اس مثبت رویے کو مزید تقویت دیں۔ اس سے پہلے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے پروفیسر مجیب یادگاری خطبے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس خطبے کا بنیادی مقصد جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کے بانیوں کے اصولوں اور افکار اور بصیرتوں کو عام کرنا اور ہند۔ اسلامی تہذیب کے اصولوں اور آدرشوں کو فروغ دینا ہے۔ تقریب کی صدارت مشہور بزرگ صحافی جناب کلدیپ نیر نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں آزادی اور تقسیم کے پہلے برصغیر میں پائے جانے والے ذہنی اور جذباتی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے تقسیم سے ہونے والے نقصانات کا ذکر کیا اور کہا کہ آزادی کے بعد ہم نے جس جدید سیکولر جمہوری ہندوستان کی تعمیر کا عزم کیا تھا ابھی اس کا عمل جاری ہے۔

پریس ریلیز، ذہین اختر ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 30 اکتوبر 2012

پریس کلب آف انڈیا میں اردو کورس

نئی دہلی: اردو اکادمی کی کوششوں اور پریس کلب آف انڈیا کی خواہش سے پریس کلب آف انڈیا میں سینئر صحافیوں کو اردو پڑھانے کے سلسلہ کا افتتاح ہوا۔ اس کورس کے لیے تقریباً 38 صحافیوں نے داخلہ فارم بھرے۔ اس موقعے پر پریس کلب سے اہم ذمہ داران اور عہدیداران بھی شامل تھے۔ داخلہ لینے والوں میں ملک کے تمام انگریزی، ہندی اور دیگر زبان کے صحافیوں کے علاوہ اہم ٹی۔ وی۔ چینل سے وابستہ شخصیات بھی شامل تھیں۔ پروگرام کا آغاز کلب کے سکریٹری انل آنند نے کرتے ہوئے اردو اکادمی دہلی، کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور تسلیم کیا کہ اردو بہت خوبصورت زبان ہے۔ سہیل ہاشمی نے کہا کہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک عظیم تہذیب کا نام ہے۔ یہ تصور ہی بہت خطرناک ہے کہ اردو مسلمانوں

کی زبان ہے انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے بنیاد گزاروں میں اہم نام ہندوؤں کے ہیں بلکہ اولین اردو ناشرین میں بھی سرفہرست منشی نول کشور ہیں۔ اسی طرح ہندی کے بنیاد گزاروں میں مسلمانوں کا خاصہ دخل ہے، جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سکریٹری اردو اکادمی، انیس اعظمی نے اردو سرٹیفکیٹ کورس کی اہمیت اور افادیت پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے پریس کلب کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کے پروگرام افسران جناب محمد شمیم، راغب الدین، اور مستحسن احمد بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی، نئی دہلی 15 اکتوبر 2012

بیگم اختر صدی تقریبات کا آغاز

پٹنہ: دوردرشن پٹنہ کی جانب سے گزشتہ روز روبندر بھون میں بیگم اختر صد سالہ تقریب کی شروعات کا خوبصورت اہتمام کیا گیا۔ تین گھنٹے تک دوردرشن (بھارتی) کے سبھی چینلوں نے پورے ہندوستان اور بیرون ہندوستان اس کا براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل دوردرشن جناب کرشن کلپت نے اپنی موثر افتتاحی تقریر میں کہا کہ آج دوردرشن کی تاریخ کا ایک اہم باب رقم ہورہا ہے۔ خالص ہندوی کے عمدہ شاعر کرشن کلپت

نے کہا کہ بیگم اختر کے کلام کے انتخاب کو اگر ہم پیش نظر رکھیں تو مجھے کہنے میں تامل نہیں ہے کہ ان کی گائیکی کا یوں تو ایک بلند معیار ہے ہی مگر منتخب کلام کو سن کر بھی معیار سازی کا تصور اور بلند ہوتا ہے۔ اجیت پردھان نے اپنے مقالے میں بعض نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا۔ قاسم خورشید نے اپنے پرچے کو بہت ہی دلچسپ اور موثر طریقے سے پیش کرتے ہوئے بیگم اختر کی غزل گائیکی کو اپنا موضوع بنایا۔ پدم شری گیبندر نرائن نے شخصی پہلوؤں اور دادرا، ٹھمری گائیکی کو اپنا موضوع بنایا تھا جسے ناظرین نے پسند کیا۔ دوسرے دور میں موسیقار اجیت ناہر کی ہدایت میں بنی دستاویزی فلم دکھائی گئی۔ تیسرے دور میں شانتی ہیرانند ودیا شاہ اور ڈاکٹر ریتا گنگولی نے بیگم اختر کی گائیکی کو خراج پیش کر کے تمام ناظرین کو سحر زدہ کر دیا۔ شانتی ہیرانند نے 'مائی امی' عنوان سے بیگم اختر پہ بہت ہی عمدہ کتاب بھی لکھی۔ اخیر میں ڈاکٹر ریتا گنگولی نے بہت ہی مودبانہ لہجے میں کہا کہ میری تمام عمر موسیقی اور خصوصی طور پر بیگم اختر کی گائیکی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے وقف ہے۔

پریس نوٹ، سید عبیداللہ سبحانی، پٹنہ، 2 نومبر 2012

مذہبی صحافت پر فکر وتدبر کانفرنس

مارہرہ شریف: تاریخ شاہد ہے کہ خانقاہوں اور مدارس کا کردار ہر دور میں رہا ہے اور آئندہ بھی یہاں زندگی کے معاملات پر کھل کر بحث کی جا سکتی ہے، اگر زمانے کے تقاضوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہاں کے ذمہ داران معاملات کے حل پر سنجیدگی سے غور وفکر کرتے رہیں۔ انھی مقاصد کے تحت چند برسوں قبل خانقاہ عالیہ برکاتیہ میں عرس قاسمی کے موقعے پر 'فکر وتدبیر کانفرنس' کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار سید محمد اشرف انکم ٹیکس کمشنر، دہلی نے فکر وتدبیر کانفرنس کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج میڈیا کی اہمیت سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے، چنانچہ مذہبی صحافت کو نئی سمت دینے کے لیے فکر وتدبیر کانفرنس کے ذمہ داران اس مرتبہ کا موضوع 'مذہبی صحافت: اسلوب، مواد اور پیش کش' رکھا، تا کہ مدارس اور دیگر دینی اداروں یا علمائے کرام جو دین کی تبلیغ کے لیے رسالے نکالتے ہیں، ان کو موجودہ صحافتی اصولوں اور پیش کش کے انداز سے روشناس کرایا جائے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شکیل حسینی لیکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے مذہبی صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر افضل مصباحی ایڈیٹوریل انچارج روزنامہ انقلاب، دہلی نے مذہب کی تبلیغ میں معاصر میڈیا کی ضرورت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ تبلیغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم سیرت رسول، سیرت صحابہ اور صوفیا کرام کے طرز عمل کو ضرور نگاہ میں رکھیں۔ مولانا خوشتر نورانی ایڈیٹر ماہنامہ 'جام نور' نے کہا کہ اس وقت مذہبی صحافت بہتر ہو رہی ہے۔ انھوں نے خواتین واطفال کے لیے مذہبی رسائل کی ضرورت پر زور دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 نومبر 2012

اطہر فاروقی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری مقرر

نئی دهلی: اردو کے معروف اسکالر اور ادیب ڈاکٹر اطہر فاروقی 14 ستمبر 2012 سے حال تک انجمن ترقی اردو (ہند) کے کارگزار جنرل سکریٹری کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے لیکن پچھلے مہینے 15 ستمبر کو ڈاکٹر خلیق انجم کے سبکدوش ہو جانے کے بعد اب ضابطہ کی تمام کارروائی مکمل کر کے انھیں مستقل طور پر انجمن ترقی اردو (ہند) کا مستقل جنرل سکریٹری مقرر کر دیا گیا اور انھوں نے اپنے عہدے کا باقاعدہ چارج سنبھال لیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 نومبر 2012

پانچ اقلیتی یونیورسٹیاں قائم ہوں گی: کے رحمٰن خان

نئی دهلی: اقلیتی امور کے وزیر کے رحمٰن خان نے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی بات کو تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آنے والے وقت میں ملک میں 5 اقلیتی یونیورسٹی قائم کی جائیں گی۔ وزیر موصوف نے میڈیا سے بات چیت میں کہا کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے، اسے دور کرنے کے لیے اقلیتی اکثریتی علاقوں تعلیم سے متعلق بنیادی ڈھانچوں کے فروغ کی سخت ضرورت ہے۔ آنے والے وقت میں ہم ملک کے مختلف علاقوں میں 5 اقلیتی یونیورسٹیاں قائم کریں گے۔ ان یونیورسٹی کا قیام مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے تحت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتی اکثریتی علاقوں میں اسکول کی بنیادی سہولتوں کے فروغ کا بھی منصوبہ ہے۔ ہمارے ملک میں 93 اقلیتی اکثریت اضلاع میں سینٹرل اسکول کی طرز پر اقلیتی اسکول قائم کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ مسٹر رحمٰن نے کہا کہ یونیورسٹی تعلیم اور سکنڈری تعلیم میں بنیادی ڈھانچے کے فروغ کے لیے پبلک و پرائیویٹ حصہ داری کے ماڈل کو آگے بڑھایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت اس بات کی جانچ کرے گی کہ اقلیتی فرقے کو حکومت کے مختلف منصوبوں سے کتنا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ اقلیتی اکثریتی اضلاع کی شناخت کرتے ہوئے مسلمانوں کے اثر والے علاقوں کو شامل کیے جانے کے الزامات کے بارے میں پوچھے جانے پر کے رحمٰن نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم چاہتے ہیں کہ اقلیتی اکثریتی اضلاع کی جگہ پر بلاکوں کی پہچان کی جائے، کیونکہ ضلع بہت بڑا علاقہ ہوتا ہے۔ اقلیتی اکثریتی کی شناخت کرنے سے سبھی اقلیتی طبقوں کی شکایتوں کو دور کیا جا سکے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 نومبر 2012

دهلی:

ایک شام انتظار حسین کے ساتھ

نئی دهلی: لاہور سے آئے ہوئے برصغیر کے بہترین لکھنے والے انتظار حسین کے ساتھ گزشتہ دنوں غالب اکادمی، نئی دہلی میں ایک شام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر غالب اکادمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے استقبالیہ

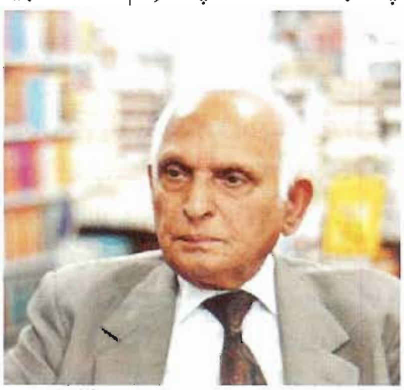

تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انتظار حسین نے لکھنے کا آغاز صحافت سے کیا، عصر حاضر کے بہترین ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں، لیکن ادب کو صحافت سے الگ رکھا، اسی طرح صحافت کو ادب سے الگ رکھا۔ کنکری، گلی کوچے، بوند بوند، قطرے سے گہر ہونے تک ان کی تخلیقات ہیں جن میں آزادی کا ہولناک تجربہ شامل ہے، ان کی کہانیوں میں تاریخ کی تہذیب کی معاشرتی زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ اس موقعے پر انتظار حسین نے کہا کہ جب میں پہلی بار پاکستان گیا تو خاندان کو چھوڑ کر گیا تھا، کچھ دن کے لیے پرمٹ لے کر آیا تو مجھے دہلی شہر اجنبی لگا۔ حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ، امیر خسرو کی درگاہ پر حاضری دی۔ 1976 سے برابر آنا ہوتا ہے، لاہور میں حکیم اجمل خاں کی حیات و خدمات پر کتاب لکھی، جس کے دو ایڈیشن فوراً ختم ہو گئے۔ میرے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں بیٹھ کر ہندوستان کی بات کرتا ہوں۔ میں پاکستان سے لاتعلق نہیں ہوں۔ میرا ناول بستی بنگال تحریک سے وابستہ

اقلیتی خواتین اور تعلیم کا معیار

خواتین معاشرے کی اثاثہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر ایک لڑکی کو تعلیم دی جائے تو پورا خاندان ترقی یافتہ ہوجاتا ہے، ساتھ ہی وہ خاندان اور ملک کی ترقی کا اہم ذریعہ بن جاتی ہے۔ مختلف ادارے اپنے اپنے طور سے لڑکیوں میں تعلیم کا معیار بلند کرنے کے لیے کام کرتی ہیں۔ بھارت سرکار کے وزارت تعلیم نے بھی درج ذات فہرست، غیر پسماندہ اور اقلیتی لڑکیوں کو خاص طور سے ذہن میں رکھتے ہوئے اعلیٰ سطح پر 2004 میں 'کستور با گاندھی بالیکا ودیالیہ' منصوبہ کی شروعات کی، جہاں اگر 50 لڑکیاں ان فرقوں سے متعلق ہوں گی تو ان کے لیے پرائمری سطح پر اسکول کے لیے 3 ماڈل کے بنیاد پر شناخت کی جائے گی۔ منصوبہ کی فطرت کو ذہن میں رکھتے ہوئے درج فہرست ذات اور اقلیتی فرقے سے متعلق 75 فیصد لڑکیوں کو ایسے مندرجہ بالا اسکولوں کے لیے اولیت دی جائے گی۔ اس کے بعد خط افلاس سے نیچے کی 25 فیصد لڑکیوں کے لیے منتخب ہوں گے۔

پھر سرکاری اداروں اور دوسرے غیر مالی معاونت اسکولوں میں جہاں بھی ممکن ہوا سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ ان اقامتی اسکولوں کو کارپوریٹ کے ذریعے اپنایا جاسکتا ہے۔ کستور با گاندھی بالیکا ودیالیہ، اور متعلق اقامتی اسکول، سروشکشا ابھیان کا غیر منقسم حصہ ہیں۔ حکومت ہند کے اس کوشش کا مقصد پرائمری سطح پر لڑکیوں کو ثانوی سطح کی تعلیم مہیا کرانا اور لڑکوں کے مقابلے میں رکھنا ہے۔ اس میں پرائمری سطح پر بورڈنگ کی سہولت کے ساتھ اقامتی اسکول قائم کرنا ہے۔ تاکہ لڑکیاں تعلیم یافتہ باہنر اور محفوظ ہوں۔ 27 صوبوں میں تقریباً 2578 کستور با گاندھی بالیکا ودیالیہ، حکومت ہند کے ذریعہ منظور کیے گئے ان میں سے 427 کستور با گاندھی ودیالیہ مسلم اکثریتی بلاکوں میں 612 درج فہرست ذات بلاکوں میں اور 688 درج فہرست قبائلی ذات بلاکوں میں منظور کیے گئے۔ ہمیں اگر اپنے معاشرے کو تعلیم یافتہ کرنا ہے تو جہاں بھارت میں 'ماڈل اسکول منصوبہ' کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی وہاں ساتھ ہی ساتھ ان منصوبوں کی حمایت بھی کرنی چاہیے جس سے کہ بڑے پیمانے پر معاشرہ بیدار ہو اور ان منصوبوں کی دسترس عام لوگوں میں ممکن ہوسکے۔

'کستور با گاندھی بالیکا ودیالیہ' 2007 سے سروشکشا ابھیان کا ایک حصہ ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے وزارت فروغ انسانی وسائل کی میپنگ کمیٹی کی ایک خصوصی میٹنگ پونہ میں ہوئی، اس میں اس منصوبہ پر بحث و مباحثہ ہوا جس میں اقلیتی لڑکیوں کو تعلیم کے مواقع مہیا کرانے اور ان میں تعلیمی معیار بڑھانے پر زور دیا۔

یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ یہ میٹنگ پونہ کے اعظم کیمپس میں ہوئی جو کہ اپنے آپ میں تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز ہے، مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے وہاں پر ہزاروں لڑکیوں کو کمپیوٹر تکنیک، ڈینٹل سائنس اور قانون کی ڈگری وغیرہ کی پڑھائی کرتے ہوئے ایک ایک بہت ہی خوبصورت اور منظم حالت اور ماحول میں دیکھا۔ یہاں پر لگ بھگ 29 کالجوں میں مختلف موضوعات کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ کالج کیمپس 24 ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے اور ان میں لگ بھگ 23,000 بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ جناب پی اے انعام دار کی صدارت میں چلنے والے اس کیمپس سے دوسرے اقلیتی اداروں کو سبق لینا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے، تاکہ اقلیتی لڑکیوں میں تعلیم کا معیار بلند ہوسکے۔

آخر میں ایک بات پر ہمیشہ دھیان دینا چاہیے کہ پونہ ہو یا دلی، اقلیتی لڑکیوں کو تعلیم دیتے وقت ایسے ذرائع سے ان کو واقف کرایا جائے جس سے وہ صحیح روزگار حاصل کرسکیں اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر معاشرے میں برابری کی جگہ حاصل کرکے ملک اور معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکیں۔

پشپندر سنگھ، ممبر دہلی اقلیتی کمیشن، دہلی

ہے، آگے سمندر ہے، کراچی میں مہاجرین کے مسائل سے متعلق برصغیر میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ ہے، اس کو کوئی بھی شخص نظر انداز نہیں کرسکتا، میں جو لکھتا ہوں تو اس میں یہی ہزار سال کا پس منظر ہوتا ہے۔ میں ہزار سال کا پس منظر ہوتا ہے۔ میں ہزار سالہ تہذیب کا پیداوار ہوں۔ اس موقعے پر انجم عثمانی نے سوال کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی تخلیقات میں ہندو دیومالا کی اصطلاحیں خوب استعمال ہوتی ہیں، کیا پاکستانی قاری کو

سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ انتظار حسین نے کہا کہ داستانی روایتوں سے سب واقف ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ انتظار حسین کی کہانیوں میں ہم عصر بلکہ آنے والی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جلسے کی صدارت مشہور افسانہ نگار ترنم ریاض نے کی۔ انھوں نے کہا کہ انتظار حسین آج کے بہترین افسانہ نگار ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اکتوبر 2012

اردو ہندی ہندوستانی

نئی دہلی: ہم سب جو زبان بولتے ہیں وہ کلی طور پر نہ اردو ہے نہ ہندی، بلکہ مشترکہ طور پر ہندوستانی ہے جسے رسم الخط سے دو حصوں میں بانٹ لیا گیا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اردو، ہندی اور پنجابی قلم کاروں کی مشترکہ بزم 'محفل گنگ و جمن' کے ادبی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفر مرادآبادی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اب تک محترمہ تولین سنگھ کی سرپرستی میں تین ایوارڈ اور ایک کتاب کلیات مجاز کی اشاعت کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔ اس موقعے پر سابق مرکزی وزیر عارف محمد خان نے گنگا جمنی تہذیب کے ابتدائی عناصر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ تہذیب چھٹی صدی میں کیرالہ کے ایک مندر سے شروع ہوئی۔ پنجابی زبان کی ادیبہ محترمہ اجیت کور نے ایک طویل مقالہ پیش کرتے ہوئے پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کی قدیم تہذیبی وراثت کا ذکر کیا ہے، بلھے شاہ اور بابا فرید کی صوفیانہ قدروں پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پنجابی شاعر سوہن لال سوہن، ہندی کوی ناگیش چندر اردو شاعر عبدالرحمٰن منصور کو 50-50 ہزار روپے کا چیک مومنٹو اور شال پیش کرکے انھیں اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب ایوارڈ کے بعد وقار مانوی کی صدارت میں شعری نشست ہوئی جس میں ڈاکٹر جی آر کنول، ماجد علی کاوش، ظرف دہلوی، سیماب سلطانپوری وغیرہ شریک تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم نومبر 2012

دہلی کالج میں عصمت کے افسانہ پر ڈرامہ

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں IPTA تھیٹر گروپ کی جانب سے اردو کے مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی کا افسانہ 'دوزخ' پر مبنی 'دوزخ... ایک سچ' ڈرامہ پیش کیا گیا۔ 'دوزخ' کی کہانی دو بوڑھی عورتوں کے دکھ، تکلیف، درد اور تنہائی کے کربناک المیہ پر مبنی ہے۔ ان عورتوں کا گزر بسر پاس پڑوس کے جوٹھن پر ہوتا تھا۔

انھیں ان کے اپنوں نے بے یار و مددگار سسک سسک کر مرنے پر چھوڑ دیا تھا۔ کہانی میں مردتسلط سماج کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ IPTA سے وابستہ عزیز قریشی نے اس ڈرامے کی ہدایت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اکتوبر 2012

اترپردیش:

محبان اردو سے بچوں کو اردو سکھانے کی اپیل

بارہ بنکی: ''موجودہ ریاستی حکومت اردو زبان کی تعلیم وترقی کے لیے پوری طرح سنجیدہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی محبان اردو کو بھی اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنا چاہیے۔'' مذکورہ خیالات آج شام ٹاؤن ہال میدان میں 'فورم فار ایجوکیشنل اینڈ سوشل ایڈوانسمنٹ آف مائنارٹیز' اور 'نوشاد سنگیت کیندر' کے مشترکہ تعاون سے پیش کیے گئے۔ ڈرامے 'میں اردو ہوں' کی محفل کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ریاستی وزیر برائے دیہی ترقی اروند سنگھ گوپ نے ظاہر کیے۔ مہمان ذی وقار ریاستی وزیر مملکت برائے منصوبہ بندی حاجی فرید محفوظ قدوائی نے اردو کی زبوں حالی کے لیے سب سے زیادہ ذمے داران محبان اردو کو قرار دیا جنھوں نے اپنے بچوں کو اردو تعلیم دینا تو دور کی بات اپنی شادیوں کے دعوت نامے بھی اردو میں چھاپنا بند کردیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کسی بھی زبان کی ترویج وترقی کے لیے اسکیمیں تو بنا سکتی ہیں لیکن ان اسکیموں پر عملدرآمد کرتے ہوئے ان سے مستفیض ہونے کا کام تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے لیے اسکیمیں بنائی گئی ہیں۔ اس موقعے پر ڈرامہ 'میں اردو ہوں' پیش کیا گیا جس میں اردو کی پوری تاریخ بیان کی گئی۔ اس زبان کے فروغ میں امیر خسرو، میر انیس، ڈاکٹر اقبال، غالب، مومن، فراق کے رول کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی حمد، مرثیہ، غزل اور طنز و مزاح کا کلام پیش کیا گیا۔ غالب کا کردار اطہر نبی ایڈوکیٹ، میر انیس کا رول جعفر میر عبداللہ، امیر خسرو کا کردار نواب مسعود، صوفی کا کردار پردیپ سکسینہ نے پیش کیا جب کہ اردو کا کردار ایک لڑکی نے ادا کیا۔ اسی کے ساتھ سنسکرت، فارسی، اودھی، ہندی، پنجابی زبانوں کا کردار بھی مختلف لڑکیوں کے نے ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، سابق چیئرمین مدرسہ بورڈ انور جلالپوری، ملک زادہ جاوید احمد، شاہدہ صدیقی، ریاستی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین غیاث الدین قدوائی، ضلع سپرنٹنڈنٹ، پولیس سید وسیم احمد، ممبران اسمبلی سریش یادو، رام گوپال یادو، سابق ممبر اسمبلی سرور علی خاں وغیرہ موجود تھے۔ اختتام پر فضل انعام مدنی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اکتوبر 2012

شہریار اور نیرج کے نام پر ایوارڈ

علی گڑھ: علی گڑھ کی مشہور صنعتی و زراعتی نمائش کے انعقاد کے سلسلہ میں نمائشی انتظامیہ کمیٹی کی میٹنگ ضلع مجسٹریٹ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں حسب سابق نمائش کو اس کے شایان شان منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا اور کہا گیا کہ اب ہر سال ایک کوی اور ایک شاعر کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے کے انعام سے نوازا جائے گا۔ یہ دونوں ایوارڈ پدم وبھوشن ڈاکٹر گوپال داس نیرج اور معروف شاعر ڈاکٹر شہریار کے نام پر ہوں گے جو ہندی کے سمیلن میں اور اردو کے شاعر کو مشاعرہ میں دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ نمائش کی کارگزار کمیٹی کی میٹنگ میں لیا گیا۔ نمائش کے صدر اور ضلع افسر نے میٹنگ کے بعد اخباری نمائندوں سے بات چیت میں کہا کہ نمائش کے دوران ہونے والا کوی سمیلن نیرج منچ پر اور مشاعرہ شہریار منچ پر ہوگا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 نومبر 2012

مرادآباد میں اردو مترجمین کا جلسہ

مرادآباد: اردو مترجمین ایسوسی ایشن کی ایک اہم میٹنگ مقامی امبیڈکر پارک میں منعقد کی گئی۔ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے یوپی میں اردو کی بدحالی پر سخت اظہار افسوس کیا اور کہا کہ آزادی کے اتنے برس بعد بھی ہندوستان میں اردو کو اس کا جائزہ مقام اور جائز حق نہیں مل سکا ہے۔ جمہوری ملک ہندوستان میں اردو کے ساتھ یہ سوتیلا سلوک صرف اس لیے ہے کہ اردو کو صرف مسلمان سے جوڑ کر اردو کو مسلمان سمجھ لیا جاتا ہے۔ مقررین نے اس صورتِ حال پر سخت تشویش ظاہر کرتے ہوئے مرکزی اور صوبائی سرکار سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ اردو کو ہندوستان کی دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔ تمام سرکاری غیرسرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اردو مترجمین کے تقرری کو ضروری قرار دیا جائے تاکہ اردو داں طبقہ بے کاری اور بے روزگاری سے نجات پاسکے۔ جو لوگ اردو مترجم کی سروس میں 15 سال پورے کرچکے ہیں ان کا گریڈ 28 سو سے روپے منظور کیا جائے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 نومبر 2012

انجمن ترقی پسند مصنّفین کا جلسہ

کانپور: انجمن ترقی پسند مصنّفین کی سالانہ میٹنگ نارائنی دھرم شالہ، میں ہوئی جس میں کاشی ہندو یونیورسٹی، بنارس کے سابق پروفیسر چوتھی رام یادو نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقعے پر بعنوان 'معاصر تقاضوں کے تناظر میں ادیبوں کی انجمنوں کا کردار' پر ایک گفتگو کا انعقاد کیا گیا جس پر مہمان خصوصی نے اپنے خطاب میں کہا کہ زبان، ادب اور تہذیب کی زمین پر مضبوطی سے کھڑے ہوکر ہی عصری چیلنجوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے تمام ادیبوں کی انجمنوں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ جلسے میں انجمن میں کے صدر پروفیسر خان احمد فاروق نے گزشتہ برس کی سرگرمیوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ انجمن مختلف ادبی، تہذیبی جلسوں کو منعقد کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی تخلیق کاروں کی تخلیقات پر گفتگو کا انقاد کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتی رہی ہے۔ سکریٹری ڈاکٹر آنند شکل نے آئندہ کے پروگراموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ صحافت کی بلند بالا شخصیت گنیش شنکر ودیارتھی کے اخبار 'پرتاپ' کی اشاعت کے 9 نومبر 2012 کو پورے سو برس ہوجائیں گے۔ اس موقعے پر انجمن ترقی پسند مصنّفین اترپردیش پترکار سنگھ اور مختلف مقامی انجمنوں کے تعاون سے مختلف جلسوں کا انعقاد کرے گا۔ میٹنگ میں 'پرتاپ' کے ذریعے ودیارتھی جی کی صحافتی، ادبی، سماجی اور ملک کی آزادی کے سلسلہ میں کی گئی خدمات کو بھی یاد کیا گیا۔

روزنامہ انوارقوم، کانپور، 21 اکتوبر 2012

بہار:

تصوف، ضرورت، اہمیت اور افادیت

پٹنہ: آفتاب شریعت حضرت دیوان شاہ ارزانیؒ کے سالانہ عرس کے موقع پر ایک سیمینار کا انعقاد ہوا جس کا

موضوع تھا 'تصوف: ضرورت، اہمیت اور افادیت' اس کی صدارت حسب روایت خانقاہ کے سجادہ نشیں ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد نے فرمائی جب کہ نظامت معتبر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے کی۔ یہ سیمینار عرس کی دیگر تقریبات کے درمیان اختصاصی پہلو کا حامل رہا اور توجہ کا مرکز بنا۔

'تصوف: ضرورت، اہمیت اور افادیت' کے موضوع پر حکومت بہار کے سابق وزیر اور اردو کے معتبر شاعر و ناقد ڈاکٹر پروفیسر لطف الرحمٰن، ویرکنور سنگھ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو فارسی اور خانوادۂ تصوف کی قابل ذکر شخصیت ڈاکٹر پروفیسر طلحہ رضوی برق، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی کے نگراں مولانا ڈاکٹر حسن رضا خاں، شعبۂ اردو ونوبھاوے یونیورٹی، ہزاری باغ کے استاد اور شاعر و ناقد ڈاکٹر زین رامش اور اردو کے قابل ذکر دانشور جناب اظہار خضر نے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

بذریعۂ ڈاک، محمد فیروز عالم، خدابخش لائبریری، پٹنہ، 23 اکتوبر 2012

کیرالہ:

اردو ٹیچرز کانفرنس

کولنڈی: کولنڈی کے میلاڈی میں اردو ٹیچر اکادمی سب ڈسٹک کے تحت اردو ٹیچر کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں اردو کے تئیں محبین کی بڑی تعداد میں شرکت رہی۔ پروگرام میں اردو کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو سے وابستہ تمام تعلیمی نظم و نسق کو بہتر کرنے پر توجہ دی گئی۔ پروگرام میں طلبہ کو اردو سے محبت کرنے کے گر سکھائے گئے۔ کانفرنس کا افتتاح کالی کٹ مسلم گرلس انسپکٹر محترمہ زلیخا نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ کیرلہ میں اردو ٹیچر ہی اس زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں، جن کی انتھک محنت و کوشش کا نتیجہ ہے کہ اردو ایک مثبت ترقی کی طرف گامزن ہے۔ محترمہ زلیخا نے کہا کہ اردو کی تعلیم کو لازمی بناؤ جس سے نہ صرف ریاستی سطح پر فائدے یا کامیابی ملے گی بلکہ ہندوستان کی کسی گوشے میں کام کرنے کے لیے یہی زبان آپ کے حصول اکتساب کارگر ثابت ہوگی۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 2 نومبر 2012

کرناٹک:

دھارواڑ میں اردو طلبا کی نشست

دھارواڑ: ہاشمی کامپلکس میں 'بزم طلبا' کی ہفتہ وار نشست اردو کلچرل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں میٹرک کے بعد زیر تعلیم طلبا شریک ہوئے۔ بزم کی نشست میں نصاب سے ہٹ کر مزید تعلیمی، اخلاقی و مسابقتی امتحانات و وقتی تقاضوں کی تکمیل سے بہتر زندگی کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ نشست میں فاؤنڈیشن کے بانی قلندر رضوی نے بھی طلبا سے خطاب کیا اور مختلف امور پر روشنی ڈالی۔

بذریعۂ ڈاک، قلندر رضوی، بانی فاؤنڈیشن، دھارواڑ، 30 ستمبر 2012

بنگلور میں اردو مہم

بنگلور: گزشتہ روز مسجد آمر کلیمی شاہ گڑ دھلی میں منعقدہ اجلاس میں 300 بچوں کو اردو زبان کی مشق و خوشخط کے لیے نوٹ بکس تقسیم کیے گئے، اس موقعے پر مسجد آمر کلیمی کے صدر الحاج عبدالقادر عرف چھوٹے صاب نے اپنے خیالات کا ظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی اردو زبان جو ہمارے آبا و اجداد کی میراث و علمی خزانہ ہے خود ہمارے ہاتھوں برباد ہو رہی ہے، اس کو بچانا اور اس کی حفاظت کرنا ہم تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ حکومت اخبارات کے سرکیولیشن سے اس زبان کے قارئین کا اندازہ لگاتی ہے۔ اس لیے ہم تمام لوگ اپنے گھروں پر اردو اخبارات منگوائیں، اور اپنے مکان کے بورڈ اور دوکان کے سائن بورڈ بھی اردو میں لگوائیں۔ الحاج عبدالقادر نے مزید کہا کہ اگر ہماری کوششیں جاری رہیں تو ایک دن انشاء اللہ کرناٹک میں ہماری دوسری زبان اردو ہوگی اور حکومت مجبور ہو کر سرکاری دفاتر میں بھی اردو کو جگہ دے گی۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 18 اکتوبر 2012

مہاراشٹر:

جلگاؤں میں کیریئر گائڈنس سینٹر

جلگاؤں: انجمن تعلیم المسلمین کے زیر انصرام مولانا عبدالرزاق اینگلو اردو ہائی اسکول و جونیر کالج جلگاؤں میں 'انجمن کیریر گائیڈنس سینٹر کا افتتاح' (FEM) کے ریاستی رابطہ کار جناب شبیر شاکر صاحب کے ہاتھوں کیا گیا۔ (ATM) کے صدر الحاج عبدالغفار ملک کی صدارت میں منعقد ایک تقریب میں انھوں نے طلبا اور اسکولوں کے ذمہ داروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ طلبا کو تعلیم میں ایسے شعبوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو موجودہ حالات میں ضروری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انتظامیہ موجودہ حالات کے مطابق طلبا کو ہر قسم کی جدید سہولیات فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ پاسبانِ تعلیم کے ایڈیٹر جناب شبیر شاکر نے گائیڈنس سینٹر کے قیام پر خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جلگاؤں ضلع کی تاریخ میں ایک اہم قدم قرار دیا۔ اس موقعے پر انھوں نے حکومت کی جانب سے اقلیتوں کو فراہم کی جانے والی اسکیموں کی تفصیلات پیش کیں۔ کالج کے پرنسپل صغیر احمد شیخ نے کریئر گائیڈنس سینٹر کے قیام کو اسکول کی تاریخ میں ایک اہم پیش رفت قرار دیتے ہوئے ضلع کے ہر مقام پر طلبا کی رہنمائی کے لیے گائیڈنس سینٹر قائم کرنے پر زور دیا۔ انجمن گائیڈنس سینٹر کے انچارج نعیم الدین شیخ نے اِسے وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ ادارہ کے وائس پرنسپل اقبال شیخ کی رسم شکریہ پر اس تقریب کا اختتام ہوا۔

بذریعۂ ڈاک، حاجی نور محمد چاچا، جلگاؤں، 8 اکتوبر 2012

ممبئی میں اردو ہندی ڈرامہ شوز

ممبئی: ساٹھے آڈیٹوریم ولے پارلے ممبئی میں پرپیچئے تھیٹر گروپ کے سہ روزہ ڈراما فیسٹول 'نورنگ' میں اردو ہندی کے نو ڈراموں کے دس شوز کامیابی سے ہوئے، اس موقعے پر تھیٹر اور فلم کی اہم شخصیات نے فیسٹول میں شرکت کی۔ 'نورنگ ڈراما فیسٹول' کا افتتاح اردو ڈراما کی معروف شخصیت، ڈراما نگار، ہدایت کار اقبال نیازی نے کیا اور اس موقعے پر ان کی 30 سالہ ادبی اور تھیٹر کی خدمات کے لیے انھیں ایک مخصوص ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈراما اور فلم کے سینئر اداکار اور ہدایت کار طیب قریشی نے یہ ایوارڈ اقبال نیازی کو تفویض کرتے ہوئے کہا کہ ''میں دیکھ رہا ہوں گزشتہ 30 برسوں سے اقبال نیازی، تن تنہا، یک نفری آرمی کی طرح لگاتار کام کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 31 اکتوبر 2012

جسٹس کاٹجو کا دورۂ انجمن اسلام

ممبئی: اردو وراثت کارواں کے قائد اور سرپرست جسٹس مرکنڈے کاٹجو خصوصی دعوت پر انجمن اسلام آئے جہاں ادارے سے وابستہ سینئر شخصیات ادارے کے تحت چلنے والے اسکولوں کے صدر مدرسین اور شہر کی ممتاز شخصیات کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ اس جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جسٹس کاٹجو نے کہا کہ ''آزادی کے بعد سے اردو پر متواتر جو ظلم ہوا ہے وہ صرف مسلمانوں پر نہیں ہوا، مجھ جیسو پر بھی ہوا ہے کیونکہ اردو میری بھی زبان ہے۔'' بقول جسٹس کاٹجو اب وقت آ گیا ہے کہ اردو کے تعلق سے پھیلائی گئی ان تمام غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو لوگوں کے ذہنوں میں گھر کر گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'اردو وراثت کارواں' اسی کوشش کی ایک کڑی ہے۔ قبل ازیں، انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے انجمن کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی قدیم ہے اور یہاں بیک وقت ایک لاکھ سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے انجمن کی سرپرستی میں قائم اور جاری و ساری مختلف اداروں کی جانب سے جسٹس کاٹجو کا خیر مقدم کیا۔ اس جلسے سے

انجمن اسلام ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور مشہور صحافی شمیم طارق نے بھی خطاب کیا جب کہ دہلی سے آئے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام الدین نے انجمن اسلام کو مثالی ادارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسے ادارے دوسرے علاقوں کے لیے عبرت کا سبب ہیں کہ وہاں ایسے ادارے کیوں قائم نہیں ہوسکے۔ بقول خواجہ اکرام الدین، جسٹس کاٹجو نے جس طرح پوری زندگی حق وانصاف کی بات کی ہے اسی طرح وہ اب اردو اور اس حوالے سے ملک کی رواداری اور بھائی چارگی کو مستحکم کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔

روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 24 اکتوبر 2012

مغربی بنگال:

کناڈا کے شاعر کو اعزازیہ

کناڈا کے مہمان شاعر و ادیب اشفاق حسین کو ایک اعزازیہ دیا گیا جس کا آغاز ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے مہمان شاعر و ادیب کے تعارف سے کیا۔ مشہور ادیب ظہیر انور نے پروگرام کی ابتدا کرتے ہوئے کہا ''اشفاق حسین کا وطن پاکستان ہے اور اب کناڈا ان کا وطنِ ثانی۔ کلکتہ ہمیشہ ان کے ادبی سفر کا پڑاؤ رہا ہے۔ وہ ترقی پسند نظریے کے حامی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے سائے میں ان کی ذہنی بالیدگی ہوئی۔ فیض پر انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ فیض کے مغربی افکار، ان کی شاعری، ان کے مشرقی نقطۂ نظر، فیض پر تنقیدی زاویے سے ان کی کتابیں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مہمان ادیب وشاعر اشفاق حسین نے کولکاتا کے حوالے سے اپنے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''شہر وہی یاد رہتا ہے جہاں لوگ ادب نواز ہوں۔'' ماہنامہ 'سہیل' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میرا 'سہیل' سے قدیم رشتہ ہے جو ادب اور قاری کا ہوتا ہے۔ حالیہ 'پرویز شاہدی نمبر' اور 'احتشام حسین نمبر' میری نظروں سے گزرے۔ صوری ومعنوی اعتبار سے دونوں نمبر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' اس کے بعد انھوں نے سامعین کو اپنی غزلوں کے چند متفرق اشعار سنائے اور نظموں میں 'بیٹے کے نام'، 'اونچی عمارتوں کے محلے میں'، 'مکمل رات'، 'مشورہ'، 'زندگی کے چار عشرے' اور اپنی نظم 'زومنگ' پیش کی۔

پریس ریلیز، امام اعظم، دربھنگہ، 5 نومبر 2012

مدھیہ پردیش:

ریاستی اردو اکادمی کی تشکیلِ نو

بھوپال: مدھیہ پردیش حکومت محکمہ پسماندہ طبقہ واقلیتی

ممبئی میں 'اردو وراثت کارواں' کی کانفرنس

ممبئی: جوہو پر واقع جے ڈبلیو میریٹ ہوٹل کے بال روم میں منعقدہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعلیٰ پرتھوی راج چوان نے کہا کہ ''سنیما نے اردو کو چھوڑ دیا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ یہ بات بھی قابل افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں کچھ لوگ اردو کو مذہب کے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے دوران تقریر یہ اعتراف کیا کہ اردو نے ملک کی قومی یک جہتی کو فروغ دیا ہے۔ ہم سرکاری طور پر اردو کو پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نئی نسل اردو تہذیب و ثقافت سے جڑے کیونکہ یہ بہت ضروری ہے۔ وزیراعلیٰ نے اپنی تقریر سے پہلے اٹھائے گئے اس سوال پر کہا مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کو اقلیتی امور کی وزارت سے کیوں جوڑ دیا گیا، جواباً کہا کہ یہ غلطی ہوئی ہے اور اسے بدل کر حسب سابق ثقافتی امور کی وزارت سے وابستہ کیا جائے گا۔ شری چوان نے یہ بھی کہا کہ اگر اردو اور مراٹھی اسکولوں میں انگریزی کی تدریس پر خاص توجہ دی جائے تو والدین اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں داخل کرنے سے باز رہ سکیں گے۔ انھوں نے 'اردو وراثت کارواں' کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ جسٹس کاٹجو کی سرپرستی میں یہ اچھا اقدم اٹھایا گیا ہے جو قابل مبارکباد ہے۔ وزیراعلیٰ نے فخریہ انداز میں بتایا کہ ہمارے ملک کے وزیراعظم کی تقریر اردو میں لکھی ہوتی ہے۔ وزیر اقلیتی امور عارف نسیم خان نے سامعین کو یقین دلایا کہ اردو کی ترقی کے لیے بجٹ کی کوئی کمی ہے نہ ہی یہ کوئی مسئلہ ہے۔ حکومت اردو کی ترویج و ترقی کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔ انھوں نے اردو گھر کے قیام کے اپنے اعلان کو دہرایا کہ جہاں جہاں اردو گھر کی تعمیر اعلان ہوا ہے اہل اردو اس خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا دیکھیں گے۔ مشہور شاعر مکالمہ نویس جاوید اختر نے کہا ''ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب آپ کسی سے اردو میں بات کرتے ہیں تو جب تک ہر بات اس کی سمجھ میں آتی ہے تو وہ اسے ہندی کہتا ہے۔ لیکن جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو اسے اردو کہتا ہے۔ یہ معاملہ دنیا کی کسی زبان کے ساتھ نہیں ہے۔ بقول جاوید اختر اردو کو مار مار کر مسلمان بنایا گیا ہے ورنہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ اس ملک کے ہر شہری کی زبان تھی۔ جاوید اختر نے یہ بھی کہا کہ جنھیں پاکستان بنانا تھا انھوں نے جھوٹ بولا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ وہ اردو پر اپنا حق اور اجارہ داری ظاہر کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ مثلاً کشمیر کو بھی اپنا کہتے ہیں۔ اسی طرح اردو کو بھی اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ این

وزیراعلیٰ چوان تقریر کرتے ہوئے۔ تصویر میں دائیں سے بائیں: ایڈوکیٹ مجید میمن، عارف نسیم خان، جسٹس کاٹجو، خواجہ اکرام الدین، آصف اعظمی، قاسم امام، رما پانڈے اور عبدالسمیع بوبیرے

سی پی کے ترجمان اور مشہور وکیل مجید میمن نے کہا کہ پہلے ہر سنیما میں اردو ہی اردو ہوتی تھی حتیٰ کہ پہلی فلم 'عالم آرا' کا نام دیکھ لیجیے کہ اردو میں تھا لیکن دھیرے دھیرے اردو کو حاشیے پر لانے کی کوشش کی گئی ورنہ آپ چاہے دیو آنند کی بات کریں یا دھرمیندر کی، سب اردو جانتے تھے۔ مشہور فلمساز مہیش بھٹ نے کہا کہ مری ایک آنکھ ہندو ہے دوسری مسلمان۔ انھوں نے کہا کہ میری ماں مسلمان تھی اور اُسے اردو سے محبت تھی چنانچہ اس زبان سے مجھے بھی محبت ہے۔ انھوں نے ایک واقعہ بتایا کہ جب مولانا آزاد کا انتقال ہوا تو میری والدہ ریڈیو پاکستان سے اردو میں خبریں سن رہی تھیں جس پر میرے والد ناراض ہوئے اور کہا کہ خبریں ہندی میں سنو۔ اس کانفرنس سے مکالمہ وکہانی نویس روی جعفری اور موسیقار انو ملک نے بھی خطاب کیا۔ اردو وراثت کارواں کے کنوینز آصف اعظمی نے وزیراعلیٰ کی موجودگی میں دہلی اور آندھرا اردو اکادمی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر اردو اکادمی کا بجٹ کافی کم ہے جسے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام الدین نے اپنی تقریر میں اردو کو ہندوستان کی عظیم زبان قرار دیا۔ اردو وراثت کارواں کے سرپرست اور قائد جسٹس مرکنڈے کاٹجو نے بتایا کہ جب وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے تب ایک مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ سنسکرت اور اردو کو پہلی سے پانچویں جماعت تک لازمی قرار دینا چاہیے تاکہ بچے ان زبانوں کو سیکھ لیں اور اس کے بعد وہ اپنی سہولت کے مطابق کسی بھی میڈیم کا انتخاب کریں لیکن بنیادی تعلیم کے دوران ان دو زبانوں کی تدریس لازمی ہے۔ انھوں نے وزیراعلیٰ مہاراشٹر سے اپیل کی کہ وہ اپنی ریاست میں اس فارمولے کو رائج کریں۔ اعلیٰ پولیس افسر قیصر خالد کے شکریے کے ساتھ یہ کانفرنس رات تقریباً دس بجے اختتام کو پہنچی۔ روزنامہ 'انقلاب' 23 اکتوبر 2012

فلاح و بہبود نے ریاستی اردو اکادمی کی مجلس عام و مجلس عاملہ کی تشکیل کی ہے۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے صدر (وزیر مملکت درجہ) محمد سلیم قریشی نے مدھیہ پردیش حکومت کے ذریعے اردو اکادمی کی مجلس عام و مجلس عاملہ کی تشکیل کیے جانے پر کہا کہ اردو والوں کی برسوں پرانی مانگ کو پورا کرکے حکومت نے اردو زبان کے فروغ کے تئیں اپنے عزم کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اعلان شدہ مجلس عام و مجلس عاملہ میں جہاں اردو ادب کے نمائندوں کو جگہ دی گئی ہے وہیں پورے صوبے کی نمائندگی کا بھی خیال رکھا گیا ہے میری کوشش ہوگی کہ نامزد ممبران کے تعاون سے اردو زبان کی ترقی کے لیے ٹھوس و کارگر اقدام اٹھائے جائیں۔

بذریعہ ڈاک، نصرت مہدی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، 18 ستمبر 2012

اعزاز و اکرام:

گلزار

نئی دہلی: اردو کے معروف نغمہ نگار و افسانہ نگار اور فلمساز گلزار کو قومی یکجہتی اور امن و اتحاد کو فروغ دینے کے لیے بدھ کو وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ اور یو پی اے چیئرپرسن سونیا گاندھی کے ہاتھوں اندرا گاندھی قومی یکجہتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ

ایک تقریب میں نغمہ نگار اور فلمساز گلزار کو 27واں اندرا گاندھی قومی یکجہتی ایوارڈ دیتے ہوئے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ اور یو پی اے چیئرپرسن سونیا گاندھی

31 اکتوبر کی ایک خاص اہمیت ہے۔ آج کا دن آنجہانی اندرا گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کی قربانی کو یاد کرنے کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں آج بھی فرقہ پرست طاقتیں موجود ہیں جن سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد گلزار نے کہا کہ جس طرح کے حالات میں ہمارا ملک تقسیم ہوا، ایسے حالات دوبارہ نہیں پیدا ہونے چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ ہر ہندوستانی سیکولر ہوتا ہے کیونکہ ہندوستانی تہذیب میں سیکولرزم موجود ہے۔ سونیا گاندھی نے گلزار کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ گلزار کو آج اس اعزاز کے لیے اس لیے منتخب کیا گیا ہے، کیونکہ انھوں نے ایک اچھے شاعر، فلمساز اور قلمکار کے طور پر جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم نومبر 2012

چینی ادیب کو ادب کا نوبل انعام

اسٹاک ہوم: چینی ادب کو لوک کہانیوں، تاریخ اور عصری زندگی کی 'فریب خیال سے مملو حقیقت نگاری' کے لیے سال 2012 کے لیے ادب کا نوبل انعام دینے کا آج اعلان کیا گیا۔ سویڈش اکادمی کی طرف سے دیے جانے والے اس انعام کے تحت مویان کو 1.2 ملین ڈالر دیے جائیں گے۔ اکادمی کے سربراہ پیٹر انگلینڈ نے کہا کہ مویان کی تحریروں کی انفرادیت یہ ہے کہ اگر آپ آدھا صفحہ بھی پڑھ لیں تو آپ یہ بتادیں گے کہ یہ تحریر مویان کی ہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مویان ان کا قلمی نام ہے جس کے معنی ہوتے ہیں 'مگو' جب کہ ان کا اصل نام گوان موئے ہے۔ اکادمی کی طرف سے جاری کردہ تعریفی سند میں کہا گیا ہے کہ مویان اپنی تحریروں میں فریب خیال اور حقیقت، تاریخی اور سماجی منظر نامے کا ایک حسین سنگم پیش کرتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اکتوبر 2012

حیدرآباد کے اردو ٹاپرز

حیدرآباد: اردو گھر مغل پورہ میں 20 اکتوبر انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد کے جلسہ تقسیم انعامات ایس ایس سی ٹاپرز کی تہنیت کے موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں جناب نصرت محی الدین نے کہا کہ اردو ذریعہ تعلیم کو عام کرنے طلبا و طالبات کو اپنے توانائیاں صرف کرنے اور جو طلبا و طالبات انگریزی میڈیم سے تعلیم حاصل کررہے ہیں ان سے زبان دوم اردو لینے کی اپیل کی اور کہا کہ حتی الامکان اپنے نونہالوں کو اردو ذریعہ تعلیم سے تعلیم دلوائیں کیونکہ ہمارا تمام تر تہذیبی اثاثہ اردو زبان ہی میں محفوظ و موجود ہے۔ ایس ایس سی ٹاپرز میں جملہ 29 طلبا و طالبات کو گولڈ میڈل سلور میڈل اور خصوصی ترغیبی انعامات پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 22 اکتوبر 2012

سید منیر نیازی

کولکاتا: اردو کے نامور اور بزرگ صحافی سید منیر نیازی کو ان کی 52 سالہ صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ترنمول کانگریس کے ترجمان جاگو بنگلہ کے اتسو سنکھیا کی رسم اجرا کے موقعے پر اردو روزنامہ 'آزاد ہند' کے ڈپٹی چیف سب ایڈیٹر سید منیر نیازی سمیت مختلف زبانوں کے 10 بزرگ صحافیوں کو ایوارڈ دیے گئے۔ جاگو بنگلہ کی جانب سے گزشتہ دو سال سے بزرگ صحافیوں کو ایوارڈ دینے کا سلسلہ قائم ہے۔ نذرل منچ میں ترنمول کانگریس کی سربراہ وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی کی موجودگی میں سید منیر نیازی کے علاوہ ڈاکٹر پارتھو چٹو پادھیائے، بچن سنگھ منڈل، نرین مکھرجی، سوہن گوسوامی، سوبھنکر چٹو پادھیائے، پربھات مشرا، سبرتو ٹھنویش، کلیان بوس اور پرسون رائے کو ایوارڈ دیے گئے۔ یہ ایوارڈ 10 ہزار روپے نقد، کپڑے، اتسو سنکھیا (بنگلہ میگزین)، مٹھائی اور گلدستہ پر مشتمل ہے۔ اس موقعے پر جہاں چند دانشوروں کو تحائف دیے گئے۔ وہیں سینگور، ندی گرام اور نیتائی کے شہدا کے 30 خاندان کو بھی کپڑے اور مالی امداد دی گئی۔ اس موقعے پر ساردھا میڈیا گروپ کے سی ای او اور راجیہ سبھا کے ایم پی کنال گھوش بھی موجود تھے۔ ریاستی وزیر فرہاد حکیم، مدن مترا، پارتھو چٹرجی، ایم پی مکل رائے، سبرتو بخشی، ندیم الحق، وویک گپتا، میئر سوبھن چٹرجی کے ہاتھوں بزرگ صحافیوں کو ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقعے پر ترنمول سربراہ اور وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے جاگو بنگلہ کے اتسو سنکھا، ٹائمز آف انڈیا کے بنگلہ روزنامہ اور گلوکار اسینک دھر کے نئے البم کا اجرا بھی کیا۔

روزنامہ 'آزاد ہند' کولکاتہ، 16 اکتوبر 2012

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ایوارڈ

نئی دہلی: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا (یو ایم آئی) اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (یو ڈی او) کی جانب سے ایوارڈ کمیٹی کی میٹنگ زیر صدارت ماہر اقبالیات اور سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، پروفیسر عبدالحق دفتر تنظیم ہذا، نیو سیلم پور میں منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں اتفاق رائے سے درج ذیل حضرات کو اردو زبان و ادب کے میدان میں ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012 سے سرفراز کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(1) جناب محمد حامد علی (گورکھپور) قاضی عدیل عباسی عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012، برائے قومی و ملّی خدمات (2) پروفیسر حکیم افضال احمد (علی گڑھ)، مسیح الملک اجمل خاں عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012 برائے سماجی اور طبّی خدمات (3) ڈاکٹر عادل امیر (دہلی)، حکیم عبدالحمید عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012 برائے ترویج طب (4) ڈاکٹر انور سعید (دیوبند)، حکیم عبدالعزیز عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012، برائے استحکام طب (5) جناب آرائے چودھری (علی گڑھ) ڈاکٹر اے یو اعظمی عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012، برائے فروغ طب (6) ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی (سندیلا، لکھنؤ)، حفیظ میرٹھی عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012 برائے ادب (7) جناب عبدالمجید انصاری (خلیل آباد،

سنت کبیرنگر) محفوظ الرحمٰن عالمی یوم اردو ایوارڈ 2012 برائے صحافت۔

پریس ریلیز محمد عمران قنوجی، عالمی یوم اردو آرگنائزیشن کمیٹی، 18 اکتوبر 2012

خان لطیف محمد خان

حیدرآباد: ای تھامس گریجویٹ اسکول آف انڈیا کے زیراہتمام آج حیدرآباد میں منعقدہ 'انٹرنیشنل ایچ آر سمٹ 2012' کے موقعے پر ایڈیٹر انچیف روزنامہ منصف جناب خان لطیف محمد خان کو شعبۂ صحافت میں نمایاں خدمات اور وسیع پیمانہ پر روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے یونیورسٹی آف سنڈر لینڈ لندن کا باوقار ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ان کے علاوہ ریاستی وزیر انفارمیشن ٹکنالوجی پنالکشمیا کو ریاست میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دینے پر یونیورسٹی آف سنڈر لینڈ لندن کے باوقار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ریاستی وزیر پنالکشمیا نے اپنی تقریر میں کہا کہ آندھراپردیش نے انفارمیشن ٹکنالوجی کے شعبہ میں مثالی ترقی کی ہے۔ جناب خان لطیف محمد خان نے اپنی تقریر میں شعبۂ صحافت میں روزنامہ منصف کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ منصف کو ہندوستان سے شائع ہونے والے تمام اردو اخبارات میں امتیازی مقام حاصل ہے اور سینکڑوں افراد اس ادارہ سے وابستہ ہیں۔

رومنامہ 'منصف' حیدرآباد، 21 اکتوبر 2012

رسم اجرا:

کسک

مالیگاؤں: 2 اکتوبر بروز پیر شب میں 9 بجے اسحاق منشی ٹاؤن ہال، مالیگاؤں میں جدید لب و لہجے کے منفرد شاعر محمد یوسف کے مجموعۂ کلام 'کسک' کا اجرا عمل میں آیا۔ تفصیلات کے مطابق کل ہند مشاعرہ کے آغاز میں شہر مالیگاؤں کے ایڈیشنل ایس پی شری سنیل کڑاسنے نے حمدیہ کلمات پیش کرکے محفل کا آغاز کیا۔ اس موقعے پر گنپت بنسالی نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ اس طرح کی محفلوں کا انعقاد قومی یکجہتی کے فروغ میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اسحاق سیٹھ زروالے نے شمع فروزی کرکے پروگرام کا آغاز کیا۔ سرورق کی رونمائی ممبئی شہر سے آئے ہوئے مہمان خاص حیدر اعظم نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض الحاج مختار قریشی (ہیڈ ماسٹر ری پرم پرائمری اسکول) نے فرمائی۔ اپنی تقریر میں ایس پی سنیل کڑاسنے نے کہا کہ اردو زبان کے مشاعروں میں سب سے زیادہ بات گنگا جمنی

تہذیب کی عمدہ اخلاقی قدروں کا اظہار ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس پروگرام میں مختلف شعبہ حیات میں مثالی خدمات انجام دینے والی دس شخصیات کو نشان ہند ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 3 نومبر 2012

سوغات نظر

امیرپیٹ: اردو زبان میں محاوروں وتشبیہات کا استعمال سامع و قاری کو دعوت فکر دیتا ہے۔ ایسی تمام تر خوبیاں کسی دوسری زبان کی شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ جناب مومن خاں شوق کی شاعری میں بھی اسی طرح کی بہت ساری خوبیاں موجود ہیں۔ پروفیسر احمداللہ خاں ڈین شعبہ قانون، جامعہ عثمانیہ نے ممتاز شاعر جناب مومن خاں شوق کے چھٹے شعری مجموعے 'سوغات نظر' کی زیراہتمام ادارہ ہماری منزل اور حبیب نگر کلچرل فورم، اردو ہال حمایت نگر میں منعدہ رسم اجرا تقریب کے صدارتی خطبے میں کیا۔ عمر خاں سابق ڈپٹی انجینئر حال مقیم (نیوجرسی) کے ہاتھوں 'سوغات نظر' کی رسم اجرا انجام پائی۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 18 اکتوبر 2012

شعری معائب کا تنقیدی مطالعہ

علی گڑھ: قدیم ادبی تنظیم 'مکتبہ سخن' کے زیراہتمام استاد شاعر الحاج طالب محمود کی نثری تخلیق 'شعری معائب اور کلام شعرا کا تنقیدی مطالعہ' کے اجرا کے سلسلہ میں ایک خصوصی جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت امین فن امانت اللہ اسیر نے کی۔ طالب محمود کی نثری تقلید کا اجرا کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے طالب محمود کے نثری اسلوب کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے معائب شعری کی تاریکی سے اذہان کو مبرا اور علم وفن کی شعاعوں سے شاعری کے لیے بے شمار گوشوں کو منور کیا ہے۔ جاوید وارثی اختر نے جلسہ کی نظامت کرتے ہوئے طالب محمود کی ادبی خدمات کا تذکرہ کیا اور ان کی تخلیقات اعتبار سخن، چمن در چمن اور نقوش قلم پر روشنی ڈالی اور ان کی ادبی خدمات، شخصیت اور فن پر ایک مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اکتوبر 2012

بولتی ناگن

لکھنؤ: افسانے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویرکشی کرنے والے ہوں جس سے ایک ایسی فضا پیدا ہو جو سوچ کو نئی راہیں دے سکے 'بولتی ناگن' کے مصنف سلیم خاں کہانی کہنے کا بے پناہ سلیقہ ہے۔ ان کے کردار ہماری روزمرہ کی زندگی میں جابجا نظر آتے ہیں اور ہم کہانی پڑھتے وقت اپنے ذہن میں ان کی شناخت بنا لیتے ہیں، ان خیالات کا اظہار ایڈیٹر روزنامہ 'آگ' اور صدر جلسہ احمد ابراہیم علوی نے 'بولتی ناگن' پر اظہار خیال کے لیے منعقدہ اس جلسے میں کیا جو ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی و ادبی سنستھان کے زیراہتمام جے شنکر پرساد آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ روزنامہ 'اودھ نامہ' کے ایڈیٹر عالم نقوی نے 'بولتی ناگن' مجموعہ کے ہر افسانے میں اس کے کرداروں اور افسانے کے اتار چڑھاؤ پر بات چیت کی اور افسانوں میں ہر سطح پر تنوع کی بھی تعریف کی۔

روزنامہ 'انوارقوم' کانپور، 22 اکتوبر 2012

وفیات:

وارث کرمانی

ممبئی: اطلاع کے مطابق سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پروفیسر وارث کرمانی (85 سالہ) جمعہ 26 اکتوبر 2012 کو دہلی کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پروفیسر وارث کرمانی 15 نومبر 1927

اُترپردیش کے مشہور ٹاؤن دیوہ شریف (ضلع بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے انگلش ہی میں نہیں بلکہ فارسی میں بھی ایم اے کیا تھا اور غالب پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ پروفیسر وارث کرمانی اپنے عہد میں ملک کے فارسی دانوں میں ایک امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ فارسی زبان میں ان کی خدمات کے پیش نظر صدرِ جمہوریہ نے انھیں سرٹیفکیٹ آف آنرس سے سرفراز کیا تھا۔ ہند میں پروفیسر وارث کرمانی کی فارسی خدمات کا اعتراف حکومتِ ایران نے انھیں سعدی

شیرازی ایوارڈ دے کر کیا۔ 2003 میں ساہتیہ اکادمی کا بھاشا سمان بھی پروفیسر وارث کرمانی کو تفویض کیا گیا نیز غالب ایوارڈ بھی ان کے حصے میں آیا۔ انھوں نے غیر ممالک کے علمی اسفار بھی کیے۔ پروفیسر وارث کرمانی کی کوئی دس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں افکار و انشا، اُردو شاعری کے نیم وا دریچے، غالب کی فارسی شاعری اور گھومتی ندی کے نام نمایاں ہیں آخر الذکر کتاب 'گھومتی ندی' ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہوئی۔ پروفیسر اصغر عباس (علی گڑھ) کی اطلاع کے مطابق 26 اکتوبر ہی کو بعد نمازِ مغرب علی گڑھ میں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔

پریس ریلیز، ندیم صدیقی، ممبئی، 1 نومبر 2012

پروفیسر شیث محمد اسماعیل

نئی دھلی: عربی زبان و اسلامیات کے استاد، اردو کے کہنہ مشق شاعر اور شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق سربراہ پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی کا 11 نومبر کی رات ایک بجے مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ مرحوم برسوں سے عارضہ قلب، تنفس اور ذیابیطس جیسے امراض میں مبتلا تھے۔ ان کا تعلق ضلع اعظم گڑھ سے تھا اور شہر کے مشہور حکیم محمد اسحاق صاحب کے وہ سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، ندوۃ العلما لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ 1967 میں علی گڑھ سے عربی زبان میں ایم اے کرنے کے بعد 1968 میں بسلسلہ ملازمت نائجیریا چلے گئے۔ جہاں انھوں نے بحیثیت استاد تقریباً 25 برس گزارے۔ جنوری 1993 میں وطن واپسی کے بعد وہ جامعہ ہمدرد کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز سے وابستہ رہے۔ اس دوران انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پروفیسر اختر الواسع کی نگرانی میں مغربی افریقہ میں اسلام کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ 1998 میں ان کا تقرر بحیثیت پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں عمل میں آیا۔ وہ 1999 سے 2002 تک شعبے کے سربراہ بھی رہے اور یہیں سے 2004 میں سبکدوش ہوئے تھے۔ شعبے سے وابستگی کے دوران ہی ان کی اہم تصنیف 'دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات' شائع ہوئی مرحوم کو اردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک انتخاب 'قفس رنگ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پسماندگان میں ایک بیٹا فوزان اعظمی اور دو بیٹیاں آرزو اور صدف ہیں۔

پریس ریلیز، ذہن اختر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 12 نومبر 2012

جنوں سہسپوری

کانٹھ: بزرگ شاعر جنوں سہسپوری کا آج دو پہر ڈیڑھ بجے انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر سے قصبہ میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ اطلاع کے مطابق ابن حسن جنوں سہسپوری کافی عرصے سے علیل تھے۔ انھوں نے آج 73 سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنوں سہسپوری کا شمار ضلع بجنور کے پختہ گو چنیدہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام سلاسل کئی سال قبل منظر عام پر آچکا ہے نیز دوسرا مجموعہ مراحل زیر طباعت ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اکتوبر 2012

اسرار اکبرآبادی

آگرہ: 16 اکتوبر کی شب 4 بجے محترم اسرار اکبرآبادی کا مختصر علالت کے بعد ان کے دولت خانہ اشوک پارک، شہید نگر میں انتقال ہوگیا۔ وہ شاعر، ادیب اور بہترین افسانہ نگار تھے۔ انتہائی پرخلوص اور کم گو اور صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان تھے۔ ان کے دو مجموعۂ کلام شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں اور تازہ مجموعہ 'زنجیر ہوا' زیر طبع ہے۔ اور آٹھ مجموعے چھپنے کے لیے تیار ہیں۔

بذریعہ ڈاک، محمد قیوم مئو، نئی دہلی، 14 اکتوبر 2012

خراج عقیدت

اعجاز حسین شاہ

نئی دھلی: اردو کے ایک عظیم مجاہد کی حیثیت سے اعجاز حسین شاہ کا نام صرف اس لیے یاد نہیں رکھا جائے گا کہ وہ ریڈیو کے ذریعہ چالیس برس تک اس زبان کو فروغ دیتے رہے بلکہ وہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت اور ایک ایسے عظیم انسان بھی تھے جو ہر شخص کی مدد کے لیے ہمہ دم تیار رہتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں متعدد سینئر صحافیوں، سیاست دانوں اور دیگر افراد نے ایک تعزیتی جلسے میں کیا۔ ڈوئچے ویلے (وائس آف جرمنی) کی اردو سروس سے چالیس برسوں تک وابستہ رہے اور شاہ صاحب کے نام سے معروف اعجاز حسین شاہ کی یاد میں آج یہاں منعقدے تعزیتی جلسے میں سابق ممبر پارلیمنٹ اور ہفت روزہ نئی دنیا کے چیف ایڈیٹر شاہد صدیقی، مشہور صحافی آلوک مہتہ، مدھوسدھن آنند، آل انڈیا ریڈیو کے عبید نیازی، مدھوسدھن جوشی، ڈوئچے ویلے کے ہندی سروس کی سنند ارا وغیرہ نے مرحوم سے اپنی قربت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان میں ایک پیشہ ور صحافی کی تمام خوبیاں تو اپنی جگہ موجود تھیں ہی ان سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایسی خوبیوں کے مالک تھے جو کسی بھی انسان کو حقیقی معنوں میں بڑا بناتی ہے اور جن خوبیوں کی بنا پر اسے ہمیشہ یاد کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 نومبر 2012

مولانا ابوالکلام آزاد

نئی دھلی: یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے 124 ویں یوم پیدائش پر ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں سب سے اہم بات یہ رہی کہ اس میں فرینڈز فار ایجوکیشن کے صدر و ممتاز تعلیم داں اور مولانا آزاد کے نبیرہ زادہ جناب فیروز بخت احمد نے تفصیلی طور پر مولانا آزاد، مسلمانوں کے تعلیمی حالات و دیگر مسائل پر ایک اقتباس میں کہا کہ مولانا آزاد باہمی یگانگی اور ہندوستان کے قومی تحریک کے مقتدر و معتبر

رہنما تھے۔ انھوں نے مزید مولانا آزاد کی تحریروں کے تعلق سے کہا کہ ان کا قلم ایک ایسا نسخہ کیمیا تھا کہ جو ملک و ملت کے تمام امراض کا بہترین علاج ثابت ہوا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسٹینڈنگ کونسل کے جناب محمد اطیب صدیقی نے کہا کہ مولانا آزاد کے مزار پر جو پرتختیاں لگائی گئی ہیں، ان کا سہرہ جناب فیروز بخت احمد کی کاوشوں کا جاتا ہے کہ جنھوں نے مزار آزاد پر لگے تالے کو بھی عدالت میں مقدمہ برائے فلاح عامہ کے ذریعہ کھلوایا۔ اس موقعے پر جناب اقبال محمد ملک، جنرل سکریٹری فرینڈز فار ایجوکیشن نے کہا کہ مولانا کی آج اہمیت زیادہ ہے کیونکہ آزاد نے ہندوستان کو وہ بنیاد دی تھی جس بنیاد پر سیکولر جمہوری ہندوستان کی تعمیر ہوئی۔

پریس ریلیز، فیروز بخت احمد، 11 نومبر 2012

□